نورالہدیٰ

THE TRIAL AND DEATH OF JESUS CHRIST

ALLAMA JAMES STALKER

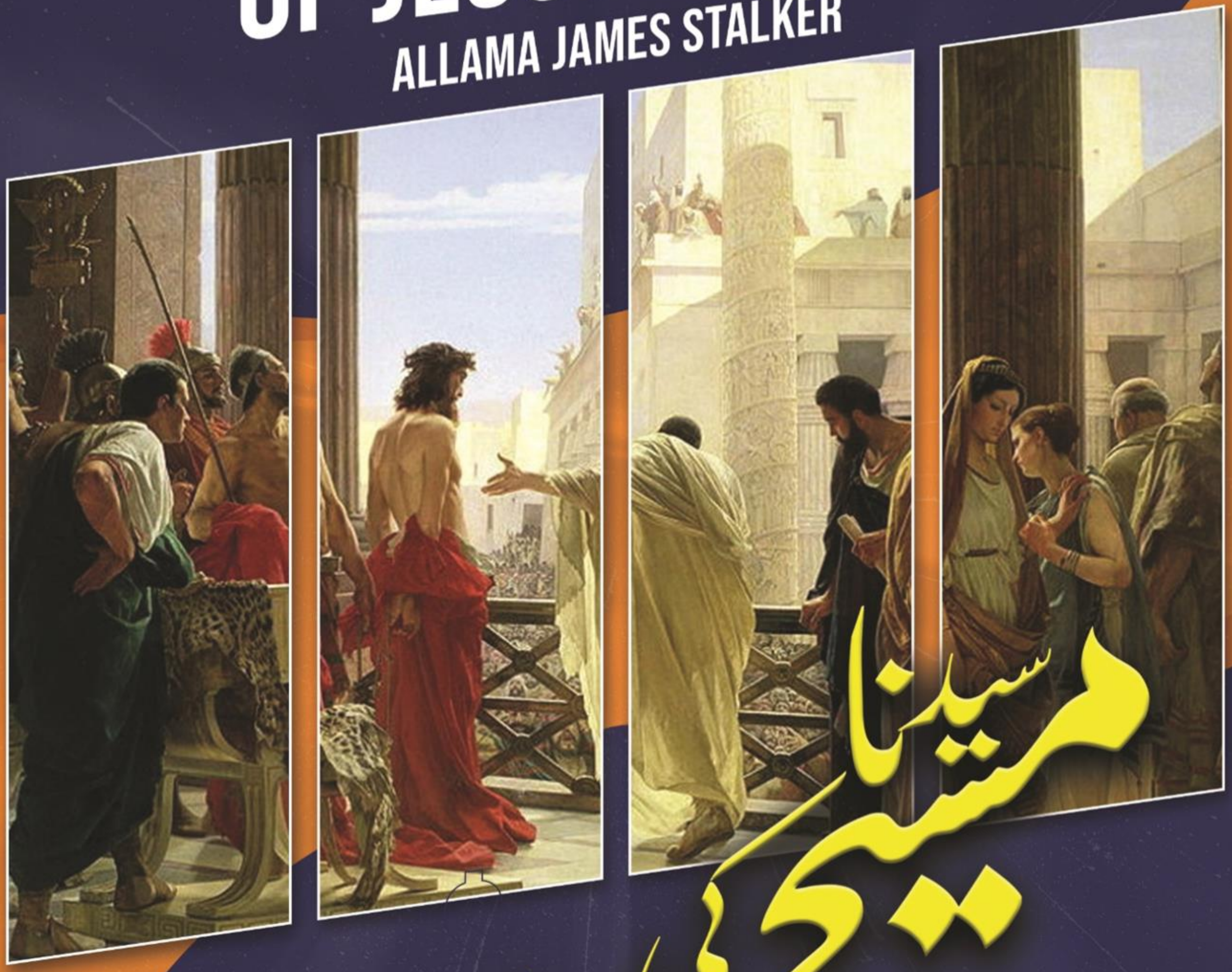

سیدنا مسیح کی گرفتاری اور موت

جناب علامہ جیمس اسٹاکر صاحب

1905

TRIAL AND DEATH OF

JESUS CHRIST

By

Allama James Stalker

سیدنا مسیح کی گرفتاری اور موت

مصنفہ

ڈاکٹر جیمس سٹاکر صاحب

پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی

انارکلی۔لاہور

۱۹۰۵ء

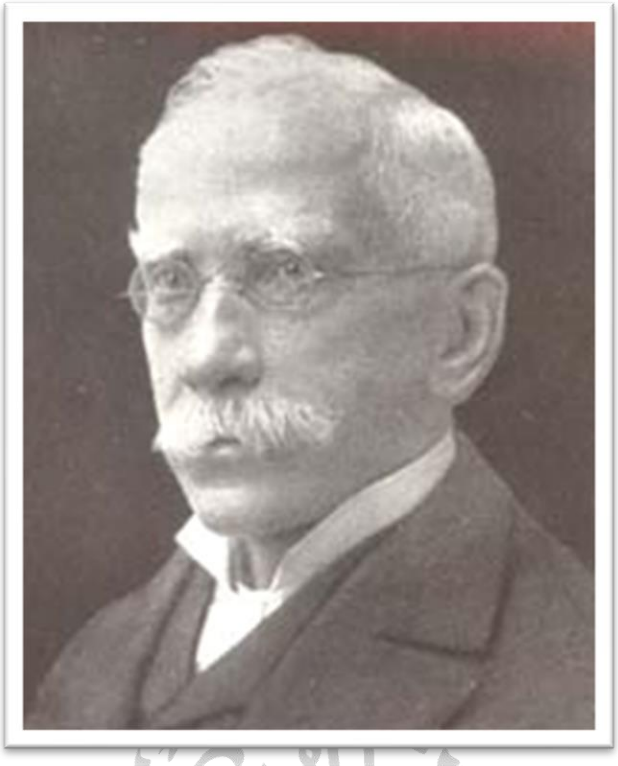

Allama James Stalker

Born: February 21, 1848,
Died: February 5, 1927

نور الهدى

فہرست مضامین

باب	مضمون	باب	مضمون
۱	گرفتاری	۱۲	کلوری
۲	دینی عدالت کے سامنے	۱۳	صلیب کے گرداگرد کے مجمعے
۳	پطرس کا انکار	۱۴	مسیح کا پہلا کلمہ صلیب پر سے
۴	ملکی عدالت	۱۵	دُوسرا کلمہ صلیب پر سے
۵	یسوع اور ہیرودیس	۱۶	تیسرا کلمہ صلیب پر سے
۶	پیلاطس کے پاس واپس آنا	۱۷	چوتھا کلمہ صلیب پر سے
۷	کانٹوں کا تاج	۱۸	پانچواں کلمہ صلیب پر سے
۸	پیلاطس کی بربادی	۱۹	چھٹا کلمہ صلیب پر سے
۹	یہوداہ اسکریوتی	۲۰	ساتواں کلمہ صلیب پر سے
۱۰	راہِ غم	۲۱	نشان اور علامتیں
۱۱	یروشلیم کی بیٹیاں	۲۲	مردہ مسیح
		۲۳	تدفین

یسُوع مسیح کی گرفتاری اور موت

پہلا باب

گرفتاری

ہم اس کتاب میں اپنے خُداوند کی زمینی زندگی کے آخری حالات کا مطالعہ اُس وقت سے شروع کرتے ہیں۔جب کہ وہ عدالت کے پیادوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔یہ گرفتاری آدھی رات کے وقت باغِ گتسمنی میں وقوع میں آئی۔

یروشلیم کی مشرقی جانب کو زمین قدرون کے نالہ تک ڈھلتی چلی جاتی ہے۔اور اس نالہ کے دوسری جانب کوہ زیتون واقع ہے۔پہاڑی کی ڈھلوان سطح پر شہر کے باشندوں نے بہت سے باغ اور باغیچے لگا رکھے تھے۔اور یہ گتسمنی کا باغ بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ہم پختہ طور پر نہیں کہہ سکتے۔کہ وہ احاطہ جو آج کل پہاڑی کے دامن میں حاجیوں کو بتایا جاتا ہے۔درحقیقت وہ وہی مقام ہے۔نہ یہ کہ وہ چھ پُرانے زیتون کے درخت جو اس باغ میں کھڑے ہیں وہی درخت ہیں جن کے سایہ میں ہمارے منجی پر وہ جانکنی کی حالت طاری ہوئی۔مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ مقام اس مقام سے بہت دُور نہیں ہوگا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس مقام کا پتہ روایت سے ملتا ہے۔وہی حقیقی مقام ہو۔

جانکنی کی حالت میں ابھی کچھ تخفیف (کمی) ہوئی تھی کہ (جیسا کہ مقدس متی لکھتا ہے) دیکھو یہوداہ جو بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اُس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ۔وہ شہر کے مشرقی دروازے کے رستہ سے آئے تھے۔اور اب باغ کے پھاٹک پر پہنچ گئے تھے۔چاند کی چودھویں تھی۔اور لوگوں کی دھندلی صورتیں گردآلود سڑک پر آتی ہوئی صاف نظر آتی تھیں۔

مسیح کی گرفتاری عدالت کے دو تین پیادوں کے ذریعہ وقوع میں نہیں آئی تھی۔وہ ایک "بڑی بھیڑ" تھی۔گو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے۔کہ یہ لوگوں کا ایک بے ترتیب اژدحام (بھیڑ۔مجمع) تھا۔چونکہ یہ گرفتاری مذہبی جماعت کی تحریک سے وقوع میں آئی تھی۔اس لئے اُن کے خادم۔یعنی لاویوں کی پولیس جو ہیکل کی حفاظت پر متعین (مقرر) تھی۔سب سے آگے تھی۔لیکن چونکہ اُس وقت یسوع کے ساتھ کم سے کم گیارہ جانباز آدمی موجود تھے۔اور یہ بھی خوف تھا کہ شہر کو واپسی کے وقت شاید اُس کے پیروؤں کی بے شمار جماعت اُس کی حمایت پر اُٹھ کھڑی ہو۔یہ مناسب سمجھا گیا تھا۔کہ رومی گورنر سے درخواست کر کے سپاہیوں کی ایک کمپنی بھی بہم پہنچالی جائے۔جو عیدِ فسح کے موقع پر انتظامی ضرورتوں کے خیال سے قلعہ انٹونیا میں جو ہیکل کے سر پر واقع تھا۔مقیم تھے اُن کے علاوہ صدرِ مجلس کے بعض ممبر بھی بذات خود ہمراہ چلے آئے تھے۔تاکہ اس کارروائی میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہونے پائے۔یہ مخلوط (ملی جلی) جماعت تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح (لڑنے کو تیار) تھی۔یا غالباً یوں کہنا چاہیے۔کہ تلواریں رومی سپاہیوں کے پاس تھیں اور لاٹھیاں ہیکل کی پولیس کے پاس۔اور اُن کے پاس لالٹینیں اور مشعلیں بھی تھیں۔جو وہ غالباً اس خیال سے ساتھ لے آئے تھے۔کہ شاید یسوع اور اُس کے پیروؤں کی باغ کے کنج تنہائی میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔الغرض یہ ایک خوفناک جماعت تھی جو ہر طرح سے اس مہم کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے پر کمربستہ (تیار) معلوم ہوتی تھی۔

ا۔

اس جماعت کار ہنما یہوداہ تھا۔اس شخص کی عام خصلت (فطرت۔عادت)اوراس کے جرم کی ماہیت کی نسبت آئندہ بہت کچھ ذکر ہو گا۔لیکن یہاں ہم فقط اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اس طریق میں جو اُس نے اپنے مقصد کو پورا کرنے میں اختیار کیا۔کئی ایک پہلو تھے جو خاص کر قابل نفرت معلوم ہوتے ہیں۔

اُس نے فسح کی بے حرمتی کی۔کسی نے خوب کہا ہے۔کہ چھے دن میں اچھا کام کرنا چاہیے۔لیکن اگر کام بُرا ہو تو ایک مقدس روز میں کرنے سے اُس کی بُرائی اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔عیدِ فسح سال بھر میں نہایت مقدس موقع سمجھا جاتا تھا۔اور فسح کے ہفتہ میں خاص کر یہ شام نہایت مقدس تھی ۔یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک مسیحی ملک میں کوئی شخص خاص کر سمس یعنی عیدِ تولد (پیدائش کی عید) کے روز کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرے۔

اُس نے اپنے آقا پر اُس کے کُنج عزلت (تنہائی میں وقت گزارنے کی جگہ) میں جہاں وہ ذکر و فکر اور عبادت کے لئے جایا کرتا تھا۔حملہ کیا۔گتسمنی کا باغ یسوع کو بہت ہی مرغوب (پسند) تھا۔اور یہوداہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ وہاں کس مطلب کے لئے جایا کرتا ہے۔مگر اُس نے اس امر کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔بلکہ برخلاف اس کے اُس نے اپنے آقا کی اس عادت سے فائدہ اُٹھایا۔

مگر سب سے بُری بات جس کی وجہ سے بنی انسان اُسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔وہ نشان تھا۔جس کے ذریعہ سے اُس نے یہ ٹھہرایا تھا۔کہ وہ یسوع کو اس کے دشمنوں پر ظاہر کردے گا۔اغلب (یقینی) ہے کہ وہ اُس بھیڑ سے آگے آگے کچھ فاصلہ پر جارہا تھا۔گویا یہ دکھانے کو کہ وہ اُن کے ساتھ شریک نہیں ہے۔اور اُن سے پہلے بھاگ کر اس غرض سے آیا ہے کہ اُس کو اُس کے خطرے سے خبر دار کردے۔اور اُس مصیبت کی حالت میں اس کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کرے۔اور اُس نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اور دھاڑیں مار کر کہنا شروع کیا۔"خُداوند۔خُداوند"اور نہ صرف اُسے بوسہ ہی دیا بلکہ بڑی گرم جوشی سے اور کئی بار۔جیسا کہ انجیل [1] کے یونانی لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔جب تک دُنیا میں سچی اور خالص محبت کا وجود ہے۔ہر ایک شخص جس نے کبھی اس محبت کے نشان (یعنی بوسہ) کو استعمال کیا ہے۔اُس فعل کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔یہ ایک ایسا گناہ ہے جو دل انسانی اور اُس کی تمام محبتوں کے خلاف سرزد ہوا ہے۔مگر کوئی شخص اُس کی خوفناک صورت کو محسوس کرنے کی ایسی قابلیت نہیں رکھتا جیسے کہ یسوع۔یقیناً یسوع کے دل پر اُس سے سخت چوٹ لگی ہو گی۔اُس رات کو اور دُوسرے دن اُس کے چہرہ پر قسم قسم کے دھبے نظر آتے تھے۔اُس پر خون کے پسینے کی لکیریں ہویدا (ظاہر) تھیں۔طمانچوں کے گہرے نشان تھے۔وہ تھوک سے آلودہ ہو رہا تھا۔کانٹوں کے تاج سے لہولہان تھا۔مگر ان میں سے کسی چیز نے اُس کے دل کو ایسا نہ چھیدا ہو گا۔جیسا اس بوسہ نے ایک اور شخص۔جس کے ساتھ کچھ کچھ ایسا ہی سلوک ہوا ہو گا۔کہتا ہے۔دُشمن تو نہیں تھا جو مجھے ملامت کرتا۔نہیں تو میں اُس کی برداشت کرتا۔نہ یہ کینہ رکھنے والا تھا۔جو مجھ پر بالا دستی (کسی پر اختیار رکھنا) کرتا تھا۔تب میں اُس سے چھپ جاتا۔بلکہ تُو میرا ہم رتبہ آدمی۔میرا اُلفتی بندہ اور میرا جان پہچان تھا۔کہ ہم مل کے خوش اختلاطی (میل میلاپ۔پیار محبت) کرتے تھے۔اور گروہ کے ساتھ خُدا کے گھر میں جایا کرتے تھے۔(زبور ۵۵: ۱۲۔۱۴)۔پیشتر اس کے کہ اس نے بوسہ دیا۔یسوع نے اُسے اُسی پُرانے لقب یعنی دوست کے نام سے یاد کیا۔لیکن جب وہ بوسہ دے چکا تو وہ یہ کنپا دینے والا سوال کرنے سے باز نہ رہ سکا۔کہ "اے یہوداہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے؟"۔

بوسہ شاگردی کا نشان تھا۔مشرقی ممالک میں شاگرد اپنے ربیوں یعنی اُستادوں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔اور غالباً یسوع اور حفاظت سے لے جانا۔

---

[1] ۔جو یونانی لفظ یہاں استعمال ہوا وہ وہی ہے۔جو اس گنہگار عورت کے قصہ میں استعمال ہوا ہے۔جو خُداوند کے قدموں کو تیل مل کر بوسہ دیتی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ بجائے اُس کے پکڑنے کے وہ خود پکڑے گئے وہ ایک کمینہ اور پُر دغا کام میں مشغول تھے۔انہوں نے ایک نمک حرام شخص کو اپنار ہنما بنایا تھا۔اور اُمید کرتے تھے۔کہ مسیح کو یا تو سوتے میں یا چپ چاپ اور چوری چوری جا پکڑیں گے اورا گروہ جاگتا ہو گا تو غالباًوہ بھاگ کھڑا ہو گا۔اور آخر کار وہ اُس کا تعاقب (پیچھا) کرکے اُسے کسی کنج تنہائی (ویران جگہ) میں لرزاں و ترساں (ڈرنا کانپنا) حالت میں جا پکڑیں گے۔وہ اُسے بے خبر جا پکڑنا چاہتے تھے۔لیکن جب وہ خود بلادھڑک اُن کے سامنے آکھڑا ہوا۔اور اُن سے خود پوچھ پاچھ کرنے لگا تو وہ متحیر (ہکا بکا) ہو گئے۔اور انہیں اپنا ڈھنگ بدلنا پڑا۔جس کے لئے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔اس طور سے گویا اُس نے اُن سب کو وہاں کھڑا کرکے گویا شرم و خجالت (شرمندگی) کا تختۂ مشق (کسی مقصد کے لئے کسی کو بار بار استعمال کرنا) بنادیا۔

اب اُن کی تمام تیاریاں کیسی بے ہودہ معلوم ہونے لگی ہوں گی۔یہ سپاہی اور تلواریں اور لاٹھیاں۔مشعلیں اور لالٹینیں جواب چاند کی چاندنی میں پھیکی معلوم ہو رہی تھیں۔بھلا کس مصرف (کام) کی تھیں؟ یسوع نے انہیں یہ بات اچھی طرح محسوس کرادی۔اور انہیں گویا منوادیا کہ وہ کس رُوح و مزاج کے آدمی ہیں۔اور اُس کی مزاج اور رُوح سے کس قدر ناآشنا (ناواقف) ہیں۔"تم کسے ڈھونڈتے ہو"؟اُس نے دوبارہ اُن سے یہی سوال کیا تاکہ وہ اس امر کو اچھی طرح معلوم کرلیں۔کہ انہوں نے اُسے نہیں پکڑا بلکہ وہ خود اپنے کو اُن کے حوالہ کر رہا ہے۔یہ موقع بالکل اُسی کے ہاتھ میں تھا۔اُس نے پھر خاص کر صدرِ مجلس کو مخاطب کرکے جو غالباً اس وقت پس پشت (پیچھے) رہنا زیادہ پسند کرتے۔اور اُن کی ان تمام تیاریوں کی طرف اشارہ کرکے اُن سے سوال کیا کہ "کیا تم ڈاکو جان کے تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے پکڑنے کو نکلے ہو؟ میں ہر روز تمہارے پاس ہیکل میں تعلیم دیتا تھا۔اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔وہ تن تنہا تھا اور اگرچہ جانتا تھا کہ کس قدر لوگ اُس کے مقابلہ میں ہیں۔تو بھی ہر گز نہ ڈرا۔وہ ہر روز ہیکل میں تعلیم دیتا رہا۔یعنی سب سے زیادہ عام جگہ میں۔اور ایسے اوقات میں جب سب لوگ اُسے دیکھ سکتے تھے۔لیکن وہ جو ایسے طاقتور اور بے شمار تھے۔تو بھی اُس سے ڈرتے رہے۔اور اس لئے انہوں نے اس شرارت کے لئے آدھی رات کا وقت پسند کیا ہے۔اور پھر فرمایا۔یہ تمہاری گھڑی اور ظلمت (تاریکی) کا اختیار ہے۔یہ آدھی رات کا وقت تمہارا ہے کیونکہ تم ظلمت کے فرزند ہو۔اور جو طاقت تمہیں میرے خلاف حاصل ہے وہ بھی ظلمت کی طاقت ہے۔

اس سبط (یہودی قوم)"یہوداہ کے شیر" نے اس موقع پر یہ الفاظ فرمائے۔مگر یاد رکھو کہ ایسے ہی الفاظ وہ اُس دن بھی کہے گا جب کہ اُس کے دشمن اُس کے پاؤں کے نیچے کئے جائیں گے۔"بیٹے کو چومو۔تانہ ہو کہ وہ بے زار ہو اور تم راہ میں ہلاک ہو جاؤ۔جب اُس کا قہر یکایک بھڑکے مبارک وہ سب جن کا توکل اُس پر ہے۔(زبور ۲: ۱۲)۔

۳۔

اس امر کو بار بار یاد دلانا مناسب نہیں کہ یہ وہی فتح تھی۔جو مسیح نے باغ کے اندر حاصل کی تھی۔جو اس فتح یابی کا جو اُس نے باغ کے دروازے پر حاصل کی باعث تھی۔وہ قوت اور دبدبہ (رعُب) جو اُس نے اس موقع پر ظاہر کیا دُعا اور بیداری سے حاصل ہوا تھا۔

یہ امر اُن لوگوں کی حالت کے ساتھ مقابلہ کرنے سے جنہوں نے دُعا بیداری سے کام نہیں لیا تھا۔اور بھی زیادہ واضح اور بین (صاف) ہو جاتا ہے۔اُن کے لئے ہر ایک چیز بطور ناگہانی آفت کے وارد (ظاہر) ہوئی۔جس سے وہ اندھے اور حیرت زدہ ہوگئے۔وہ گہری نیند سے جگائے گئے۔اور آنکھیں ملتے ہوئے اور ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھے۔جب یسوع پر لوگوں نے ہاتھ ڈالا تو اُن میں سے ایک بولا۔کیا ہم تلوار چلائیں؟اور جواب کا انتظار کئے بغیر وار کر بیٹھا۔لیکن کیسی بے ہودہ ضرب (وار)! نیم خفت (جو نیند سے مکمل بیدار نہ ہو) آدمی سے اور کیا اُمید ہو سکتی ہے۔سر کے بجائے اُس نے صرف کان

کاٹ ڈالا۔اور اس ضرب کا اُسے سخت خمیازہ (سزا) بھی اُٹھاناپڑتا۔اگر یسوع کامل اطمینان کے ساتھ پطرس اور اُن تلواروں کے درمیان جو اُس کے مارنے کے لئے اُٹھی ہوں گی نہ آجاتا۔اُس نے فرمایا۔کہ یہی بس ہے۔اس طرح سے سپاہیوں کو روک رکھا۔اور اُس آدمی کا کان چھو کر اسے بھلا چنگا کر دیا۔اس طور سے اپنے بے چارے شاگرد کی جان بچائی۔

یقیناً یسوع ضرور متبسم (مسکرانا) ہوا ہوگا۔جب اُس نے پطرس سے فرمایا کہ ،اپنی تلوار میان میں رکھ۔کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں۔وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے۔تلوار کی جگہ میان کے اندر ہے۔نہ باہر۔اُس کا کھینچنا اس معاملہ میں بے محل (بے موقع) ہے۔اور جو لوگ کسی معقول وجہ کے یا بااختیار حاکم کے حکم کے بغیر تلوار کھینچتے ہیں۔انہیں جان کے بدلے جان دینی پڑے گی۔

لیکن اس سے بڑھ کر اُس نے اُس اعلیٰ درجے کی فصاحت (خوش کلامی) کے ذریعہ جس سے اُس نے اپنے دشمنوں سے کلام کیا۔پطرس پر یہ ثابت کر دیا کہ اس کا فعل اس موقع پر کیسا بے محل (غیر مناسب) تھا۔یہ فعل اُس کے اُستاد کے رُتبہ کے زیبا نہ تھا۔کیونکہ میں اپنے باپ سے منت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کے بارہ تُمن سے زیادہ میرے پاس ابھی موجود کر دے گا۔اور ایسے بڑے لشکر کے مقابلہ میں یہ چھوٹی سی جماعت جو مشکل سے سو دو سو آدمی کے قریب ہو گی۔کیا حقیقت رکھتی ہے؟اس کے علاوہ یہ فعل نوشتوں کے بھی خلاف ہے۔

وہ نوشتے کہ یوں ہی ہونا ضرور ہے۔کیونکر پورے ہوں گے۔اور یہ اُس کی اپنی منشاء (مرضی) اور اُس کے باپ کی مرضی کے بھی خلاف ہے۔جو پیالہ باپ نے مجھ کو دیا کیا میں اُسے نہ پیوں؟۔

بے چارہ پطرس! اس موقع پر جو کچھ اُس سے ہوا۔وہ ٹھیک اُس کی طبیعت کے تقاضا کے مطابق تھا۔اس کے فعل میں ایک قسم کی راستی اور شرافت تو تھی۔مگر وہ فعل ہی بے موقع تھا۔کاش وہ گتسمنی کے اندر بھی ایسی ہی آمادگی ظاہر کرتا اور جو کچھ اُسے کہا گیا تھا۔اُس پر عمل کرتا۔جیسا کہ وہ گتسمنی کے باہر جو کچھ اُسے نہیں کہا گیا تھا کرنے کو تیار تھا!اس سے کہیں بہتر ہوتا اگر وہ باغ کے اندر روحانی تلوار کھینچتا اور اُس کان کو کاٹ ڈالتا جو ایک لونڈی کی دھمکی سے اُسے گمراہ کرنے کا وسیلہ بنا پطرس کے چلن نے اس موقع پر بھی دوسرے موقعوں کی طرح ثابت کر دیا کہ محض گرم جوشی جب وہ مسیح کی رُوح و مزاج پر مبنی نہ ہو ہماری رہنما بننے کی ہرگز لائق نہیں ہے۔

۴۔

شاید پطرس کو اُس عہد و اقرار نے جب اُس نے سخت قسم کھا کر یہ کہا تھا۔کہ خواہ اُسے مرنا ہی کیوں نہ پڑے وہ مسیح سے چمٹا رہے گا۔اس امر پر آمادہ کیا کہ اپنے آقا کے واسطے کچھ نہ کچھ کر بیٹھے۔مگر اوروں نے بھی تو وہی بات کہی تھی۔کیا وہ اب انہیں یاد تھی؟ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سب اُسے بھول گئے تھے جان کے خطرے کے سامنے وہ سب کچھ بھول گئے۔اور ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔بعض اوقات بیماری کی حالت میں خصوصاً جب کوئی دماغی بیماری ہو۔تو اس قسم کے عجیب اثرات دیکھے جاتے ہیں۔وہ چہرہ جس پر سالہا سال کی تادیب و تربیت نے شائستگی اور وجاہت کی مہر ثبت کی ہوئی تھی۔دفعتہً (اچانک) سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔اور اُس کی جگہ پھر وہی اصلی گنوار پن عود کر آتا ہے۔اسی طرح اپنے آقا کی گرفتاری کے خوف نے جوان شاگردوں پر جنہوں نے دُعا کے ذریعہ اپنے کو تیار نہیں کیا تھا۔دفعتہً آن پڑا۔کچھ عرصہ کے لئے سالہا سال کی عقیدت کو ضائع کر دیا۔اور وہ پھر گلیل کے نرے مچھوے کے مچھوے ہی رہ گئے۔اور مسیح کی گرفتاری کے وقت سے لے کر اس کے جی اُٹھنے تک ان کی یہی حالت رہی۔

اس معاملہ میں بھی اُن کا چلن اُن کے آقا کے چلن سے بالکل مختلف ہے۔ جیسے کہ چڑیا جب اُس کے گھونسلے پر کوئی دشمن حملہ آور ہوتا ہے اُس کے مقابلہ کو نکلتی ہے۔ یا گڈریا خطرے کے وقت اپنے گلے کے آگے آگے ہوتا ہے۔ اسی طرح یسوع نے بھی۔ جب اُس کے گرفتار کرنے والے نزدیک آئے۔ اپنے کو اُن لوگوں اور اپنے شاگردوں کے بیچ میں ڈال دیا۔ اور کسی حد تک اسی غرض سے تھا۔ کہ وہ دلیرانہ آگے بڑھا۔ اور یہ کہہ کر اُن کی ساری توجہ کو اپنی ہی طرف لگا لیا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ جب انہوں نے جواب دیا۔ یسوع ناصری کو۔ تو اُس نے فرمایا میں ہی ہوں۔ اس لئے اگر تم مجھے ڈھونڈتے ہو تو انہیں جانے دو۔ اس سے جو خوف و دہشت اُن پر طاری ہوئی وہ اُس کے پکڑنے کی فکر میں اُس کے شاگردوں کو بالکل بھول گئے۔

اور یہی اُس کا مقصد بھی تھا۔ مقدس یوحنا اس کا ذکر کرتے ہوئے اس بیان میں ایک عجیب فقرہ زیادہ کرتا ہے۔ کہ یہ اُس نے اس لئے کیا کہ اُس کا یہ قول پورا ہو کہ جنہیں تو نے مجھے دیا۔ میں نے اُن میں سے کسی کو بھی نہ کھویا۔ یہ قول اُسی سفارشی دُعا میں ہے۔ جو اُس نے سب سے پہلی شراکت اقدس کی میز پر کی۔ مگر اُس موقع پر اُس کے ظاہراً یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ اُس نے روحانی طور پر اُن میں سے کسی کو نہیں کھویا۔ لیکن یہاں اُس کی تلوار یا صلیب کے ذریعہ نہیں کھویا۔ جو پکڑے جانے کی صورت میں اُن کا حصّہ ہوتا۔ تاہم اُس کے ان ظاہری معنوں میں بھی ایک گہرا نکتہ ہے۔ مقدس یوحنا یہ جتانا چاہتا ہے کہ اگر اُن میں سے کوئی اُس وقت اُس کے ساتھ گرفتار ہو جاتا تو ظن غالب (مضبوط رائے) یہ ہے کہ وہ اُس موقع پر پورا نہ اُترتا۔ وہ اُس کا انکار کر بیٹھتے۔ اور اس لئے زیادہ افسوس ناک معنوں میں درحقیقت کھوئے جاتے۔

یسوع نے خوب جان کر کہ اُن کی یہ حالت ہے۔ اُن کے لئے منفر کا راستہ کھول دیا۔ اور وہ سب اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شاید یہ اُن کے قیاس میں بہتر تھا۔ کیونکہ اگر اس کے ساتھ رہتے۔ تو شاید اس سے بھی کچھ بدتر کام کر بیٹھتے۔ لیکن یہ امر اُن کے اصلی قول و قرار کے کس قدر برعکس تھا کہ اگر تیرے ساتھ مجھے مرنا ضرور ہو۔ تو بھی تیرا انکار ہرگز نہ کروں گا۔ مجھے بعض وقت ایسا خیال آیا کرتا ہے۔ کہ مسیحی دین کے لئے یہ کیسی بڑی عزت کا باعث ہوتا اور فطرتِ انسانی کی تاریخی میں کیسی سنہری یادگار ہوتی۔ اگر ان میں سے ایک دو ہی۔ مثلاً یہ دونوں بھائی یعقوب اور یوحنا اس کے ساتھ قید خانہ یا موت تک جانے کے لئے حوصلہ کرتے۔ اُس صورت میں یہ تو سچ ہے۔ کہ ہم مقدس یوحنا کی تصنیفات سے محروم رہتے۔ اور اُس کی مکاشفات کی کتاب اور انجیل اور خطوط ہم کو حاصل نہ ہوتے۔ مگر یہ کیسا اچھا مکاشفہ ہوتا۔ کیسی اچھی انجیل ہوتی۔ اور کیسا عمدہ خط ہوتا۔

مگر ایسا نہیں ہونا تھا۔ یسوع کو بے یار مددگار جانا تھا۔ میں نے تن تنہا انگوروں کو کولھومیں کچلا اور لوگوں میں سے میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔ سو وہ "اُسے باندھ کر لے گئے"۔

دُوسرا باب

دینی عدالت کے سامنے

یہ جماعت یسوع کواپنے درمیان میں لئے ہوئے قدرون نالے سے پاراُتری اور وہاں سے شہر کی طرف اُوپر چڑھتی ہوئی اور پھر دروازہ میں سے گذر کر شہر کی گلیوں میں جا پہنچی۔آدھی رات کا وقت تھا کہیں کہیں کوئی اِکاؔدُکاؔ چلتا پھرتا مل جاتا تھا۔ تو اس جماعت کو دیکھ کر استفسار (پوچھ گچھ) کی غرض سے پاس آتا تھا اور قیدی کی صورت پر غور سے نظر کر کے اپنے گھر کا راستہ نہ لیتا[1] وہ یسوع کو سردار کاہن کے محل پر لے گئے جہاں اُس کی تحقیقات شروع ہوئی۔

یسوع کو دو عدالتوں کے سامنے پیش ہونا تھا۔ایک تو دینی عدالت کے سامنے دوسرا ملکی عدالت کے۔ایک کائفا سردار کاہن کے سامنے۔دوسرے پنطیس پیلاطس رومی گورنر کے سامنے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ اُس زمانہ میں یہودیہ رومی سلطنت کے تابع تھا اور صوبہ سوریہ یا شام کا ایک حصّہ سمجھا جاتا تھا۔اور ایک رومی حاکم اُس پر حکومت کرتا تھا جو قیصریہ کے نئے اور شاندار بندر گاہ میں جو یروشلیم سے پچاس میل کے فاصلہ پر تھا سکونت رکھتا تھا۔مگر یروشلیم میں بھی اُس کا محل تھا۔جہاں وہ وقتاً فوقتاً سکونت پذیر ہوا کرتا تھا۔

سلطنت روما کی یہ پالیسی نہ تھی۔کہ جو جو ممالک اُس کے زیر فرمان آتے تھے۔اُن سے ہر قسم کی حکومت واختیار چھین لے۔وہ اُن کا دل لبھانے کے لئے کم سے کم برائے نام سلف گورنمنٹ کا نشان اُن کے ہاتھوں میں رہنے دیتی تھی۔اور جہاں تک اُس کے اعلیٰ اختیار و حکومت کے اصول اجازت دیتے وہ ملک کے اندرونی معاملات کا نظم ونسق (انتظام) انہیں لوگوں کے ہاتھ میں سپرد کر دیتی تھی۔خاص کر وہ مذہبی معاملات کا بہت کچھ لحاظ رکھتی تھی۔اور اُن میں حتی الامکان دست اندازی نہیں کرتی تھی۔اس لئے یہودیوں کی قدیمی مذہبی عدالت جو سنیڈرن یعنی صدر عدالت کے نام سے مشہور تھی۔اب بھی یہ اختیار رکھتی تھی۔کہ مذہبی معاملات کی تفتیش و تحقیقات کرے اور مجرموں کو سزا دے۔البتہ اگر کوئی اس قسم کا جرم ہوتا۔جس میں سزائے موت کا فتویٰ دیا جانا مناسب تھا۔تو اُس صورت میں مقدمہ گورنر کے سامنے پیش ہوتا۔لیکن اگر وہاں بھی سزائے موت بحال رہتی تو اس سزا کا عمل درآمد بھی گورنر کے ہاتھ میں تھا۔

یسوع دینی حکام کے حکم سے گرفتار کیا گیا تھا۔اور انہوں نے اس پر موت کا فتویٰ دیا۔لیکن اس فتویٰ کی تعمیل کا انہیں اختیار حاصل نہ تھا۔اس لئے ضرور تھا کہ اسے پیلاطس کے سامنے حاضر کریں جو اتفاق سے شہر ہی میں موجود تھا۔اور اُس نے اس مقدمہ کی از سر نو تحقیقات کی۔اور یہ لوگ گویا اُس کے سامنے بطور مستغیث یا مدعی (دعویٰ کرنے والے) کے تھے۔

---

[1] ۔یسوع مسیح کی موت اور گرفتاری۔غالباً وہ چھوٹا سا واقع جو مقدس مرقس نے لکھا ہے۔اسی قبیل کا تھا۔"مگر ایک جوان اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہولیا تھا۔اُسے لوگوں نے پکڑا۔مگر وہ مہین چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ گیا۔(مرقس ۱۴: ۵۱) میں نے اس واقع کو شامل نہیں کیا کیونکہ در حقیقت میں نہیں جانتا کہ اس کی نسبت کیا کہوں۔غالباً اس کے بیان سے انجیل نویس کو یہ جتانا مقصود تھا۔کہ اس موقع پر سپاہیوں کا برتاؤ کیسا وحشیانہ تھا اور کہ اگر یسوع کے شاگردوں میں سے کوئی اُن کے ہاتھ لگ جاتا تو اُس کا کیا حال ہوتا۔بعض کا خیال ہے کہ یہ مقدس مرقس ہی تھا اور جیسے مصور تصویر کے کسی گوشہ میں اپنا دستخط ثبت کر دیتا ہے۔اسی طرح یہ گویا انجیل کے گوشہ میں مرقس کا دستخط ہے۔

نہ صرف دو قسم کی تحقیقاتیں تھیں۔ بلکہ تحقیقات میں تین تین علیحدہ مدارج (درجے) تھے۔ یعنی دینی تحقیقات میں یسوع پہلے حنا کے سامنے پیش ہوا۔ پھر قائفا اور صدر مجلس کے سامنے رات کے وقت۔ اور پھر اُسے عدالت کے سامنے دوبارہ صبح کے وقت۔ اور دوسری یعنی ملکی عدالت میں بھی وہ پہلے پیلاطس کے سامنے پیش ہوا جس نے یہودیوں کے فتویٰ کو بحال رکھنے سے انکار کیا۔ تب اپنا پیچھا چھُڑانے کے لئے اُس نے اُسے ہیرودیس حاکم گلیل کے پاس بھیج دیا۔ جو اُس وقت یروشلیم میں مقیم تھا۔ مگر مقدمہ پھر رومی گورنر کے پاس واپس آگیا۔ اور اُس نے اپنے ضمیر کے خلاف سزائے موت کے فتوے کو بحال رکھا۔

لیکن اب میں ذرا التفصیل کے ساتھ مقدمہ کے اُن تین مدارج جو دینی عدالت کے سامنے پیش آئے بیان کروں گا۔

مقدس یوحنا بیان کرتا ہے کہ یسوع کو پہلے حنا کے پاس لئے گئے۔ یہ شخص ایک ستر سال کا بڈھا تھا۔ جو اس سے بیس سال پہلے سردار کاہن رہ چکا تھا۔ اس کے بعد اُس کے پانچ بیٹے یکے بعد دیگرے سردار کاہن ہوئے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں یہ عہدہ عمر بھر کے لئے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ہر ایک شخص صرف تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے سردار کاہن رہتا تھا۔ اس وقت قائفا جو سردار کاہن تھا وہ اُس کا داماد تھا۔ حنا اُس وقت بھی بڑا ذی اختیار آدمی تھا۔ اور ایک طرح سے سب دینی معاملات میں درحقیقت وہی مختار سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ برائے نام عہدہ قائفا کے نام تھا۔ وہ دراصل ہیرودیس اعظم کے بلانے پر اسکندریہ سے آیا تھا۔ اور اس کے خاندان میں سب کے سب لائق فائق مگر بہت ہی پُر ہوس اور مغرور لوگ تھے۔ جُوں جُوں اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ وہ حکومت اور اختیار میں بھی بڑھتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ سب قسم کے بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہوگئے۔ وہ صدوقی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں اس فرقہ کا کامل نمونہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ بڑے سُرد مہر مغرور اور دنیا پرست تھے۔ اہلِ ملک کے درمیان وہ ہر گز ہر دلعزیز نہ تھے۔ لیکن جتنا لوگ اُن سے نفرت رکھتے تھے۔ اتنا ہی اُن سے ڈرتے بھی تھے۔ وہ بڑے حریص اور لالچی تھے۔ اور اس لئے جہاں تک اُن کا داؤ چلتا تھا۔ مذہبی ریت و رسوم کے ذریعہ سے لوگوں کو لوٹتے رہتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ہیکل کے صحن میں جو کاروبارِ تجارت جاری تھا۔ جس پر یسوع نے اس سے چند روز پہلے ایسا سخت فتویٰ جاری کیا تھا۔ وہ نہ صرف اُن کی اجازت سے ہوتا تھا۔ بلکہ اُس میں اُن کی بڑی مالی منفعت (فائدہ۔ منافع) تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو ظاہر ہے کہ یسوع کی اس حرکت نے سردار کاہن کے خاندان کے دل میں اُس کی نسبت کس قدر غیظ و غضب (سخت غصّہ) پیدا کر دیا ہو گا۔

غالباً یہ سخت نفرت وعداوت ہی تھی۔ جس نے حنا کو یسوع کے سپرد عدالت کرنے پر آمادہ کیا۔ اغلب (یقینی) ہے کہ اس مکار صدوقی نے یہوداہ کے ساتھ سودا کرنے اور یسوع کی گرفتاری کے لئے سپاہی بھیجنے میں بہت کچھ حصّہ لیا ہو گا۔ اس لئے وہ اپنی تمام کارستانیوں کا نتیجہ دیکھنے کے لئے رات کو جاگتا رہا ہو گا۔ اور اس وجہ سے وہ لوگ بھی یسوع کو گرفتار کرکے پہلے حنا کے پاس ہی لے گئے۔ لیکن جو کچھ پوچھ پاچھ حنا نے اُس وقت کی ہو گی وہ باضابطہ نہ تھی۔

مگر صدر مجلس کے ممبران کو جمع کرنے کے لئے وقت چاہیے۔ آدھی رات کے وقت ہی ممبروں کے جمع کرنے کے لئے شہر میں چاروں طرف قاصد دوڑائے گئے۔ کیونکہ مقدمہ ضروری تھا۔ اور اُس میں دیر کی گنجائش نہ تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ صبح سویرے اُٹھ کر جب لوگ اپنے ہر دلعزیز معلم (تعلیم دینے والا) کو ان نفرت انگیز دشمنوں کے ہاتھ میں دیکھیں گے۔ تو کیا کچھ نہ کر گذریں گے۔ لیکن اگر تحقیقات دن نکلنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ اور یسوع رومیوں کے مضبوط اور طاقتور ہاتھوں تک پہنچ جائے پیشتر اس کے کہ لوگوں کو اس واقع کی خبر ہو۔ تو پھر کچھ خوف نہیں اس لئے صدر مجلس رات کی تاریکی میں جمع ہوئی۔ اور تمام کارروائی قائفا کے محل میں جہاں اب یسوع کو لے گئے تھے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہی وقوع میں آئی۔

یہ کارروائی بالکل باضابطہ تونہ تھی۔ کیونکہ شریعت کے الفاظ میں اس مجلس کے رات کو منعقد کرنے کی اجازت درج نہ تھی۔اس سبب سے اگرچہ تمام کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔اور رات ہی کے وقت فتویٰ موت پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا۔توبھی یہ ضروری سمجھا گیا کہ دن نکلنے کے بعد عدالت کا پھر ایک اجلاس ہو۔یہ یسوع کی تحقیقات کا تیسرا درجہ تھا۔

مگر اسے گذشتہ کارروائی کی ایک مختصر تکرار (بحث)ہی سمجھنا چاہیے۔جو محض ضابطہ کو پورا کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔اس لئے ہم اُس کارروائی کی طرف غور کرتے ہیں جو رات کے وقت وقوع میں آئی۔کیونکہ وہی اس سارے معاملے کی جان ہے۔

اب اپنے ذہن میں ایک بڑے دالان کا تصور باندھو جو گھر کے صحن کی ایک طرف کو ہے۔اور جس سے اُسے فقط پیلپاؤں کی ایک قطار جُدا کرتی ہے۔اس لئے جو کچھ اندر روشنی میں واقع ہورہاہے وہ صحن میں بیٹھنے والوں کو صاف صاف نظر آئے گا۔یہ کمرہ نصف دائرہ کی شکل میں ہے۔اس دائرہ کی قوس میں پچاس یااس سے زیادہ ممبران مجلس فرش پر بیٹھے ہیں قائفا بحیثیت میرِ مجلس اس کی طرف منہ کئے کھڑا ہے۔اور سپاہی اُس کی ایک طرف اور گواہ دوسری طرف کھڑے ہیں۔مگر تحقیقات کس طرح شروع ہونی چاہیے؟یقیناً اس طرح کہ پہلے صاف طور پر اس امر کا بیان کیا جائے۔کہ الزام کیا ہیں جو ملزم پر لگائے گئے ہیں۔اور اُن کا کیا ثبوت موجود ہے مگر بجائے اس طور پر شروع کرنے کے ''سردار کاہن نے یسوع سے اس کے شاگردوں اور اُس کی تعلیم کی بابت پوچھا''۔

خیال یہ تھا کہ وہ کسی خفیہ مقصد کے لئے شاگرد جمع کررہاہے۔اور انہیں کسی خفیہ مسئلہ کی تعلیم دیتا ہے۔جس کو کسی نہ کسی طرح توڑ مروڑ کر انقلابِ سلطنت کی تدبیر ثابت کردیا جائے۔یسوع جو ابھی اُس بے حرمتی کے لئے بیتاب ہورہا تھا۔کہ انہوں نے اسے رات کی تاریکی میں گرفتار کیا گویا کہ وہ بھاگنے کی فکر میں تھا۔ اور اس کی گرفتاری کے لئے اتنی بڑی جماعت بھیجی ۔ گویا کہ وہ کسی باغی جماعت کا سرغنہ تھا۔ اُس نے بڑی تمکنت (زور۔اختیار) سے جواب دیا۔ تومجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔سننے والوں سے پوچھ کہ میں نے اُن سے کیا کہا۔اگر اب تک انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کہتا اور کرتارہاہے۔توانہوں نے اُسے پکڑا ہی کیوں ہے؟وہ اُسے ایک خُفیہ سازش کرنے والا ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔مگر وہ خود جیسا کہ خُفیہ طور پر اُسے گرفتار کرنے اور آدھی رات کے وقت اُس کی تحقیقات کرنے سے ظاہر ہے۔ہاں وہ خود تاریکی کے فرزند ہیں۔

ایسے سادہ اور دلیرانہ الفاظ اُس مقام کے سزاوار نہ تھے۔کیونکہ وہ تو حاجت مندوں کی گڑگڑاہٹ۔درباریوں کی چاپلوسی اور وکیلوں کی مودبانہ تقریریں سننے کے عادی تھے۔اور ایک سپاہی نے شاید سردار کاہن کی تیکھی چتون (تیوری۔غصّہ) کو تاڑ کر یسوع کے منہ پر طمانچہ مارا اور بولا۔تو سردار کاہن کو ایسا جواب دیتا ہے؟بے چارہ نوکر اُس کے حق میں اچھا ہوتا کہ اس کا ہاتھ سوکھ جاتا۔پیشتر اس کے کہ اُسے یہ ضرب لگانے کا موقع ملتا۔قریباً ایسا ہی واقع اور اسی مقام میں مقدس پولوس کو بھی پیش آیا۔اور وہ غضب ناک ہو کر ایک چبھتا ہوا جواب دینے سے باز نہ رہ سکا۔مگر یسوع نے اپنے مزاج کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔مگر ایسی عدالت اور وہ بھی دینی عدالت کا کیا کہنا جو کھلی عدالت میں اپنے ایک نوکر کے ہاتھ سے ایک ایسے ملزم کے ساتھ جس پر بھی جرم ثابت نہیں ہوا ایسا سلوک گوارا کرے۔

مگر سردار کاہن اپنے مقصد میں ناکام رہا اور اب اُس نے مجبوراً وہ طریق اختیار کیا جو اُسے پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔یعنی گواہوں کو بلوایا۔مگر اس میں بھی افسوس ناک ناکامی ہوئی۔انہیں اس امر کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔کہ باقاعدہ طور پر الزام تیار کرتے اور اُس کے لئے گواہ بہم پہنچاتے۔لیکن اب وقت بھی نہیں رہا تھا۔گواہی جوں توں پیش کرنی ضرور تھی۔اور غالباً یہ دربار کے شاگرد پیشہ اور عدالت کے گواہی پیشہ لوگوں میں سے تھے۔جو ٹکے ٹکے پر جھوٹ بولا کرتے ہیں۔مقدس متی نے صاف لکھا ہے کہ ''وہ یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اُس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے''۔یہ اُس کا

مار ڈالنا تھا جو انہوں نے پہلے ہی سے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا۔ اور وہ اُس کے لئے صرف ایک قانونی حیلہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اور اس امر کی انہیں کچھ پروانہ تھی۔ کہ یہ حیلہ کیا ہونا چاہیے۔ مگر اُن کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ گواہوں کی گواہی باہم متفق نہ تھی۔ بہتوں کو آزمایا گیا۔ مگر معاملہ بد سے بد تر ہوتا گیا۔

آخر کار دو گواہ ملے جو ایک بات میں جو انہوں نے اُس کی زبانی سنی تھی۔ باہم متفق تھے۔ اور یہ اُمید کی جاتی تھی۔ کہ اُن کی شہادت کی بنا پر فردِ جرم قائم کی جائے گی۔ انہوں نے اُسے یہ کہتے سنا تھا۔ کہ میں اس مقدس کو جو ہاتھ سے بنی ہے ڈھاؤں گا۔ اور تین دن میں دوسری بناؤں گا جو ہاتھ سے نہ بنی ہو۔ یہ ایک فقرہ تھا۔ جو اُس نے اپنی رسالت کے ابتدا میں کہا تھا۔ جو اعلیٰ درجہ کی فصاحت بلاغت پر دلالت کرتا تھا۔ مگر وہ اُسے اپنے روز مرّہ کے محاورہ میں بیان کر رہے تھے۔ اگرچہ ظاہری معنوں کے لحاظ سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں کیا نقص پکڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اگر اس کے پہلے حصّے کے یہ معنی تھے۔ کہ وہ ہیکل کو ڈھائے گا۔ تو دُوسرے حصے میں صاف وعدہ ہے کہ وہ اُسے پھر بنا کھڑا کرے گا۔ سردار کاہن خوب جانتا تھا کہ اس سے کچھ مطلب براری (مقصد پورا ہونا) نہ ہوگی۔ اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اُس نے یسوع سے دریافت کیا تو کچھ جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ اس نے ظاہر اَ یہ دکھانے کی کوشش کی کہ گویا اُس کے نزدیک اس قول میں کوئی بڑی سخت کفر آمیز بات چھپی ہے۔ لیکن اس سارے اضطراب (بے چینی) کا اصل باعث یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ یہ امر بالکل نے بنیاد ہے۔

جب گواہ ایک دوسرے کی گواہی کے بخیے ادھیڑ رہے تھے۔ یسوع چپ چاپ سنا کیا۔ اور نہ اس نے سردار کاہن کے اس سوال کا کچھ جواب دیا۔ اُسے بولنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ کیونکہ اُس کی یہ خاموشی بلند آواز سے بھی بڑھ کر صاف صاف پکار رہی تھی۔ اس سے ججوں کو خود اپنی حالت کی شرمناکی اور بے ہودگی کا یقین ہو گیا۔ اور جب وہ خاموش اور پُر اطمینان صورت اُن کی اس کارروائی پر بڑی تمکنت (اختیار) کے ساتھ نظر کر رہی تھی۔ تو اُن کا پتھر سا ضمیر بھی خود بخود بے چین ہونے لگ گیا۔ اور یہ اُس کی اس بے اطمینانی اور بے چینی کی وجہ سے تھا کہ سردار کاہن کو اپنی آواز بلند کرنے اور چلانے کی ضرورت پڑی۔

قصہ مختصر اس دوسرے طریق سے بھی جو اُس نے اختیار کیا تھا اُسے ایسی ہی زک (شرمندگی۔شکست) نصیب ہوئی۔ جیسی پہلی طریق میں۔ مگر بھی اُس کے پاس تاش کا ایک اور پتہ باقی تھا۔ اور وہ اُسے بھی کھیل بیٹھا۔ وہ اپنی چوکی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور یسوع کی طرف متوجہ ہو کر بڑی مگر بناوٹی سنجیدگی سے پوچھنے لگا کہ میں تجھے زندہ خُدا کی قسم دیتا ہوں۔ کہ اگر تو خُدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یا دوسرے لفظوں میں گویا اُس نے اُس سے حلفیہ اقرار مانگا کہ جو کچھ وہ اپنی نسبت دعویٰ کرتا ہے۔ سو بتادے۔ کیونکہ یہودیوں کے درمیان قیدی نہیں قسم کھاتا تھا۔ بلکہ جج قسم دیتا تھا۔

یہ موقع یسوع کی زندگی میں ایک بڑا اہم تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے اس امر کو تسلیم کیا کہ سردار کاہن کو قسم دینے کا حق ہے۔ یا کم سے کم اُس نے یہ سمجھا کہ اگر اب خاموش رہوں تو یہ سمجھا جائے گا۔ کہ میں اپنے دعویٰ سے باز آگیا ہوں۔ وہ درحقیقت جانتا تھا کہ یہ سوال اُسے مجرم ثابت کرنے کی غرض سے پوچھا گیا ہے۔ اور اس کا جواب دینا گویا اپنے لئے موت خریدنا ہے۔ مگر جس نے اُن لوگوں کو جنہوں نے مسیح کا خطاب زبردستی اُس پر تھوپنا چاہا تھا تا کہ اُسے اپنا بادشاہ بنالیں دم بخود کر دیا تھا۔ اُس نے اب اُسی خطاب کو قبول کر لیا۔ جب کہ ایسا کرنا گویا سزائے موت کا سزاوار بننا تھا۔ اور اُس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور بڑے وثوق سے جواب دیا۔ ہاں میں ہوں۔ اور پھر گویا کہ اس موقع سے اُس کی خود آگاہی اور بھی زور میں آگئی اور وہ بولا۔ کہ آگے کو تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے۔ اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔ نیز دیکھو زبور ۱۱۰: ۱۔

اور دانی ایل ۷: ۱۳۔اس وقت تو وہ اُس کے جج بنے بیٹھے ہیں لیکن ایک دن آنے والا ہے جب وہ اُن کا جج ہو گا۔ وہ صرف اُس کی زمینی زندگی پر اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اُن کی ابدی زندگی کا فیصلہ کرے گا۔

لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ مسیحی لوگ یسوع کی نسبت ایسی ایسی باتوں کے دعویدار ہیں جن کا اُس نے خود کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ وہ یہ کہتے سنے جاتے ہیں۔ کہ اس نے تو کبھی انسان سے بڑھ کر اور کچھ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یہ اسے خُدا بنائے دیتے ہیں۔ لیکن یہ عظیم حلفیہ اقرار سن کر ہر ایک حق پسند کو مسیحیوں کے اس اعتقاد کی درستی کا اقرار کرنا پڑے گا۔ اُس کے الفاظ کو اُن کے اصلی معنوں سے خالی کرنے اور اُن کی قیمت کو گھٹانے کی ہر طرح سے کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جب سردار کاہن نے سوال کیا کہ کیا وہ ابنِ اللہ ہے۔ تو اُس کا فقط یہی مطلب تھا کہ کیا وہ مسیح ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو کچھ مسیح نے اپنے حق میں کہا اُسے کیا کریں کہ وہ قادرِ مطلق کے دہنے بیٹھے گا اور آسمان کے بادلوں پر آئے گا؟ کیا وہ جو انسان کا قاضی ہونے کو ہے۔ اور جو اُن کے دلوں کی تہ تک چھان بین کرے گا۔ اور اُن کے اعمال کا اندازہ لگائے گا۔ اور اس اندازہ کے مطابق اُن کے ابدی مقام اور درجہ تعین کرے گا۔ کیا وہ محض انسان ہو سکتا ہے؟ سب سے عظیم اور عقیل انسان بھی خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک انسان کی تاریخ میں بلکہ ایک ننھے بچے کے دل میں بھی ایسے ایسے اسرار و درراز مخفی (چھپے) ہیں۔ جن کی تہ کو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ محض انسان ایک دوسرے انسان کی خصلت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی ٹھیک ٹھیک نہیں جانچ سکتا۔

مگر یہ عظیم الشان اقرار کس نظارہ کے پایہ کو کس قدر بلند کر دیتا ہے۔ ہم اب اُن چھوٹے چھوٹے آدمیوں اور اُن کی کمینہ کارروائیوں کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ وہاں ایک ابنِ آدم تمام عالم کے سامنے اپنے حق میں شہادت دیتا ہوا نظر آتا ہے ہمیں اب اس کی کیا پرواہ ہے کہ وہ یہودی اُس کے حق کیا کہیں گے۔ یہ عظیم اقرار اُس وقت سے لے کر سب زمانوں میں برابر گونجتا چلا آیا ہے۔ اور ایک عالم بھر کا دل جب اُسے اُس کی زبان سے سنتا ہے تو خواہ مخواہ آمین پکار اُٹھتا ہے۔ آخر کار سردار کاہن کا مطلب نکل آیا کفر کے کلمات سننے پر جیسا کہ سردار کاہن کو لازم تھا۔ اُس نے اپنے کپڑے پھاڑے۔ اور اپنے رفیقوں (ساتھیوں) کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی؟ تم نے یہ کفر سنا۔ اور ان سب نے اتفاق رائے ظاہر کیا کہ یسوع مجرم ہے۔ اور سزائے موت کا سزاوار ہے۔

بعض اوقات ایک نیک دل آدمی کو بائبل میں ان واقعات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال ستایا کرتا ہے۔ کہ یسوع کے ججوں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کے فتویٰ کی پیروی میں کیا۔ کیا یہ اُن کا فرض نہ تھا۔ کہ جب کوئی مسیح ہونے کا دعویٰ دار ہو کر اُن کے سامنے آئے تو اس بات کی تحقیقات کریں کہ آیا اُس کا یہ دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا؟ اور کیا وہ سچے دل سے یہ یقین نہ رکھتے تھے۔ کہ یسوع جس امر کا دعویٰ دار ہے وہ درحقیقت نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ سچے دل سے ایسا یقین رکھتے تھے۔ مگر ہمیں اس سے پہلے زمانہ کے حالات پر غور کرنا چاہیے پیشتر اس کے کہ ہم اُن کے چال چلن پر صحیح طور سے حکم لگا سکیں۔ اُن کی گمراہی اُس وقت سے شروع ہوئی۔ جب کہ پہلے پہل یسوع کے دعوے اُن کے سامنے پیش کئے گئے۔ اُسے جیسا کہ وہ تھا۔ فقط اُمید وار اور منتظر پاک دل ہی قبول کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر یہودیہ کے دینی حاکم اس وقت دل کی اس حالت سے کوسوں دُور تھے۔ وہ اُس کی حقیقت کو سمجھنے کی ہر گز قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ اور اُس میں انہیں کوئی ایسی خوب صورتی نظر نہیں آتی تھی۔ کہ وہ اُس کے خواہش مند ہوتے۔ جیسا کہ وہ خود بھی انہیں کہا کرتا تھا۔ کہ جس حالت میں وہ ہیں۔ اُس حالت میں وہ ہر گز اُس پر ایمان نہیں لا سکتے۔ قصور اس قدر اس امر میں نہیں تھا۔ کہ انہوں نے کیا کیا۔ بلکہ اس میں کہ اُن کی اپنی حالت کیسی بُری تھی۔ چونکہ انہوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے وہ آخر تک اُسی راستہ پر چلتے گئے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس قدر روشنی انہیں ملی تھی۔ وہ اُسی کے مطابق چلے۔ مگر روشنی جو اُن میں تھی۔ وہ حقیقت تاریکی تھی۔ مگر اُن کے اس موقع کی کاروائی کو

دیکھ کر جو شخص اُس پر توجہ سے غور و فکر کرے گا۔ اُس کا دل ہر گز اُن کی طرف نرم نہ ہو گا۔ اُن کی اس وقت کی کاروائی میں ہر گز عدل وانصاف کی بو بھی نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اُس وقت نہ تو اُس پر کوئی باقاعدہ الزام لگایا گیا۔ نہ باقاعدہ گواہی پیش کی گئی۔ اور نہ انہیں اس بات کا ہی خیال آیا کہ ملزم کو بھی اپنی صفائی کی شہادت پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ وہ خود ہی مدعی تھے۔ اور خود ہی جج۔ فتویٰ پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا۔ اور اس ساری کاروائی کو ایک طرح کا جال کہنا چاہیے۔ جو اس غرض سے بچایا گیا تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح سے ملزم کے منہ سے کوئی ایسی بات کہلوائیں جس سے وہ خود پھنس جائے۔ اور انہیں اس پر فتویٰ لگانے کی حجت (موقع) مل جائے۔[1]

لیکن جو کچھ انہوں نے فتویٰ لگانے کے بعد کیا۔ اُس کی وجہ سے وہ آئندہ نسلوں کے فیاض اور انصاف پسند لوگوں کی ہمدردی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ عدالت گاہ میں تمکنت اور عزت کا لحاظ ہونا چاہیے۔ جب کسی بڑے مقدمہ کی تحقیقات ہوتی ہو اور ایک سنگین فتویٰ دیا جائے۔ تو اس کی ججوں کے مزاج پر بھی تاثیر ہونی چاہیے۔ بلکہ مجرم پر بھی جب کہ اُس پر موت کا فتویٰ دیا جائے ایک قسم کے رُعب داب کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مگر وہ ضرب جو ایک ادنیٰ ملازم نے تحقیقات کے شروع ہی میں ملزم کے چہرہ پر لگائی۔ اور اُس سے کسی نے اُس کی باز پُرس نہ کی۔ یہی بات اُن لوگوں کے دل کی اُس وقت کی حالت کو بخوبی آشکارا کرتی ہے۔

اُن کے دل میں ہر گز کسی قسم کی سنجیدگی یا تمکنت کا ذرہ بھی موجود نہ تھا۔ جو کچھ وہ اس اپنے اندر محسوس کرتے تھے۔ سو فقط انتظام اور کینہ کا جذبہ تھا جس کے پورا کرنے کے لئے وہ اپنے مخالف کو جس نے اُن کو نقصان پہنچایا تھا معدوم (ختم) کرتا چاہتے تھے۔ اس قسم کی حسّات کا سمندر عرصہ سے اُن کے دلوں میں اُمڈ رہا تھا۔ اور اب جونہی اُس نے موقع پایا۔ وہ پھوٹ نکلا۔ انہوں نے اُسے لکڑیوں سے مارا۔ اُس کے منہ پر تھوکا۔ اور اُس کے سر پر کپڑا ڈال کر اور ٹھوکریں لگا کر پوچھنا شروع کیا کہ "مسیح نبوت سے بتا کہ تجھے کس نے مارا[2]۔ کاش کہ یہ فقط ادنیٰ درجہ کے کمینہ لوگ ہی ہوتے۔ جنہوں نے ایسا برتاؤ کیا ہوتا۔ مگر انجیلی بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے آقاؤں نے ایسا کیا۔ اور اُن کے نوکروں نے اُن کی تقلید (پیروی) کی۔

آدمی کے اندر خوفناک باتیں بھری پڑی ہیں۔ اُس کی فطرت میں بعض ایسے گہراؤ ہیں۔ جن میں نظر کرنے سے خوف آتا ہے۔ یہ مسیح کی کاملیت تھی۔ جس کے سبب سے اُس کے دشمنوں کی گہری سے گہری شرارت باہر نکل آئی۔ ملٹن کی مشہور نظم متعلقہ نقصان فردوس میں ایک فقرہ ہے۔ جس میں یہ ذکر ہے۔ کہ فرشتوں کی ایک جماعت فردوس میں شیطان کی تلاش میں جو وہاں چھپا ہوا تھا۔ بھیجی گئی۔ انہوں نے اُسے ایک مینڈک کی شکل میں حوا کے کان کے پاس بیٹھے ہوئے پایا۔ اُسے دیکھ کر ایک فرشتے نے جو اُس جماعت میں سے تھا۔ اُسے اپنی برچھی سے چھوا۔ جس پر وہ دفعتاً متنبہ (خبردار) ہو گیا۔ اور فوراً اپنی اصلی شکل اختیار کر لی کیونکہ

---

[1] ، چنانچہ خود جوسٹ نامی ایک یہودی مورخ اس کو خون کے نام سے پکارتا ہے۔ مگر وہ یقین نہیں کرتا۔ کہ اُس موقع پر کوئی باقاعدگی تحقیقات کی گئی تھی اور ایڈر شایم صاحب بھی اس امر میں اُس سے متعلق ہیں۔

[2] ۔ اس سبب سے کہ اُس نے مسیح اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ برخلاف اس کے رومیوں نے اُسے بادشاہ کہہ کر اُس کی تضحیک کی۔

روحانیوں کے سامنے جھوٹ اپنی آب و تاب

کھو بیٹھتا ہے اور اُلٹ دیتا ہے نقاب

مگر کامل کے مساس سے اکثر اُلٹا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ فرشتے کو مینڈک کے صورت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جو بدی کی اصلی صورت ہے۔ مسیح اب اپنے دشمن سے بالکل رُوبرُو تھا۔ جس پر غالب آنے کے لئے وہ اس دُنیا میں آیا تھا۔ اور جب آخری کُشتی کے لئے اُس نے مسیح پر ہاتھ ڈالا تو اپنی تمام بدصورتی اور بھیانک پن کو ظاہر کر دیا اور اپنا سارا زہر اُس پر اُگل دیا۔ اژدہا کا پنجہ اُس کے گوشت میں گڑا تھا۔ اور اُس کے بدبودار سانس اُس کے منہ پر تھے۔ ہم اُس بے عزتی اور بے حرمتی کا جو اُس وقت مسیح کی شاہانہ طبیعت نے برداشت کی۔ پورا تصور نہیں باندھ سکتی۔ لیکن اُس نے اپنے دل کو مضبوط کر لیا کہ سب کچھ برداشت کرے۔ مگر ہمت نہ ہارے۔ کیونکہ وہ اس لئے آیا تھا کہ گناہ کے حق میں موت ثابت ہو۔ اور اسی گناہ کے لئے موت بننے سے دُنیا کی نجات تھی۔

تیسرا باب

پطرس کا انکار

ہمارے خُداوند کے دینی عدالت کے سامنے پیش ہونے کے متعلق ایک اور ضمیمہ (زائد پرچہ) سا ہے جس پر تھوڑی دیر کے لئے غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ٹھیک اُسی وقت جب کہ سردار کاہن کے گھر کے دالان میں یسوع اپنا عظیم الشان اقرار کر رہا تھا۔ اُس کا ایک شاگرد اُسی مکان کے صحن میں انکار پر انکار کر رہا تھا۔

ا۔

جب یسوع کو گتسمنی میں باندھ کر یروشلیم میں لے گئے۔ تو اُس کے تمام شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ باغ کے درختوں اور جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ اور وہاں سے ارد گرد کے گاؤں میں یا جہاں کہیں جس کے سینگ سمائے بھاگ گئے۔

مگر بارہ میں سے دو یعنی مقدس پطرس اور یوحنا جو یہ قصّہ بیان کرتا ہے بہت جلد پہلی گھبراہٹ کے اثر سے نکل کر کچھ فاصلہ پر اُس جماعت کے پیچھے پیچھے جو اُن کے خُداوند کو پکڑے ہوئے لے جا رہی تھی۔ چلے گئے کبھی تو درختوں کے سایہ میں۔ اور کبھی گھروں کے سایہ میں پناہ لیتے ہوئے وہ برابر اُس جماعت کے پیچھے پیچھے لگے رہے۔ آخر کار جب وہ منزلِ مقصود پر جا پہنچے یعنی سردار کاہن کے محل پر تو فی الفور بزدوہی تمام آگے بڑھے۔ اور مقدس یوحنا جماعت کے ہمراہ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ مگر کسی وجہ سے۔ شاید اُس وجہ سے کہ اُسے حوصلہ نے جواب دے دیا۔ مقدس پطرس باہر گلی میں کھڑا رہ گیا۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔

جو کچھ بعد میں واقع ہوا۔اُس کے سمجھنے کے لئے ایک ایسے محل کی۔ جیسا کہ سردار کاہن کا تھا۔عمارت کے نقشہ کا سمجھنا ضروری ہے باہر گلی میں ایک بڑا محراب دار دروازہ تھا۔جس میں بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔جب دروازہ کُھلتا ہے۔تو اندر ایک چوڑا مسقف (چھت دار)راستہ دکھائی دیتا ہے۔جو سامنے کی عمارت تک چلا گیا ہے۔اور وہاں ایک صحن میں داخل ہوتا ہے۔جو اوپر سے بالکل کھلا ہے۔اور جس کے چاروں طرف مکانات بنے ہوئے ہیں۔اور اُن سب کے دروازہ اور کھڑکیاں اندر کی طرف اُسی صحن میں کھلتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ بھی یادرکھنا چاہیے۔کہ مذکور بالا راستہ میں بیرونی دروازہ کے اندر ایک طرف کو ایک یا زیادہ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہیں۔جن میں دربان رہتا ہے جس کا کام دروازہ کو کھولنا اور بند کرنا ہے۔اور اس بڑے پھاٹک میں ایک اور چھوٹا سا دروازہ ہے۔جس میں سے لوگ آتے جاتے ہیں۔

جب یہ بڑی جماعت یسوع کو لئے ہوئے محل کے سامنے پہنچی تو بلاشبہ دربان نے اُن لوگوں کے داخل کرنے کے لئے دروازہ کھول دیا اور پھر بند کر دیا گیا ہوگا۔وہ محرابی راستہ سے ہوتے ہوئے صحن میں جا پہنچے اور اُس میں سے گذر کر ایک دالان میں جا داخل ہوئے۔مگر پولیس اور دیگر ملازم جو اس گرفتاری میں شریک تھے۔اُن کا کام اب ہو چکا تھا۔اس لئے وہ باہر صحن میں ہی کھڑے رہے۔اور چونکہ اب آدھی رات کا وقت تھا۔اور سردی پڑ رہی تھی۔انہوں نے وہیں باہر آگ جلائی۔اور اس کے گرداگرد جمع ہو کر تاپنے لگے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔یوحنا جماعت کے ہمراہ اندر چلا گیا۔مگر پطرس باہر ہی کھڑا رہ گیا۔یوحنا جو باقی بارہ رسولوں میں سے زیادہ صاحب عزت وثروت معلوم ہوتا ہے۔سردار کاہن سے واقف تھا۔اور اس لئے غالباً محل میں آمدورفت ہونے کے سبب نوکر چاکر اُسے پہچانتے تھے۔اور جب اس نے دیکھا کہ پطرس باہر رہ گیا ہے۔تو وہ دربان کے پاس گیا۔اور اُسے کہہ کر پطرس کو کھڑکی کے راستہ اندر بُلا لیا۔

اُس نے تو اپنی طرف سے دوستی کا حق ادا کیا۔لیکن جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا۔یہ پطرس کے حق میں اچھا ثابت نہ ہوا۔یوحنا نے ایک طرح پطرس کو آزمائش کے چنگل میں گرفتار کرا دیا۔عمدہ سے عمدہ دوست بھی بعض اوقات ایسے فعل کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔کیونکہ ایک موقع جہاں ایک شخص بلا خوف وخطر جا سکتا ہے۔ممکن ہے کہ دوسرے کے حق میں نہایت خطرناک ثابت ہو۔ایک آدمی ایک قسم کے لوگوں سے بلا تکلف میل ملاپ رکھے۔اور نقصان نہ اُٹھائے۔لیکن دوسرے کے لئے اُسی جماعت کی رفاقت زہرِ قاتل کا کام دے۔ایسے اشغالِ تفریح بھی ہیں۔جن میں ایک مسیحی بلا خوف شامل ہو سکتا ہے۔لیکن دُوسرا اگر اُسے چھوجائے۔تو برباد ہو جائے۔ایک پختہ کار اور تربیت یافتہ آدمی ایک قسم کی کتابوں کو بلا خوف وضرور مطالعہ کر سکتا ہے۔جو دوسرے آدمی میں جو اُس سے کم تجربہ کار ہے۔دوزخ کی آگ پھونک دیتی ہیں۔ہمیشہ ہر ایک آزمائش دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ایک طرف تو خاص قسم کے حالات ہوتے ہیں۔جن سے آدمی کو سابقہ پڑتا ہے۔اور دوسری طرف اُس شخص کی۔جو اُس حالت میں داخل ہوتا ہے۔خاص خصلت ومزاج اور گذشتہ زندگی کی تاریخ ہوتی ہے۔اگر ہم اپنے کو یا کسی دوسرے کو کسی آزمائش سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ دونوں باتیں یادرکھنی چاہئیں۔

۲۔

یوحنا بلاشبہ پطرس کو دروازہ کے اندر داخل کر کے فی الفور اُس دالان کی طرف جہاں یسوع تھا چلا گیا تاکہ دیکھے کہ وہاں کیا کاروائی ہو رہی ہے۔ مگر پطرس نے ایسا نہ کیا۔وہ اُس مقام سے ایسا واقف نہ تھا۔جیسا کہ یوحنا۔اور وہ غالباً ایسے بڑے محل کے اندرونہ کو دیکھ کر کچھ ہکابکا سا رہ گیا جیسے کہ دیہاتی لوگ عمر میں پہلی دفعہ کسی عظیم الشان شہر میں جا کر حیرت زدہ سے ہو جایا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اُس کے دل میں یہ خوف بھی تھا۔کہ کہیں لوگ اُسے

پہچان کر کہ وہ بھی یسوع کے پیروؤں میں سے ہے گرفتار نہ کرلیں۔ نیز اب اُس کم بخت ضرب نے جو وہ گتسمنی کے دروازہ پر ملکوس کے لگا بیٹھا تھا۔اُس کی دقت کو اور بھی بڑھا دیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے سبب اُس کے پہچانے جانے کا خدشہ اور بھی زیادہ ہوگیا۔

اس لئے وہ فقط پھاٹک کے اندر ہی سے اور اُسی محرابی راستہ کی تاریکی میں کھڑا ہوا دیکھا کیا کہ اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر اُسے خبر نہ تھی۔ کہ دربان عورت اپنی چوکی پر بیٹھی اُسے تاڑ رہی ہے۔ اُس کی طبیعت بے چین ہو رہی تھی۔ کیونکہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ یوحنا کی طرح اُسے حوصلہ نہ تھا۔ کہ بڑے دالان کے اندر چلا جائے۔ شاید اُس کا دل کچھ کچھ اس امر کا خواہش مند بھی تھا کہ اچھا ہوتا کہ پھر گلی میں نکل جاتا۔ کیونکہ وہ اپنے کو ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا دام میں جا پھنسا ہے۔

آخر کار وہ آگے بڑھ کر اُس جماعت میں جو آگ کے گردا گرد جھرمٹ کئے ہوئے تھی۔ جا بیٹھا اور آگ تاپنے لگا۔ اس جماعت میں مختلف قسم کے اشخاص شامل تھے۔ اور اس لئے کسی نے اُس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور وہ بھی اُن میں ایسا جا ملا گویا انہیں میں سے تھا۔

مگر یہ ایک دوسرے معنی میں جس کا اُسے خیال بھی نہیں تھا۔ ایک خوفناک حالت تھی۔ اُسے تو اپنے بدن کا خوف ہو رہا تھا۔ مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اُس کی رُوح معرضِ خطر میں ہے۔ حالانکہ یہ خطرہ اُس کے قریب ہی منڈلا رہا تھا۔ یہ بات ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ جب کہ یسوع کا شاگرد یسوع کے دشمنوں کے درمیان جا بیٹھا ہے۔ مگر انہیں بتاتا نہیں کہ وہ کون ہے۔ مبارک وہ آدمی ہے جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا۔ اور خطاکاروں کی راہ پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کی مجلس میں نہیں بیٹھتا۔ یہ اغلب ہے کہ جب پطرس اُن لوگوں کے درمیان جا کر بیٹھا تو تمام مکان یسوع کے خلاف ٹھٹھے اور تمسخر سے گونج رہا تھا۔ مگر اُس نے انہیں نہ روکا۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ بلکہ ظاہراً جہاں تک ممکن تھا۔ اُن ٹھٹھا کرنے والوں کی سی صورت بنانے کی کوشش کی ہوگی۔ مگر مسیح کا اقرار نہ کرنا اُس سے انکار کرنے کا پہلا قدم ہے۔

آزمائش جیسا کہ اُس کا قاعدہ (طریقہ) ہے۔ بالکل اچانک اور ایک ایسی جانب سے آئی۔ جہاں سے آنے کی ہر گز اُس کو اُمید نہ تھی۔ جیسا کہ ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں جب کہ وہ محرابی راستہ کے نیچے چھپ رہا تھا۔ اُس کی حرکات کو دربان عورت خوب تاڑ رہی تھی۔ ان سے خواہ مخواہ دیکھنے والے کے دل میں شبہ پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ اپنی زنانہ سوجھ کے ساتھ فی الفور اُس کے راز کو تاڑ گئی۔ اس لئے جب وہ اپنے پہرہ سے چھُوٹی۔ تو اُس نے نہ صرف دوسری دربان عورت کو اشارہ سے اُسے بتا دیا۔ بلکہ جو کچھ اس کے دل میں اس کی نسبت خیال تھا۔ وہ بھی جتا دیا۔ اور جب اپنے کمرہ کو جانے لگی۔ تو وہ آگ کی طرف جہاں سپاہی بیٹھے تھے۔ بڑھی۔ اور پطرس سے آنکھیں دوچار کرکے بڑی کینہ وری سے کہنے لگی۔ یہ بھی ناصری کے پیروؤں میں سے ہے۔ پطرس یہ سُن کر بالکل حیران و ششدر (ہکا بکا۔ پریشان) رہ گیا۔ کیونکہ وہ اس کے لئے ہر گز تیار نہ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا اُس کے چہرہ پر سے ایک نقاب اُتار دیا گیا ہے۔ دفعتاً (اچانک) خوف وہراس اُس پر ایسا غالب آیا کہ اور سب کچھ بھول گیا۔ شاید اس امر سے بھی اُسے کچھ شرم آئی ہوگی۔ کہ اپنے اپنے کو اُس شخص کا شاگرد ظاہر کرے۔ جس کی سب لوگ ہنسی اُڑا رہے تھے۔ اس میں ایک اور شرم کی بات بھی تھی۔ بھلا وہ اب کس طرح اپنے کو اس شخص کا شاگرد ظاہر کر سکتا تھا۔ جس کی ہتک اور تحقیر کو وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ اور اُس کی حمائت میں اب تک منہ نہ کھولا۔ وہ پہلے اپنے فعل سے اپنے آقا کا انکار کر چکا تھا۔ پیشتر اس کے کہ اس نے زبان سے ایسا کیا بلکہ اُس کے فعل نے ان الفاظ کو ایک طرح سے لازمی ٹھہرا دیا۔ اور اب وہ چنیں بجبیں ہو کر بولا۔ میں نہیں جانتا تُو کیا کہتی ہے۔ اور اُس عورت نے ہنستے ہوئے۔ گویا اس طور سے اپنا کام سرانجام کرکے اپنی راہ لی۔

اس کے بعد کسی نے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا۔ مگر پطرس بے چین ہو رہا تھا۔ اور جس قدر جلد ہو سکا۔ آگ کے پاس اُٹھ کر چل دیا۔ وہ پھر اُسی محرابی راستہ میں جا دبکا۔ اور ظاہراً اُس کا یہ منشا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہو سکے۔ تو وہاں سے نکل جائے۔ مگر یہاں دام کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ اور دوسری عورت

جسے اُس کے رفیق (ساتھی) نے پطرس کے حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور جو غالباً دور ہی سے اپنے رفیق کی چوٹ پر ہنستی رہی ہو گی۔ دو تین آدمیوں کے ہمراہ اپنے پہرے پر کھڑی تھی۔ اور جب وہ اُس کی طرف بڑھا۔ تو اشارہ کر کے کہنے لگی۔ یہ بھی ناصری کے پیروؤں میں سے ہے۔

بے چارہ پطرس! ایک عورت کے ہاتھ نے پھر اُسے زمین پر پچھاڑ دیا۔ لیکن کتنی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت کی کترنی زبان اور تمسخر آمیز قہقہہ آدمی کو اعلیٰ اور مقدس باتوں کی طرف سے شرما دیتا ہے۔ پطرس نے غصہ سے قسم کھائی۔ اور اُلٹے پاؤں لوٹ کر پھر آگ کی طرف چلا گیا۔

اب وہ بالکل حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اور خودداری کو کھو بیٹھا تھا۔ اُس کے دل میں مختلف جذبات جوش مار رہے تھے۔ اور امن چین سے بیٹھنا اُس کے لئے ناممکن تھا۔ ایسی صورت بنا کر جس سے دلیری اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ بات چیت میں شریک ہو گیا۔ اور سب سے بڑھ بڑھ کر بڑّانے لگا ۔تاکہ کوئی شخص اُس پر شک و شبہ نہ کرے۔ مگر ایسا کرنے سے اُلٹا اُس نے اپنے اصلی مُدعا کو کھو دیا۔ کیونکہ اس سے سب کی آنکھیں اُسی کی طرف پھر گئیں ۔اور جس قدر وہ زیادہ جوش میں آتا گیا۔ اُسی قدر وہ زیادہ غور سے اُسے گھورنے لگے۔ مالکوس جس کا کان اُس نے اُڑا دیا تھا۔ اُس کے ایک رشتہ دار نے اُسے پہچان لیا۔ اُس کی بلند گنوارے آواز اور گلیل کے خاص لہجہ نے دوسروں کے دل میں بھی شک پیدا کر دیا۔ رات کے وقت بیکار بیٹھے بیٹھے انہیں ایک اچھا شغل ہاتھ لگ گیا کہ آؤ اسے پھانسنے کی کوشش کریں۔ اور سب کے سب مل کر اب شکار کے پیچھے ہو لئے۔

پطرا اب بالکل اپنے کو کھو بیٹھا تھا۔ جیسا کہ سانڈ کو تماشا گاہ میں ہر طرف سے حملہ کر کے برچھیوں کی ضربیں لگاتے ہیں۔ وہ غضب غصہ اور خوف و شرم کے مارے دیوانہ سا ہو گیا۔ اور انکار پر انکار کرنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی اپنے مخالفوں کو بُرا بھلا کہنے لگا۔

آخر الذکر عادت گویا اُس کی قدیم ماہی گیری کی زندگی کا اعادہ (دہرانا) تھا۔ جو عرصہ سے مر کر دفن ہو چکی تھی۔ پطرس کے سے مزاج والے آدمی سے ہم اُمید کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنی جوانی کے زمانہ میں ضرور گالی گلوچ اور بدزبانی کا عادی ہو گا۔ وہ ضرور شورہ سر آدمی ہو گا۔ اور منہ میں جو آتا ہو گا بک دیتا ہو گا۔ یہ ایسا گناہ ہے کہ جس کی قدرت عموماً دل کی تبدیلی کے وقت کے قلم ٹوٹ جایا کرتی ہے۔ اگرچہ دوسرے گناہ ہیں۔ جو سالہا سال تک پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اور اُن کی بوٹی بوٹی کو علیحدہ علیحدہ صلیب پر کھینچنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بدزبانی اکثر آفاً فاناً ئیں مر جایا کرتی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی گذشتہ زندگی کی بُرائیوں سے کامل چھٹکارا مشکل ہے۔ پطرس میں ظاہراً یہ گناہ اُس کے دل کی تبدیلی کے وقت مرُدہ معلوم ہوتا ہو گا۔ سالہا سال تک یہ بالکل مرُدہ اور مدفون (دفن) رہا۔ لیکن جب مناسب موقع ہاتھ لگا۔ تو دیکھو وہ اپنے پورے زور و طاقت میں نمایاں ہو گیا۔ گناہ کی پُرانی عادتوں کو قتل کرنا مشکل کام ہے۔ کبھی کبھی ایساً معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا ہم نے انہیں مار کر ہرا دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہم کو زمین کے نیچے سے کھٹکھٹانے کی آواز نہیں آیا کرتی؟ کیا کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ گویا مرُدہ اپنے تابوت میں کروٹ لے رہا ہے۔ اور اُس کی قبر کے اوُپر کی مٹی ہل رہی ہے۔ جو دن ہم نے جسمانی اور نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے میں خرچ کئے ہیں۔ اُن کی یہی سزا ہے جو آدمی کبھی شرابی یا زانی۔ دروغ گو یا بدزبان رہ چکا ہے۔ اُسے مرتے دم تک بڑی ہشیاری سے اپنی خبرداری کرنی ضرور ہے۔ اور اُس قبر پر جہاں اُس کی گذشتہ زندگی مدفون ہے۔ پہرا دینا چاہیے۔

مگر اُس کی یہ دیوانگی بھی اُس کے کام آگئی۔ جب وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ مسیح کا نہیں ہے۔ تو اُس بدزبانی سے بڑھ کر اُسے شاید بہتر علاج نہ ملتا ہے۔ جب اُس نے نہیں یقین دلانا چاہا کہ وہ اُستاد سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تو انہوں نے اُس کا یقین نہ کیا۔ لیکن جب اُس نے اس طرح کی بدزبانی اختیار کی تو انہیں اُس کی بات پر شبہ نہ رہا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ مسیح کا کوئی پیرو اس قسم کی باتیں نہ کرے گا۔ جیسی کہ پطرس کر رہا تھا۔ یہ مسیح کے حق ایک نہایت عمدہ شہادت ہے کہ جو اُس پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ بھی اُس کے شاگردوں سے نیک گوئی اور نیک چلنی کی اُمید رکھتے ہیں۔ اور اگر اُن میں سے جو اُس کے نام سے

کہلاتے ہیں۔ کوئی شخص ایسے کام کر بیٹھے۔ توانہیں بڑا تعجب ہوتا ہے۔ جو اگر وہ دوسروں کو ایسا کرتے دیکھے تو ایک معمولی بات سمجھ کر اُس کی کچھ پروا نہ کرتے۔

۴۔

جب پطرس اس انکار و بدزبانی کی دہشت میں گرفتار تھا۔ تو دفعتاً اُس نے دیکھا کہ اس کے ستانے والوں کی آنکھیں اُس کی طرف سے ہٹ کر کسی اور چیز کی طرف لگ گئی ہیں[1] یہ یسوع تھا۔ جس پر اُس کے دشمنوں نے عدالت میں فتویٰ لگادیا تھا۔ اور اب اُسے گالیاں دیتے اور زدو کوب کرتے ہوئے صحن میں سے ہوتے ہوئے حوالات کی طرف لے جارہے تھے۔ جہاں اُسے دو تین گھڑی تک زیر نگرانی رکھنا ضرور تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ دوبارہ عدالت کے رُوبرُو پیش کیا جائے۔ جب یسوع دالان سے نکل کر صحن میں داخل ہوا۔ تو اُس کے کانوں میں اُس کے شاگرد کی آواز پہنچی۔ اور ایک ناقابلِ بیان ضرب (چوٹ) سے مجروح (زخمی) ہو کر وہ فی الفور اُدھر کو جدھر سے آواز آئی تھی۔ متوجہ ہوا ٹھیک اُسی وقت پطرس بھی لوٹ کر دیکھنے لگا۔ اُن کی آنکھیں مل گئیں۔ اور رُوح نے رُوح کو دیکھ لیا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یسوع کی اس نظر میں کیا تھا۔ ایک نگاہ میں ایک عالم کی سمائی ہے۔ اور بعض اوقات تو جس قدر صفائی سے نگاہ ایک بات کو ادا کرتی ہے۔ وہ بے شمار الفاظ سے بھی ناممکن ہوتی ہے۔ وہ ایسی ایسی باتیں سوجھا دیتی ہے۔ جو شاید لبوں سے کبھی نہ نکل سکتیں۔ رُوح رُوح کے ساتھ آنکھوں ہی کے ذریعہ سے بات کرتی ہے۔ ایک نگاہ میں یہ طاقت ہے کہ چاہے تو بہشت کا چین بخش دے چاہے مایوسی کے جہنم میں ڈال دے۔

یسوع کی نگاہ نے اُس وقت ایک افسون (جادو) کا کام دیا۔ جس نے اُس جادو کی زنجیر کو جس میں پطرس جکڑا ہوا تھا۔ پاش پاش کردیا۔ گناہ کو ہمیشہ ایک عارضی دیوانگی سمجھنا چاہیے۔ اور موجودہ صورت میں تو یہ امر صاف ظاہر ہے۔ پطرس خوف غضب اور برآشفتگی سے ایسا وحشی اور دیوانہ ہو رہا تھا۔ کہ اُسے سُدبُد نہ تھی۔ کہ کیا کررہا ہوں۔ لیکن یسوع کی نگاہ نے اُس کے حواس بجا کردیئے۔ اور وہ فی الفور آدمی بن گیا۔ وہ فی الفور سرپر پاؤں رکھ کر دروازہ کی طرف بھاگا۔ اور اب کوئی چیز اُس کی سدراہ نہ ہوئی۔ وہ بغیر کسی پس و پیش۔ کے دربان عورت اور اُس کے ہمراہیوں کے پاس سے گذر گیا۔ کیونکہ اگر سچ پوچھو تو آزمائش کا دام درحقیقت ایک خیالی چیز ہے۔ ایک مستقل مزاج آدمی کے لئے وہ کوئی روک پیدا نہیں کرسکتی۔

مگر اس کے علاوہ یسوع کی نگاہ بطور آئینہ کے تھی۔ جس میں پطرس نے اپنے آپ کو دیکھ لیا۔ اُس نے دیکھ لیا کہ یسوع کے دل میں اُس کی نسبت کیا خیال ہے۔ گذشتہ زمانہ کی باتیں اُسے فی الفور یاد آگئیں۔ وہی تھا۔ جس نے ایک عظیم الشان ناقابلِ فراموش موقع پر مسیح کا اقرار کیا تھا۔ اور اُس سے شاباش لی تھی۔ وہی تھا جس نے بھی چند ہی گھڑیاں گذریں۔ سب سے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا تھا۔ کہ وہ اپنے اُستاد کا کبھی انکار نہ کرے گا۔ اور اب اُس نے اُسے ترک کردیا۔ نہیں بلکہ اُس کے دل کو ایسی بُری بنی کے موقع پر زخمی کردیا۔ اُس نے اپنے کو اُس کے دشمنوں کے گروہ میں شامل کردیا۔ اور قسموں اور لعنتوں کے ساتھ اُس کے مقدس نام کو پامال کیا۔ وہ شاگردی کے رُتبہ کو چھوڑ کر پھر ایک دفعہ اپنی بیدین جوانی کی حالت کو عود (لوٹ) کر گیا۔

وہ اب عہد شکن اور نمک حرام آدمی تھا۔ یہ سب باتیں اُسے مسیح کی اُس ایک نگاہ میں نظر آگئیں۔ مگر اُس نگاہ میں اس سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔ وہ بچانے والی نظر تھی۔ اگر کوئی شخص اُس وقت پطرس کو ملتا۔ جب کہ وہ اُس مقام سے بھاگا ہوا جارہا تھا۔ تو وہ ضرور اُس کی سلامتی کے لئے خوفزدہ ہو جاتا۔

---

[1] ۔ یہاں پطرس کی بیداری کا جو حال درج ہے۔ اُس کے لئے ہم مقدس لوقا کے ممنون ہیں۔ مگر وہ بھی مرغ کے بانگ دینے کا ذکر کرتا ہے۔ جو دوسرے انجیل نویسوں کے نزدیک اُس کے ازسر متنبہ ہونے کا باعث تھا۔ اس امر پر یقین کرنے میں کچھ مشکل نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی دلی تبدیلی کے واقع ہونے میں وہ مختلف باتوں نے مدد دی ہو۔

بھلا وہ کہاں بھاگا ہوا جارہا ہے ؟ کیا اُس کرٹاڑے کی طرف جہاں سے چند گھنٹہ بعد یہوداہ نے اپنے کو گرا کر ہلاک کر دیا؟ پطرس بھی اس سے بہت دُور نہ تھا۔ اگر اُس وقت جب کہ اُن کی آنکھیں دوچار ہوئیں۔ یسوع کی نگاہ غضب آلود نظر آتی۔ تو غالباً اُس کا بھی یہی حشر ہوتا۔

مگر یسوع کی نظر میں غصہ کا نام نشان نہ تھا۔ بلاشبہ وہ دردناک تو تھی۔ اور اُس سے بہت کچھ مایوسی ظاہر ہوتی تھی۔ مگر ان سے بھی گہری۔ ہاں اُن کے نیچے سے نکل کر اور اُن پر غلبہ پاتی ہوئی۔ اُس کی جان بخش خواہش تھی۔ وہی خواہش جس نے ایک وقت ہاتھ بڑھا کر پطرس کو پکڑ لیا تھا۔ جب کہ وہ سمندر میں ڈوبا جارہا تھا۔ اسی خواہش کے ساتھ اُس نے اُس وقت بھی اُسے پکڑ لیا۔

اس نگاہ میں پطرس نے معافی اور ناقابل بیان محبت دیکھی۔ اگر اُس نے اس میں اپنے کو دیکھا تو اُس سے بھی بڑھ کر اُس نے اپنے منجی کو بھی دیکھ لیا اور اُس پر یسوع کے دل کا وہ گہرا بھید کھل گیا۔ جو شاید پہلے کبھی اُسے معلوم نہ ہوا تھا۔ اب اُس نے دیکھ لیا کہ میں نے کیسے آقا کا انکار کیا ہے۔ اور اس سے اُس کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ یہی بات ہے جو ہمیشہ دل کو توڑ دیا کرتی ہے۔ یہ ہمارا گناہ نہیں جو ہمیں رُلا دیا کرتا ہے۔ بلکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم نے کیسے اچھے منجی کے خلاف گناہ کیا ہے۔ تو ہم اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ نہ اس لئے کہ اپنے گناہ کو دھو ڈالے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ پہلے ہی دھو یا گیا ہے۔ اوّل الذکر ایسی ہے۔ جیسے بڑے بڑے قطرے والی بارش۔ مگر دوسری قسم کی بارش ہے جیسے جھڑی لگ جاتی ہے۔ اور ہر ایک قطرہ اندر گھسا چلا جاتا ہے۔ اور رُوح کے پودوں کو اُن کی جڑوں تک سیراب کر دیتی ہے۔

درحقیقت یہی اُس نیکی کا آغاز تھا۔ جو پطرس کے ذریعہ دُنیا کو پہنچنی تھی۔ لیکن ہم اُس کا یہاں ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیں اس وقت اپنے دل میں اُس شخص کے خیال کو جگہ دینی چاہیے ۔ جس نے اپنے دُکھ اور تکلیف کی سختی میں بھی جب یہ دیکھا کہ اُس کے نام سے نہ صرف انکار ہی کیا جاتا ہے۔ بلکہ اُس پر قسموں اور لعنتوں کی بوچھاڑ بھی پڑ رہی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کینہ یا انتقام کے خیال کو۔ جو اس قسم کی نمک حرامی سے پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اپنے دل میں جگہ نہ دی بلکہ برخلاف اس کے اپنے رنج و غم کو بھی بھول گیا۔ اور نجات بخشنے کی خواہش رغبت سے بھر کر اپنی نگاہ کو ایسی مہربانی اور محبت سے معمور کر کے اُس کی طرف پھینکا کہ ایک لمحہ میں اُس افتادہ (مصیبت میں گرفتار) شاگرد کو گڑھے سے نکال لیا۔ اور اُٹھ کر ایک چٹان پر کھڑا کر دیا۔ جہاں وہ بعد ازآں ہمیشہ کھڑا رہا۔ بلکہ اپنے ایمان کی مضبوطی اور اپنی شہادت کی طاقت کے لحاظ سے خود ایک چٹان بن گیا۔

چوتھا باب

ملکی عدالت

دُوسرے باب میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ صدرِ مجلس نے یسوع پر موت کا فتویٰ دے دیا۔ وہ بڑی خوشی سے یہودی قاعدہ کے مطابق یعنی سنگسار کرنے سے اس فتویٰ پر عمل درآمد کرتے۔ لیکن جیسا اوپر ذکر ہو چکا۔ یہ امر اُن کے اختیار میں نہ تھا۔ رومی حکومت نے اگرچہ دیسی عدالتوں کو یہ اختیار دے رکھا تھا۔ کہ خفیف (معمولی) جرائم کی تحقیقات کریں اور سزا دیں۔ مگر زندگی موت کے اختیار کو اُس نے اپنے قبضہ میں رکھا تھا۔ اور ایسا مقدمہ جس میں سنگین سزا کا فتویٰ یہودی عدالت میں دیا جاتا۔ ملک کے رومی حاکم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ جو از سر نو تحقیقات کرنے کے بعد اُس فتویٰ کو بحال یا رد کر دیتا تھا۔ اس لئے یسوع پر فتویٰ دینے کے بعد صدر مجلس کے ممبران کے لئے ضرور ہوا کہ اُسے گورنر کی عدالت میں لے جائیں۔

ا۔

اُس وقت رومی حاکم جو فلسطین پر متعین (مقرر) تھا۔ اس کا نام پنطیس پیلاطس تھا۔ عہدے کے لحاظ سے اُسے ہندوستان کے ایک کمشنر یا لفٹیننٹ گورنر کے برابر سمجھنا چاہیے۔ صرف اس قدر فرق کے ساتھ کہ وہ ایک بُت پرست حکومت ہے۔ اور اس لئے قدیم روما کی۔ نہ زمانہ حال کی انگلستان کی روح۔ اُس کے اصول حکومت کی محرک (تحریک دینے والی) تھی۔ اور اس رُوح کا جسے دُنیا پرستی حکمت عملی۔ ابن الوقتی کی رُوح کہنا چاہیے ۔ وہ ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اور ہم دیکھیں گے کہ وہ اس عظیم الشان روز میں اپنے اس اصول کا کیسا پکا پابند نکلا۔

پیلاطس اس عہدہ پر بہت سالوں سے متعین تھا۔ مگر نہ تو وہ اپنی رعایا کو پسند کرتا تھا۔ نہ اُس کی رعایا اُسے پسند کرتی تھی۔ یہودی اہلِ روم کی تمام محروسہ (ماتحت) ریاستوں میں سب سے زیادہ سخت مزاج اور شورہ پشت (سرکش۔ نافرمان) تھے۔ وہ اپنے قدیم زمانہ کے شان و شوکت کو یاد کر کے۔ اور آئندہ زمانہ میں ایک عالمگیر سلطنت کی اُمید پر اس بیرونی حکومت کے جوئے کو بہت ہی گراں (سخت) سمجھتے تھے۔ اور انہیں ہمیشہ اپنے حاکموں کے رویہ میں ایسی ایسی باتیں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ جنہیں وہ اپنے اقتدار کے خلاف یا اپنے مذہب کی بے حرمتی سمجھتے تھے۔ وہ بھاری ٹیکسوں کی شکایت کیا کرتے تھے۔ اور اپنے حاکموں کو عرضیاں دے کر ہمیشہ دق کرتے رہتے تھے۔ پیلاطس کی ان کے مقابلہ میں بالکل عہدہ برائی نہ ہوئی۔ اور نہ اُن کے درمیان باہم کسی قسم کی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ ان کے مذہبی جوش و سرگرمی سے متنفر (نفرت کرنا) تھا۔ اور جب کبھی اُن کے ساتھ کوئی تنازعہ پیش آتا۔ اور ایسے تنازعے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ تو وہ بلا تکلف خونریزی پر کاربند ہوا کرتا تھا۔ اور برخلاف اس کے وہ اُسے رشوت ستانی۔ بے رحمی۔ لوٹ مار اور بدعملی کا ملزم ٹھہراتے تھے۔

گورنر کا مقامِ رہائش یروشلیم نہ تھا۔ بھلا ایسا شخص جو روما کے عیش و عشرت اُس کے تھیڑوں۔ حماموں۔ کھیل تماشوں۔ لڑیچر اور سوسائٹی کا گرویدہ (عاشق) ہو۔ ایسی جگہ رہنے کا کب خواہاں ہو سکتا تھا۔ اُس کا صدر مقام قیصریہ تھا۔ جو ساحل بحر پر واقع تھا۔ یہ شہر اپنی شان و شوکت اور سامان عیش و عشرت کے لحاظ سے عین بعین ایک رومایئے نورد کی مانند تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً کاروبار کے لئے گورنر کو صدر مقام (یروشلیم) میں جانا پڑتا تھا۔ اور عموماً جیسا کہ اس وقت بھی وہ عیدِ فسح کے موقع پر وہاں ضرور جاتا تھا۔

یروشلیم میں وہ ہمیشہ اُس شاہی محل میں جو یہودیہ کے قدیم بادشاہوں کی جائے رہائش تھا۔ فروکش (ٹھہرنا) ہوا کرتا تھا۔ اسے ہیرودیس اعظم نے تعمیر کیا تھا۔ جسے شاہجہان کی طرح بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا ازحد شوق تھا۔ یہ محل اُسی پہاڑی کے جنوب مغربی گوشہ پر جس پر ہیکل واقع تھی۔ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑا عالی شان محل تھا۔ اور اپنی خوبصورتی میں ہیکل کا ہم پلہ تھا۔ اور اس قدر عظیم تھا کہ اس میں ایک چھوٹی سی فوج کی رہائش کی گنجائش تھی۔ اُس کے دو بڑے بڑے بازو تھے۔ جو عمارت کے دونوں طرف کو نکلے ہوئے تھے۔ اور بیچ میں ایک اور عمارت تھی۔ جس سے یہ دونوں طرف کو نکلے ہوئے تھے۔ جس سے یہ دونوں باہم ملحق (جوڑنا) کئے گئے تھے۔ اس درمیانی عمارت کے مقابل ایک بڑا میدان تھا۔ اور یہاں کھلی جگہ میں ایک بلند چبوترہ تھا۔ جہاں مسیح کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہودی اس عمارت کے اندر داخل ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اُن کے نزدیک ناپاک تھی۔ پیلاطس کو اُن کے اس مذہبی وسواس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دل میں اُن پر ہنستا رہتا تھا۔ لیکن علاوہ اس کے رومیوں کے لئے کھلی جگہ میں عدالت کرنا بھی ایک معمولی بات تھی۔ محل کے سامنے کے حصّہ میں بڑے بڑے ستون لگے تھے۔ اور اُس کے گردا گرد ایک وسیع پارک (سیر گاہ) تھا۔ جو روشوں۔ درختوں اور تالابوں سے آراستہ تھا۔ اور جس میں فوارے ہر وقت چھوٹتے رہتے تھے۔ اور خوبصورت جانور اپنی راگنیاں گاتے رہتے تھے۔ غرضیکہ ہر طرح سے یہ نہایت دلکش اور پُر فضا مقام تھا۔

الغرض علی الصباح (صبح سویرے) یہودیوں کے سردار قیدی کو درمیان میں لئے ہوئے اس محل کے عظیم الشان پھاٹک کے اندر داخل ہوئے۔ پیلاطس بھی اُن کی ملاقات کے لئے باہر نکل آیا اور اپنی عدالت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے سیکرٹری اُس کے آس پاس تھے۔ اور اُس کی پس پشت قوی ہیکل رومی سپاہیوں کی ایک جماعت بھالے لئے ہوئے سرِ قد حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ ملزم کو چبوترے کے اوُپر کھڑا کیا گیا۔ اور اس کے مقابل قائفا کی سرکردگی میں اُس کے الزام لگانے والوں کی جماعت کھڑی تھی۔ کیسا عجیب نظارہ! یہودی قوم کے سردار اپنے ہی مسیح کو زنجیروں میں جکڑ کر ایک بُت پرست حاکم کے حوالہ کرنے کو لائے ہیں۔ اور اُس سے یہ التجا کرتے ہیں۔ کہ اُسے قتل کیا جائے۔ اے بہادر ربیوں کے روحو! تم جو اس قوم سے دلی محبت رکھتے تھے۔ اور اُس پر فخر کرتے۔ اور اُس کی آئندہ شان و شوکت اور عظمت و جلال کی پیشن گوئی کیا کرتے تھے۔ آخر کار وہ گھڑی آپہنچی ہے۔ مگر اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔

یہ فعل ایسا تھا کہ گویا قوم نے اُس کے ذریعہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ مگر کیا اس سے بھی بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ کیا خُدا کی تدبیر و عہد بھی اس سے شکستہ و پراگندہ نہیں ہو گئے؟ یقیناً ظاہراً تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر خُدا ٹھٹھوں میں نہیں اُڑایا جاتا۔ انسان کے گناہوں کے باوجود بلکہ اُن کے ذریعہ بھی اس کا مقصد و منشا تکمیل کو پہنچتا رہتا ہے۔ یہودیوں نے ابن اللہ کو پیلاطس کی کرسی کے سامنے پیش کیا تاکہ یہودی اور غیر قوم دونوں مل کر اُس پر سزا کا حکم لگائیں۔ کیونکہ یہ نجات دہندہ کے کام کا ایک جز تھا۔ کہ وہ انسانی گناہ کا پردہ پھاڑنے۔ اور یہاں شرارت ہی تمام و کمال بدی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ جب کہ بنی انسان کا ہاتھ اپنے خالق کے خلاف اُٹھا ہوا تھا۔ اور تاہم وہ موت بنی انسان کی زندگی کا باعث ہونے کو تھی۔ اور یسوع یہودی اور غیر قوم کے درمیان کھڑا ہوا اور دونوں کو ایک مشترکہ نجات کی رفاقت کے بندوں میں جوڑنے کو تھا۔ واہ خُدا کی دولت اور حکمت اور علم کیا ہی وسیع ہے اُس کی تجویزیں کس قدر ادراک (سمجھ) سے پرے اور اُس کی راہیں کیا ہی بے نشان ہیں۔

۲۔

پیلاطس نے الفور دریافت کیا کہ وہ کونسا الزام ہے جس کے لئے تم قیدی کو میرے سامنے لائے ہو۔

جو جواب انہوں نے دیا۔اس سے اُن کی طبیعت ومزاج کااظہار ہوتا ہے۔اگر یہ بدکار نہ ہوتا تو ہم اُسے تیرے حوالہ نہ کرتے۔یہ گورنر کے لئے ایک صاف صاف اشارہ تھا کہ اُسے چاہیے کہ اپنے از سرِ نو تحقیقات کرنے کے استحقاق (جانچ پڑتال) کو چھوڑ کر انہیں کی تحقیقات کو کافی سمجھے۔اور فقط اپنے استحقاق کے دوسرے حصّہ کو یعنی سزائے موت کے جاری کرنے کو ہی کام میں لائے۔ بعض اوقات صوبوں کے حاکم ایسا کر دیا کرتے تھے۔خواہ تو اپنی سُستی و کاہلی کی وجہ سے یا ویسے حکام کو خوش کرنے کے لئے اور خاص کر ایک مذہبی مقدمہ میں جس کی ماہیت کو سمجھنے کی ایک اجنبی حاکم سے ہر گز اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔اس قسم کے لحاظ کی اُمید کرنا کوئی نامناسب درخواست نہ تھی۔

مگر پیلاطس اس وقت دبنے یا ماننے والی لہر میں نہ تھا۔اور بولا۔تو اسے لے جا کر تم اپنی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ کرو۔جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ اگر میں مقدمہ کو نہیں سن سکتا۔تو میں اُس پر فتویٰ بھی نہیں دیتا اور نہ سزا کو جاری کروں گا۔اگر تم اس پر اصرار کرتے ہو۔کہ یہ مقدمہ صرف تمہاری ہی دینی عدالت کے سننے کے لائق ہے۔تو اپنے پاس ہی رکھو۔اور اگر تم رکھو گے تو تمہیں اُسے ایسی ہی سزا دینی ہو گی۔جس کے تم مجاز ہو۔

لیکن یہ بات اُن کے لئے زہر تھی۔وہ تو مسیح کے خون کے پیاسے تھے۔اور وہ خوب جانتے تھے۔کہ انہیں قید یا کوڑے لگانے سے بڑھ کر کوئی اختیار نہیں۔وہ سرد مہر اور تیز نظر رومی جو انہیں کی طرح مغرور و متکبر تھا انہیں جتاتا چاہتا تھا۔کہ روم کا پاؤں اُن کی گردن پر کتنا بھاری ہے۔اور انہیں کے منہ سے یہ بات کہلوانے میں اُسے ایک قسم کا مزا آتا تھا کہ ہم مجاز نہیں کہ کسی کو جان سے ماریں۔اپنی مرضی اور اُمید کے خلاف ایک باقاعدہ الزام پیش کرنے پر مجبور ہو کر انہوں نے بڑے غصے میں آکر الزام لگانے شروع کئے۔جن میں سے آخر کار تین الزام زیادہ صفائی کے ساتھ نظر آنے لگے۔اوّل ۔وہ قوم کو بگاڑ رہا ہے۔دوم۔وہ سرکاری خراج ادا کرنے سے منع کرتا ہے۔سوم۔وہ اپنے کو بادشاہ ظاہر کرتا ہے۔

یہ بات غور کے قابل ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اُس جرم کا ذکر نہیں کیا۔جس کی بنا پر انہوں نے اُس پر خود موت کا فتویٰ لگایا تھا۔انہوں نے ان تینوں باتوں میں سے کسی کے لئے بھی اُس پر فتویٰ نہیں لگایا۔بلکہ صرف کفر بکنے کے لئے۔مگر وہ خوب جانتے تھے۔کہ اگر وہ اس مقام پر اس قسم کے الزام کا ذکر کریں گے۔تو اغلب (یقینی) ہے کہ عدالت اُس کو حقیر سمجھ کر رد کردے گی۔یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پولوس رسول پر بھی رومی گورنر نے اس قسم کے الزام پیش ہونے پر کیا کہا تھا۔گلیو نے یہودیوں سے کہا۔اے یہودیو! اگر کچھ ظلم یا بڑی شرارت کی بات ہوتی۔تو واجب تھا کہ میں صبر کرکے تمہاری سنتا لیکن جب یہ ایسے سوال ہیں جو لفظوں اور ناموں اور تمہاری شریعت سے علاقہ (تعلق) رکھتے ہیں۔تو تم ہی جانو۔میں ایسی باتوں کا منصف بننا نہیں چاہتا۔اور اُس نے انہیں عدالت سے نکلوا دیا۔(اعمال ۱۸: ۱۴۔۱۶)اور اگرچہ پیلاطس ایسی بات کے لئے جسے وہ یہودیوں کا توہم باطل سمجھتا تھا۔ویسے ہی حقارت اور نفرت ظاہر نہ کرتا تو بھی وہ خوب جانتے تھے۔کہ دل سے ایسا ہی سمجھتا ہے۔مگر حقیقی الزام کو پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے کو ایسی نازک اور غیر واقعی حالت میں رکھ دیا۔جس کے خطرات سے وہ بچ نہ سکے۔اُن کو خواہ مخواہ جرم گھڑنے پڑنے۔اور اس بات میں انہوں نے اپنی ضمیر و ایمان کی کچھ پروا نہ کی۔

اُن کا پہلا الزام کہ یسوع قوم کو بگاڑ رہا ہے۔بالکل مبہم (غیر واضح) اور بودا (کمزور) تھا۔مگر ہم دوسرے الزام کے حق میں کیا کہیں کہ وہ سرکاری محصول ادا کرنے سے منع کرتا ہے؟ جب ہم اس کے جواب کو جو اُس نے اُسی ہفتہ میں اُن کے سوال پر دیا تھا۔کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خُدا کا ہے خُدا کو دو۔تو یہ الزام ایک سفید جھوٹ معلوم دیتا ہے۔مگر ان کے تیسرے الزام میں کہ وہ اپنے کو مسیح بادشاہ ظاہر کرتا ہے۔کچھ سچائی کی آمیزش ضرور تھی۔کیونکہ اُس نے اُن کی عدالت کے سامنے سنجیدگی سے اپنے مسیح ہونے کا اقرار کیا تھا۔مگر اس صورت میں بھی وہ خوب جانتے تھے۔کہ ایک

رومی کے کان میں مسیح کا یہ دعویٰ کہ وہ ایک بادشاہ ہے مختلف معنی رکھتا ہے۔ بہ نسبت اُن معنوں کے جو مسیح ہونے کا دعویٰ اُن کے نزدیک رکھتا ہے۔ درحقیقت جو اعتراض اُن کو مسیح کے حق میں تھا۔اُس کی تہ میں یہ بات تھی۔ کہ وہ انہیں رومی معنوں کے مطابق بادشاہ بننے کے لئے کافی طور پر تیار نہیں ہے۔وہ بڑے اشتیاق سے ایک بادشاہ کے منتظر تھے۔جو بڑا شاندار اور جنگی آدمی ہوگا۔تاکہ وہ رومیوں کا جُوا توڑ کر یروشلیم کو ایک عالمگیر سلطنت کا دارالسلطنت بنائے۔ اور چونکہ یسوع کی روح اور مقاصد ایسی حرص وہوا کے مخالف تھے۔اس لئے وہ اُسے حقیر جانتے اور اُس سے نفرت کرتے تھے۔ پیلاطس اُن لوگوں کے مزاج وخو(طور طریقہ) سے خوب واقف تھا۔جو سرگرمی وہ اُس وقت قیصر کے متعلق دکھا رہے تھے۔اُسے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنستا ہوگا۔ایک انجیل نویس لکھتا ہے کہ وہ جانتا تھا کہ حسد کے باعث انہوں نے اُس کے حوالہ کیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت وہ یسوع کے حالات سے کہاں تک واقف تھا وہ اس تحریک کے سارے زمانہ میں جو یوحنا بپتسمہ دینے والے نے شروع کی اور یسوع نے جاری رکھی برابر گورنر رہا تھا۔ اور ممکن نہیں کہ وہ ان باتوں سے بالکل جاہل وناواقف رہا ہو۔اُس کی بیوی کا خواب جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔اس بات کو ثابت کرتا ہوا معلوم دیتا ہے۔کہ اس سے پہلے بھی محل میں یسوع کا ذکر ہوتا رہا ہوگا۔اور غالباً اُس یروشلیم کی رہائش کی بے مزگی کو رفع کرنے کے لئے مشغلہ کے طور پر گورنر اور اُس کی بیوی۔اس نوجوان جو شیلے آدمی کی جوان کٹ مُلا کاہنوں کی خبر لے رہا تھا۔کہانیاں سنا کرتے ہوں گے۔پیلاطس اس ساری تحقیقات کے اثناء میں یسوع کا برابر لحاظ اور ادب کرتا رہا۔ بلاشبہ اس کی وجہ زیادہ تر دہ رویہ ہوگا۔جو مسیح نے اُس کی عدالت میں برتا۔ لیکن اُس کا کچھ حصّہ اُن باتوں کی وجہ سے بھی ہوگا۔جو وہ اُس کی نسبت سنتا رہا تھا۔ خیر خواہ کچھ ہی ہو۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو الزام اُس کے سامنے یسوع پر لگایا گیا تھا۔اُس نے اُسے بالکل خفیف (معمولی) سمجھا پہلے دوالزاموں کو تو معلوم ہوتا ہے وہ خیال میں بھی نہ لایا۔ مگر تیسرا الزام کہ وہ اپنے کو بادشاہ ظاہر کرتا ہے۔اور شاید قیصر کا ایک اور رقیب (حریف) کھڑا ہو جائے۔ایسا نہ تھا کہ وہ اُس سے قطع نظر (نظر چُرانا) کرتا۔

پیلاطس یہ الزام سن کر یسوع کو الگ محل کے اندر لے گیا۔تاکہ اُس کی جستجو کرے غالباً یہ اُس نے اس لئے کیا کہ اس طور سے اُس کے الزام لگانے والوں کے سخت اصرار سے پیچھا چھڑائے۔اور یسوع نے ان کی طرح محل کے اندر جانے میں بھی کچھ پس وپیش نہ کیا۔ کیا ہم اس سے یہ مطلب سمجھیں کہ چونکہ یہودیوں نے اُسے رد کر دیا تھا۔اس لئے وہ غیر قوموں کی طرف متوجہ ہونے لگا تھا۔اور تفرقہ کی دیوار گر پڑی تھی اور وہ اب اُس کے کھنڈرات کو پامال کر رہا تھا۔

اب اس اندرونی کمرے کی خاموشی وتنہائی میں پیلاطس اور یسوع ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ایک تو قیدی کی ادنیٰ حیثیت میں۔ دوسرا صاحب اختیار حاکم کی حیثیت میں۔ لیکن جب ہم پیچھے کو نظر مارتے ہیں تو کیسے عجیب طور سے دونوں کا مقام بدلہ ہوا نظر آتا ہے۔یہ پیلاطس ہے جو عدالت کے سامنے ہے ہاں پیلاطس اور روما جس کا وہ قائم مقام تھا۔اُس صبح تو پیلاطس پر برابر حکم لگایا جارہا تھا۔اور اُس کے عیب آشکارا ہو رہے تھے۔ اور اُس وقت سے وہ برابر تاریخ کے چبوترہ پر بطور ایک مجرم کے کھڑا رہا ہے۔اور ہر صدی کے لوگ اُس پر نظر مارتے رہے ہیں۔ پُرانے عالی دماغ مصوروں کی جو تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔انہوں نے مسیح کے بچپن کی تصویروں میں اُس کے چہرہ کے گرداگرد روشنی کا ایک ہالہ بنایا ہے۔ جس سے اُس کے اردگرد کی چیزوں پر چندھیا دینے والی روشنی پڑتی ہے اور یہ سچ ہے کہ سب پر جو اُس وقت جب وہ دُنیا میں تھا مسیح کے قریب آتے تھے۔ایک قسم کی روشنی پڑتی تھی۔ جس میں اچھے بُرے دونوں آشکارا ہو جاتے تھے۔یہ ایسی روشنی تھی جس سے ہر ایک تنگ وتاریک گوشہ اور ہر ایک چین وشکن روشن ہو جاتا تھا۔آدمی جونہی اُس کے پاس آتے تھے۔اُن پر حکم لگ جاتا تھا۔اور کیا اب بھی ایسا ہی نہیں ہے ہم ایسے کامل طور پر اپنے اندرونی حالات کو ظاہر نہیں

کر دیتے۔ جیسے اُس وقت جب کہ ہم اُس کے قریب آتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ کہ ہم پر مسیح کا کیسا اثر پڑتا ہے۔اور ہم اُسے کس طرح قبول کرتے ہیں ۔اور جیسا ہم اُس سے سلوک کرتے ہیں اُس سے گویا ہم اپنے پر فتویٰ لگاتے اور ابدیت کے لئے اپنے حق میں حکم چڑھاتے ہیں۔

پیلاطس نے اُس سے دریافت کیا۔ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے ؟ جو تیسرا الزام تھا جو اس کے خلاف لگایا گیا تھا۔ یسوع جو جواب دیا۔ اُس میں بڑی احتیاط پائی جاتی ہے۔اور اُس نے جواب دینے سے پہلے ایک دوسرا سوال پوچھا کیا تو یہ بات آپ سے کہتا ہے یا اوروں نے میرے حق میں تجھ سے کہی ؟ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس سوال کے کیا معنی ہیں۔ آیا وہ رومیوں کے محل نظر سے پوچھتا ہے۔ یا یہودیوں کے محل نظر سے۔ کیونکہ اس سوال کا جواب کہ کیا وہ بادشاہ ہے۔اُن معنوں کے لحاظ سے جو رومی لوگ اس لفظ کے سمجھتے تھے۔ بالکل مختلف ہوتا۔ بہ نسبت اُن معنوں کے لحاظ کے جو یہودی سمجھتے تھے۔

مگر اس جواب سے پیلاطس کچھ ہچکچا سا گیا۔ کیونکہ اس سے یہ پایا جاتا کہ شاید اُس کو اس امر میں زیادہ دلچسپی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ اس کا اظہار کرنا ناپسند کرتا ہے۔اور اُس نے غصہ سے جواب دیا۔ کیا میں یہودی ہوں ؟ تیری قوم اور سردار کاہنوں نے تجھ کو میرے حوالہ کیا۔ اگر اس سے اُس کے غرض چبھتی ہوئی طنز تھی۔ تو اس کا تیر عین نشانہ پر لگا۔ افسوس یہ ایک بڑی شرم ناک اور تکلیف وہ بات تھی۔ اس کی اپنی ہی قوم ہاں اُس کی محبوب قوم جس کی خدمت میں اُس نے اپنی زندگی خرچ کردی۔ اُسی نے اُسے غیر قوم کے حوالے کردیا۔ اُس نے اس اجنبی شخص کے سامنے ایسی شرمساری محسوس کی جیسے کہ کوئی شخص جسے اُس کے ماں باپ غلامی میں بیچ دیں۔ اپنے خاندان کے لئے محسوس کرتا ہے۔ تاہم یسوع نے فی الفور پیلاطوس کو اس سوال کا جواب دونوں پہلوؤں سے دے دیا۔ یعنی رومیوں کے پولٹیکل پہلو سے۔اور نیز یہودیوں کے مذہبی پہلو سے بھی۔

پہلے اُس نے اس کے منفی پہلو کو ظاہر کیا۔ میری بادشاہت دُنیا کی نہیں۔ وہ رومی شاہنشاہوں کا رقیب نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو سب سے پہلے وہ ایک فوج جمع کرتا تاکہ ملک کو رومیوں کے قبضہ سے خلاصی بخشے اور اس فوج کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا کہ اپنے بادشاہ کی ذات کی حفاظت کرتی لیکن یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ اُس کی گرفتاری کے وقت اُس کی حمائت میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔اور اُس کے ایک پیرو نے جب تلوار نکالی۔ تو اُسے پھر میان میں کرنے کا حکم دیا گیا اُس کی بادشاہت جسے وہ قائم کرنا چاہتا ہے لشکروں اور اسلاح اور دنیاوی شان وشوکت کی بادشاہت نہیں ہے۔

لیکن اس انکار کے وقت بھی یسوع نے الفاظ میری بادشاہت استعمال کئے تھے۔ جس پر پیلاطس بول اُٹھا۔ پس کیا تو بادشاہ ہے ؟ یسوع نے جواب دیا۔ ہاں میں اسی لئے پیدا ہوا۔اور اسی واسطے دُنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دُوں۔ یہی ملکِ حق وراستی اُس کی مملکت ہے۔اور یہ قیصر کی سلطنت سے بہت ہی مختلف ہے۔ قیصر کی حکومت انسانوں کے جسموں پر ہے۔ مگر اس کی ان دلوں پر مسلط (قابض) ہے۔ قیصر کی مملکت اور قوت کا مدار اُس کی فوجوں ہتھیاروں۔ قلعوں اور جہازوں پر ہے۔ مگر اس بادشاہت کی قوت اُس کے اصولوں۔ خیالوں۔اور حسّوں پر منحصر ہے۔ جو فائدہ قیصر اپنی رعایا کو پہنچا سکتا ہے۔ وہ فقط اُن کے جسم اور مال کی حفاظت ہے۔ مگر مسیح کی بادشاہت کی برکتیں ضمیر کا اطمینان اور رُوح القدس کی شادمانی ہے۔ قیصر کی سلطنت باوجود اپنی وسعت کے محدود ہے۔ مسیح کی سلطنت کی کوئی حد نہیں اور وہ آخر کار ہر ایک ملک میں قائم ہونے والی ہے۔ قیصر کی سلطنت دوسری زمینی سلطنتوں کی طرح اپنے اچھے دن دیکھ کر آخر کار بالکل نابود ہوگئی۔ مگر حق وراستی کی سلطنت ابدالآباد تک قائم رہے گی۔

بعض کا خیال ہے کہ مسیح کے اس عظیم قوم میں ایک مشرقی نہیں۔۔ بلکہ مغربی خیال کی بو آتی ہے ایک شریف دل یہودی کو سب سے بڑھ کر یہ خواہش تھی کہ وہ راستبازی کو حاصل کرے۔ مگر ایک شریف دل یونانی حق وراستی کا خواہاں تھا۔ اس زمانہ میں بھی کئی ایک ایسی روحیں تھیں بلکہ غیر یہودی اقوام میں بھی۔ جن کے سامنے اگر سچائی کی بادشاہت کا ذکر کیا جاتا تو اُن کے دل اُچھل پڑتے۔ یسوع اس بات کو تاک رہا تھا۔ کہ آیا اس آدمی کی روح میں بھی اس قسم کی پُرزور خواہش موجود ہے۔

اور جب وہ یہ الفاظ کہنے لگا کہ ۔"جو کوئی حق کا ہے وہ میری آواز سنتا ہے ۔ تو اُس کے ذرا اور بھی قریب ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اس میں بھی ایک اشارہ تھا کہ اگر وہ سچائی کا مشتاق ہے۔ تو اُسے بھی اس پر ایمان لانا چاہیے۔ یسوع نے اپنے جج کو بھی منادی کی۔ جیسے کہ پولوس قیدی نے اپنے جج فیلکس کو کانپا دیا۔ اور اُس کا جج اگرپا چلا اُٹھا کہ تو ُ تو تھوڑی ہی سی نصیحت کر کے مجھے مسیحی کر لینا چاہتا ہے ۔ ویسے ہی اُس وقت یسوع بھی ایک واعظ اور نجات دہندہ کی حیثیت میں پیلاطس کے ضمیر کو ٹٹول رہا تھا۔ جو شخص رُوحوں کے لئے بنسی ڈالتا ہے اُسے بہت قسم کی بنسیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس موقع پر یسوع نے ایک خاص قسم کی بنسی استعمال کی۔

ہمیشہ ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جنہیں عام قسم کی دعوتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اس قسم کی باریک دعوت سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ کیا سچائی تجھ پر افسون کی طرح کام کرتی ہے ؟ کیا تو حکمت کا پیاسا ہے ؟ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نظر میں وہ قیمتی چیزیں جن کی جستجو میں عوام الناس رہتے ہیں خاک کے برابر ہیں مالی دولت کے لئے دوڑ دھوپ۔ زندگی کا فخر۔ سوسائٹی کی نظروں میں عزت حاصل کرنا۔ جو لوگ ان باتوں کی تلاش میں ہیں شاید اُن پر ہنستے اور انہیں قابل رحم سمجھتے ہو۔ مگر ایک ہر دلعزیز شاعر کا سنہری صفحہ۔ ایک سچے صاحبِ خیال کا نیا مشکوک اور گرما گرم خیال ایک پُر مضمون فقط جو تمہارے خیال کو ابدیت کی حدوں تک پہنچاتا ہے۔ ایک روشن مسئلہ جو ستارے کی مانند تمہارے عقل و فہم کے اُفق (آسمان) پر طلوع ہوتا ہے یہ چیزیں تمہاری دولت ہیں۔ دُنیا کی تاریکی سے تمہارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور سینکڑوں دقیق (مشکل) مسائل تمہیں ستاتے ہیں۔ اے حکمت کے فرزند اور عاشق کیا تو شاہ راستی سے واقف ہے ؟ یہی وہ ہے جو تیری نور و روشنی کی آرزو کو پورا کر سکتا ہے۔ اور خیال اور غلطیوں کے جال سے رہائی دے سکتا ہے۔

لیکن کیا اُس کا یہ قول جو وہ یہاں فرماتا ہے سچ ہے کہ ہر ایک جو حق کا ہے۔ اُس کی آواز سنتا ہے ؟ کیا اس وقت دُنیا ایسے مرد و عورتوں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ جو سچائی کی تلاش میں ہیں۔ لیکن پھر بھی مسیح کے پاس سے گذر جاتے ہیں ہاں وہ اور بھی بڑے پُر زور الفاظ استعمال کرتا ہے کہ وہ جو حق سے پیدا ہوئے۔ کیا تم بھی درحقیقت کبھی حق کی گود میں بیٹھے ہو۔ اُس کی گردن سے لپٹے ہو۔ اُس کا دودھ پیا ہے ؟ بہت ایسے لوگ ہیں جو محض اپنے دھن و عقل سے سچائی کی تلاش کرتے ہیں مگر یہ نہیں چاہتے کہ وہ اُن کے چال چلن پر حکومت کرے۔ اور اُن کے دلوں کو پاک صاف کر دے۔ مگر صرف وہی لوگ جو اپنی ساری جان سے سچائی کی تلاش کرتے ہیں۔ اُس کے سچے فرزند کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور انہیں لوگوں کو مسیح کی آواز جب ایک دفعہ سنائی دے جاتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج نکل آیا یا موسم بہار آگیا۔

مگر افسوس پیلاطس ایسا آدمی نہ تھا۔ وہ روحانی اُمنگوں سے بے بہرہ (محروم) تھا وہ زمین سے زمینی تھا۔ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں نہ تھا۔ جو آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور نہ ہاتھ چھو سکتا ہے اُس کی سچائی کی بادشاہت اور سچائی کا بادشاہ محض خیالی الفاظ تھے۔ اُس نے پوچھا کہ حق کیا ہے ؟ مگر یہ سوال کرتے ہی وہ اپنے پاؤں پر پھرا۔ اور جواب کا انتظار نہ کیا۔ اُس کا سوال ایسا ہی تھا جیسے کوئی بدکار پوچھ بیٹھے۔ کہ نیکی کیا ہے ؟ یا کوئی ظالم کہ آزادی کیا ہے ؟

مگر اُسے کامل یقین ہو گیا کہ یسوع بے گناہ ہے اُس نے اُسے فقط ایک نیک مزاج مذہبی۔ جوشیلا آدمی خیال کیا۔ جس کے ہاتھوں سلطنت روم کو کچھ خوف نہ تھا۔ پس وہ باہر گیا۔ اور جاتے ہی اُس کی بریت کا فتویٰ دے دیا۔ میں اس میں کوئی قصور نہیں پاتا۔

پانچواں باب

یسوع اور ہیرودیس

پیلاطس نے یسوع کی تحقیقات کی اور اُسے بے گناہ پایا۔اور اُس نے صدر مجلس کے ممبروں کو بھی صاف صاف کہہ دیا۔اس طور سے اُس نے گویا اُن کے فتویٰ کو رد کردیا۔اب اُس کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے تھا؟ البتہ یہی کہ یسوع کو فی الفور رہا کردیا جائے۔اور اگر ضرورت ہو۔تو اُس کی حفاظت کی جائے۔تاکہ یہودی اُسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائیں۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ ایک اور واقعہ جو پیلاطس کی زندگی میں گزرا اور جو ایک مورخ نے بیان کیا ہے اس امر کو واضح کردے گا۔یسوع کی پیشی کے چند سال پہلے پیلاطس نے جو تھوڑا عرصہ پہلے نیا نیا یہودیہ کا گورنر مقرر ہوا تھا۔یہ ارادہ کیا۔کہ فوج کی چھاونی قیصریہ سے اُٹھا کر یروشلیم میں قائم کی جائے۔اور سپاہی اپنے جھنڈے لئے ہوئے جس پر شاہنشاہ کی تصویر بنی تھی۔مقدس شہر میں داخل ہوئے۔یہودیوں کے نزدیک یہ تصویریں بُت پرستی تھیں۔اور اُن کا یروشلیم میں داخل ہونا سخت بے ادبی اور ناپاکی کا باعث سمجھا جاتا تھا۔شہر کے لوگ جوق در جوق (غول کی صورت میں) قیصریہ کو جہاں پیلاطس مقیم تھا جانے لگے۔اور اس کی منت سماجت کی کہ اُن جھنڈوں کو نکال دے۔مگر اُس نے انکار کیا اور پانچ دن تک برابر بحث جاری رہی۔آخر کار وہ ایسا غصہ میں آیا کہ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔کہ انہیں گھیر لیں اور دھمکی دی کہ اگر وہ چُپ چاپ اپنے اپنے گھر کا راستہ نہ لیں گے۔تو قتل کئے جائیں گے۔مگر وہ اس بات سے ہرگز نہ ڈرے۔اور سب نے زمین پر گر کر اپنی گردنیں برہنہ کردیں۔اور چلائے کہ ہم جان دینے کو تیار ہیں۔مگر اپنے شہر کی بے حرمتی گوارا نہیں کرسکتے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیلاطس کو اُن کی بات مان کر اپنی فوج کو یروشلیم سے بُلا لینا پڑا۔یوسیفس ۱۸۔۳:۱۔

یہ گورنر تھا۔اور یہ لوگ تھے۔جن کے ساتھ اُسے سابقہ پڑا۔جب اُن کے دل کسی بات پر جم جاتے اور اُن کا مذہبی جوش بھڑک اُٹھتا تو وہ اُن سے کسی طرح عہدہ بُرا نہیں ہوسکتا تھا۔اس موقع پر وہ اُس سے اُسی طرح پیش آئے۔جیسا گذشتہ موقع پر پیش آئے تھے۔اُس نے یسوع کو بے گناہ ٹھہرایا۔اور اس بات پر سارے مقدمہ کا خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا۔مگر انہوں نے غضب ناک ہوکر شور و غوغا مچانا شروع کیا۔یا جیسا کہ مقدس لوقا نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی تند ہونے لگے۔اور انہوں نے قیدی کے خلاف اور بھی زور شور سے الزام لگانے شروع کئے۔

پیلاطس کو اُن کے مقابلہ کی تاب نہ تھی۔وہ اس کمزوری کی حالت میں خود یسوع کی طرف پھرا اور کہنے لگا۔کیا تو سنتا ہے۔کہ لوگ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر یسوع کچھ نہ بولا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لفظ بول کر بھی اس کارروائی کو اور طول دے۔یہاں تک کہ گورنر تعجب کرنے لگا۔وہ خود ایسا بے ٹھکانے اور حیران و ششدر ہو رہا تھا کہ وہ اُس کے اس پُر استقلال اطمینان کی حقیقت کو سمجھ نہ سکتا تھا۔اس سارے مقدمہ میں یسوع کو اپنی جان کے لالے پڑ رہے تھے۔مگر باوجود اس کے اس ساری جماعت میں وہی شخص تھا۔جو بالکل مطمئن اور پُر سکون معلوم ہوتا تھا۔

مگر دفعتاً (اچانک) اس ساری گھبراہٹ کے درمیان پیلاطس کو اپنے اس سارے اُلجھن سے بچ نکلنے کی ایک ترکیب سوجھ گئی۔وہ چلا رہے تھے۔کہ یہ سارے یہودیہ میں۔بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے۔گلیل کا نام لینے سے اُن کی غرض یہ تھی۔کہ پیلاطس کے دل میں یسوع کے خلاف بدظنی پیدا کردیں۔کیونکہ گلیل ہمیشہ بغاوت و سرکشی کا گھر سمجھا جاتا تھا۔مگر اس سے پیلاطس کے دل میں کچھ اور ہی خیال پیدا ہوگیا۔اور اُس نے بڑی فکر مندی سے پوچھا۔کیا وہ گلیلی ہے؟ دفعتاً اُس کے دل میں یہ بات آگئی کہ ہیرودیس حاکم گلیل اس وقت عیدِ فسح منانے کے

لئے یہیں شہر میں موجود ہے۔اور چونکہ رومی قانون کے ضابطہ میں داخل تھا کہ ایک قیدی کو اُسی جگہ جہاں کا وہ دراصل رہنے والا ہوتا تھا تحقیقات کے لئے بھیج دیتے تھے۔اُس کو یہ بات سوجھ گئی کہ بہتر ہوگا کہ یسوع کو اُس صوبہ کے حاکم کے پاس جہاں کا وہ باشندہ ہے۔ بھیج دیا جائے اور اس طرح سے اپنا پیچھا چھڑائے۔اُس نے فی الفور اس خیال پر عمل کیا اور اپنے سپاہیوں کی زیر نگرانی یسوع اور اُس کے مدعیوں کو مکابیوں کے قدیمی محل میں جہاں ہیرودیس فروکش (ٹھہرنا) ہوا کرتا تھا۔ بھیج دیا۔

اس طرح یسوع اس شرمناک روز گیند کی طرح ادھر اُدھر پھینکا گیا۔ حناّ سے قائفا کے پاس۔ قائفا سے پیلاطس کے پاس۔اور پیلاطس سے ہیرودیس کے پاس۔اور ابھی یہیں بس نہیں۔اور یہ آمدورفت ایسی حالت میں ہوئی۔جب کہ وہ زنجیروں سے جکڑا ہوا اور پیادوں کے زیرِ حفاظت تھا۔ اور اُس کے الزام لگانے والے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ہاں اُس کے دُکھوں کی فہرست میں ان باتوں کو ہر گز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ا۔

عہد جد کے صحیفوں میں ہیرودیس نام کے کئی ایک اشخاص کا ذکر آیا ہے۔اس لئے اس بات کو صاف کر دینا چاہیے کہ یہ اُن میں سے کون سا تھا۔ سب سے اوّل تو وہ ہیرودیس تھا جس نے بیت لحم کے بچوں کو قتل کرایا تھا۔جب کہ یسوع کو اُس کے والدین مصر میں لے گئے تھے۔اُسے ہیرودیس اعظم کہتے تھے۔ وہ تمام ملک پر حکمران تھا۔اگرچہ وہ بھی رومیوں کا مطیع تھا۔اُس کی وفات پر اُس کا ملک اُس کے بیٹوں میں تقسیم کیا گیا اور اس طرح سے رومیوں کا قبضہ ملک پر اور بھی مضبوط ہو گیا۔کیونکہ جس قدر محروسہ (ماتحت) ریاستیں چھوٹی چھوٹی ہوں۔اُسی قدر سرپرست سلطنت کا اختیار زیادہ مضبوط ہو گا۔یہودیہ ارخلاوس کو دیا گیا۔مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اُس سے لے لیا گیا۔اور اب رومی حاکم اُس پر حکمرانی کرتے تھے۔جن میں سے پیلاطس ایک تھا۔گلیل اور پیریہ ہیرودیس کے دوسرے بیٹے انتیپاس کو دیا گیا۔اور اُس کے شمال کا علاقہ فیلبوس (فلپ) کے حصے میں آیا۔یہ ہیرودیس جس کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔انتیپاس ہے۔

یہ ایک صاحبِ لیاقت آدمی تھا۔اور اپنی سلطنت کے شروع میں اُس نے ظاہر کیا کہ وہ عمدہ طور سے حکومت کرے گا۔اپنے باپ کی طرح اُسے بھی تعمیر و عمارت کا بہت شوق تھا۔اور اُسی نے شہر طبریاس میں ایک بڑا عالی شان مکان تعمیر کیا تھا جو آج کل بھی زمانہ حال کے مشن کے ساتھ تعلق رکھنے کے سبب خاص شہرت رکھتا ہے۔مگر اُس نے ایک حرکت کی۔جس نے اُس کی ساری لیاقت پر پانی پھیر دیا۔اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی فلپ کی جورو ہیرودیاس سے مل بیٹھا۔وہ اپنے خاوند کو چھوڑ کر اُس کے پاس چلی آئی۔اور اس نے بھی اپنی جورو کو گھر سے نکال دیا۔جوار یتاس شاہ عرب کی بیٹی تھی۔ ہیرودیاس اُس کے مزاج پر بڑا غلبہ رکھتی تھی۔اور وہ عمر بھر ایک چڑیل کی طرح اُس کے پیچھے لگی رہی۔اس افتاد (مصیبت) سے بھی اُس کی عالی اُمنگیں اُس کے اندر بالکل مردہ نہیں ہو گئی تھیں۔جب یوحنا بپتسمہ دینے والے نے ملک میں اپنی وعظ و نصیحت سے آگ لگانی شروع کی تو وہ بھی اُس کی وعظ کو بہت دلچسپی سے سُنا کرتا تھا۔اُس نے اُسے اپنے محل میں بلایا۔اور اُس کی بہت کچھ عزت و مدارات کی۔اُس وقت تک کہ یوحنا بول اُٹھا۔کہ تیرے لئے اس (ہیرودیاس) کا رکھنا جائز نہیں۔اسی بات کے لئے یہ عظیم الشان واعظ قید خانہ میں ڈالا گیا تھا۔لیکن پھر بھی ہیرودیس اکثر اُسے بُلا بھیجا کرتا تھا۔ظاہر اً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر اُس کے وعظ کی تاثیر ہو گئی ہے۔اور وہ یوحنا کی خصلت اور تعلیم کا مداح تھا۔اور لکھا ہے کہ یوحنا کے کہنے کے مطابق اُس نے بہت سی باتیں کیں۔مگر ایک ضروری بات تھی۔جو وہ نہ کر سکا اور نہ کی۔اُس نے ہیرودیاس کو اپنے محل سے نہ نکالا۔یہ طبعی بات تھی۔کہ وہ اس مردِ خُدا سے

ڈرتی تھی۔اوراُس سے دشمنی رکھتی تھی۔کیونکہ وہ اُسے گھر سے نکالنا چاہتا تھا۔اوراُس نے بڑی سخت کینہ وری سے اُس کے خلاف سازش شروع کی۔وہ اپنی لڑکی کے ذریعہ اس امر میں کامیاب بھی ہوگئی۔یہ لڑکی انتیپاس سے نہیں۔بلکہ اُس کے پہلے خاوند سے تھی۔بادشاہ کی سالگرہ کے جلسہ میں سلومی ہیرودیس کی مجلس میں آکر ناچی اوراپنے ہنر وفن اور حسن وخوبی سے بادشاہ کوایسا محو و گرویدہ کرلیاکہ وہ ایک جوش کی حالت میں وعدہ کر بیٹھا۔جس سے اس آدمی کی خصلت کااندازہ ہوسکتاہے۔کہ وہ جوکچھ وہ لڑکی مانگے گی۔اُسے دے گا خواہ اُس کی آدھی سلطنت ہی کیوں نہ ہو۔اور جب اس افسوں گر(جادو گر)نے جسے اُس کی ماں نے اس جہنمی فن میں خوب پکا کر چھوڑا تھا۔اُس مردِ خدا کا سر مانگا۔تواُس نے انکار نہ کیا۔

اس خوفناک گناہ سے اُس کی رعایا ہکا بکا سارہ گئی۔اور جب اُس کے تھوڑا عرصہ بعد اس کے خسر شاہ اریتاس نے اپنی لڑکی کا بدلہ لینے کے لئے اُسے شکست فاش دے کر اُس کے ملک کو تاخت وتاراج(تباہ کرنا) گیا تو عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ خُدا کی طرف سے اُس کے کئے کی سزا ملی ہے۔اس کا دل بھی اس گناہ کی پشیمانی سے آزردہ رہتا تھا۔جیسا کہ اس امر سے واضح ہوتاہے کہ جب اُس نے یسوع کی منادی کا حال سُنا توسب سے پہلے اُسے یہی خیال گزرا۔کہ یوحنا بپتسمہ دینے والا مرُدوں میں سے جی اُٹھاہے۔اب وہ دن بدن برابر بگڑتا چلا گیا۔اپنی رعایا کی نفرت معلوم کرکے وہ زیادہ زیادہ اجنبی رسم ودستور کواختیار کرنے لگا۔اُس کا دربار ہر بات میں رومیوں کی نقل کرنے کے لئے مشہور تھا۔وہ ہر طرح کی عیش وعشرت میں مشغول رہتا تھا۔گانے بجانےاور ناچنے والے اور بھانڈہ جوان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں دورا کرتے رہتے تھے۔طبریاس میں اُن کی خوب آؤ بھگت ہوتی رہتی تھی۔اُس کی خصلت وطبیعت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔اورآخر کار یہ نوبت پہنچ گئی کہ وہ بالکل موم کی ناک بن گیا۔اور کوئی بات دیر تک اُس پر اپنا اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ہر سال وہ عیدِ فسح کے موقع پر یروشلیم کوآتا تھا۔مگراس میں بھی اُس کی غرض دینی عبادت نہیں ہوتی تھی بلکہ فقط سیر وتفریح ایسے بڑے مجمع میں اور نہیں تو مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوں گی۔اور طرح طرح کی خبریں سننے میں آئے گی۔اور کون کہہ سکتاہے۔کہ وہاں کیا کیا مزیدار اور پُر لطف تماشے دیکھنے میں نہ آئیں گے۔

جس طور سے اُس نے یسوع کی آؤ بھگت کی وہ بھی ٹھیک اُس کے مزاج کا خاصہ تھا۔اگراُس کے اندر ایک شریر آدمی کا ساضمیر بھی ہوتا تواُسے ضرور بپتسمہ دینے والے کے دوست کی ملاقات کرتے شرم دامنگیر ہوتی۔ایک زمانہ میں تو وہ محض یسوع کی افواہی خبریں سن کر خوف زدہ ہوگیا تھا مگر وہ زمانہ گزر گیا تھا۔اس قسم کے جذبات کی جگہ اب اور باتیں دخل پا گئی تھیں۔اوراس لئے اوّل الذکر فراموش ہوگئی تھی۔اوراس قسم کا آدمی ہمیشہ اپنادل بہلانے کے لئے اس قسم کی تحریکیوں کی تلاش میں رہتاہے۔دوم یہ گویا رومی حکومت کی طرف سے ایک قسم کا صلح کا پیام تھا۔کیونکہ لکھاہے کہ اُس میں اور پیلاطس میں اس سے پہلے شکر رنجی(ان بن) تھی۔مگراس بات سے وہ پھر دوست ہوگئے مگراُس کی خوشی زیادہ تراس سبب سے تھی۔کہ اُسے اُمید تھی کہ یسوع اُسے کوئی کرامات دکھائے گا۔اُس کا علاقہ دوتین سال تک برابراُن کراماتوں کی شہرت سے گونجتا رہا تھا۔مگر ہیرودیس کواب تک اُس کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔اب اُسے اچھا موقع ہاتھ لگا۔اور بلاشبہ اُس کے ذہن میں بھی تھا۔کہ یسوع ضرور اُس کے اس اشتیاق کو پورا کرے گا۔بلکہ یہ کہ وہ اپنے ہنر وفن کا اُس کے روبرو اظہار کرنا اپنا فخر سمجھے گا۔

ہیرودیس کے دل میں یسوع کی نسبت اس قسم کے خیال جاگزین تھے۔اُس نے اُسے گویا معمولی گانے بجانے اور ناچنے والوں کے برابر سمجھا۔اوراُس نے اُس کے معجزوں کوایک مداری کے کھیل وتماشے کی مانند خیال کیا۔اوراُس نے اُس سے اسی قسم کی سیر وتفریح کی اُمید کی جیسے کہ وہ کسی معمولی شعبدہ باز(کرتب دکھانے والے) سے کرسکتا۔

اُس نے فی الفور اُس سے دوستانہ طور پر گفتگو شروع کی۔ اور اُس سے بہت سی باتیں دریافت کیں۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس مدعا کو جس کے لئے پیلاطس نے اُسے اُس کے پاس بھیجا تھا بالکل بھول گیا۔ اُس نے اس کے منہ سے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔ بلکہ بکتا چلا گیا۔ اُس نے مذہبی باتوں پر بہت کچھ سوچ بچار کی تھی۔ اور وہ یسوع کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ اُسے ان معاملات کے متعلق کس قدر واقفیت حاصل ہے۔ اُس کے ذہن میں بڑے بڑے گہرے سوال پیچ وتاب کھارہے تھے۔ اور بہت عقدے (مشکل بات) حل طلب تھے۔ ایک ایسا آدمی بھی جس کا کچھ دین وایمان نہ ہو۔ دینی اُمور کی بابت بہت کچھ بات چیت کر سکتا ہے۔ اور بہت سے آدمی ہیں جو بجائے دوسرے آدمیوں کی گفتگو سننے کے خواہ وہ اُن سے کتنے ہی بڑھ کر دانا کیوں نہ ہوں اپنی ہی شیریں آواز کو سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید ہی کسی شخص کی زبان ایک بے اصول اور بد چلن آدمی کے برابر تیز چلتی ہو گی۔ ہیرودیس آخر کار باتیں کرتے کرتے تھک گیا۔ اور اب یسوع کے لب کھولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر یسوع کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ برابر خاموش کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ خاموشی دوبھر معلوم دینے لگی۔ ہیرودیس بھی مارے غصہ کے لال پیلا ہونے لگا۔ مگر یسوع کے منہ سے ایک حرف نہ نکلا۔

اوّل تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ ساری کارروائی بالکل غیر متعلق تھی۔ یسوع ہیرودیس کے پاس تحقیقات کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مگر اس امر کی طرف اس نے توجہ بھی نہ کی۔ اگر یسوع کی یہ خواہش ہوتی کہ جس طرح ہوسکے۔ اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجہ سے چھڑالے۔ تو یقیناً یہ ایک نہایت عمدہ موقع تھا۔ کیونکہ اگر وہ فقط ہیرودیس کی خواہش کے موافق کرتا۔ اور اس کی تفریح کے لئے ایک معجزہ دکھادیتا۔ تو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اُسے نہ صرف فوراً رہا کردیتا بلکہ طرح طرح کے انعام واکرام سے مالا مال کردیتا۔ مگر ہم یقین نہیں کرسکتے۔ کہ اس قسم کا خیال تک بھی یسوع کے دل میں آیا ہو گا۔ اُس نے اپنی ذاتی غرض کے لئے آج تک کبھی معجزہ سے کام نہیں لیا تھا۔ اور یہ کبھی خیال میں نہیں آسکتا کہ اس وقت وہ اپنے کو ایسا ذلیل کردیتا کہ ہیرودیس کے اُس خیال کو جو اس نے اُس کی نسبت باندھ رکھا تھا۔ صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک معجزہ دکھادیتا۔ یسوع ہیرودیس کی رعایا تو تھا۔ مگر اُس کے لئے یہ ہر گز ممکن نہ تھا۔ کہ ایسے شخص کو ادب وعزت کی نگاہ سے دیکھتا۔ بھلا ایسے شخص کے لئے سوائے حقارت کے اور کیا خیال دل میں آسکتا تھا۔ جس نے یسوع کے ساتھ ایسا کینہ دار سلوک کیا اور ایسے عظیم الشان اور اہم موقع پر ایسے ہلکے پن کو کام میں لایا۔ ایک ایسے شخص کو جو ہیرودیس کی گذشتہ زندگی سے واقف تھا۔ اُس کو مذہبی اُمور پر گفتگو کرتے سننا کیسا ناگوار معلوم ہوا ہوگا۔ اس شخص میں مردمی یا صدق دلی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مذہب اس کے لئے محض ایک کھیل تھا۔

ایسے آدمی کے سامنے مسیح ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ ہیرودیس اُن اشخاص کا قائم مقام ہے۔ جن کے نزدیک زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ اور جو فقط عیش وعشرت کے لئے جیتے ہیں۔ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف مذہب میں اور اُس کی اعلیٰ اور سنجیدہ صورت میں کوئی کشش اپنے لئے نہیں پاتے۔ بلکہ وہ ہر ایک بات سے جس میں گہرے غور وفکر یا سنجیدگی یا سرگرمی کی ضرورت ہو پرہیز کرتے ہیں۔ جونہی وہ اپنے ذاتی کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں عیش وعشرت اور سیر وتفریح کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور ایک چیز جس سے وہ از حد خوف زدہ ہیں۔ سو تنہائی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ کہیں اپنے آپ سے دوچار نہ ہو جائیں۔ سوسائٹی کے بعض فرقوں میں جہاں روٹی کمانے کے لئے محنت کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ مزاج وطبیعت حکومت کررہی ہے۔ زندگی ایک کھیل ہے۔ ایک تفریح کے بعد دوسری۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور اس امر کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ کہ کوئی ایسی فراغت کی گھڑی نہ ملے۔ جس میں خواہ مخواہ سنجیدہ باتوں پر غور وفکر کرنے کی نوبت آئے۔

اس آوارگی میں مذہب کو بھی جگہ مل سکتی ہے۔ ممکن کہ لوگ گرجے کو بھی اُسی نیت و مدعا سے جائیں۔ جس سے کسی تھیٹر یا تماشہ گاہ کو جایا کرتے ہیں۔اس امید سے کہ وہاں بھی کوئی مشغلہ ہاتھ آجائے اور دل بہلانے کا کچھ سامان مل جائے۔ جس سے زندگی کی ایک گھڑی کا بوجھ سر سے اُتر جائے۔ ہمیں شرم سے اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ اس قسم کے بہتیرے گرجے اور اس قسم کے بہتیرے واعظ ہیں جو اس قسم کی ضرورتوں اور خواہشوں کے پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ فصاحت و بلاغت (خوش کلامی) کی آتش بازی اور موسیقی کی افسونگری (جادوگری) یا ربیت و رسم کی شان و شوکت سے الٰہی عبادت کو دل بہلانے کا ایک نہایت عمدہ مشغلہ بنادیا جاتا ہے۔اور جماعت جب عبادت کے بعد گھروں کو رخصت ہوتی ہے تو اُن کے دل میں قریباً ویسے ہی خیال بھرے ہوتے ہیں جیسے۔ کانسرٹ (محفل راگ) کے دیکھنے کے بعد ہوتے ہیں۔ غالباً وہ لوگ اس امر کو ایک بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ وہاں مسیح نے کلام نہیں کیا۔ وہ ایسے لوگوں کے سامنے جو مذہب کی اس روح و مزاج میں پیروی کرتے ہیں۔ ہرگز ہرگز اپنے ہونٹ نہیں کھولتا۔

بعض اوقات یہی مزاج ایک پہلو میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ وہ مذہبی باتوں پر خیال کے گھوڑے دوڑانے لگتا۔ اور اُس کے مسائل پر طرح طرح کے شک وشبہ پیدا کرنے لگتا ہے۔اور ہیرودیس کی طرح بہتیری باتیں پوچھنے لگتا ہے۔ جب کبھی میں بعض لوگوں کو مذہبی عقیدوں پر بات چیت اور بحث کرنے سنتا ہوں۔ تو اکثر مجھے یہ جواب بن آیا کرتا ہے۔ کہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مسیح پر ایمان لاسکو؟ تم نے کون سا ایسا کام کیا ہے جس سے تم اس قسم کے استحقاق کے سزاوار ٹھہرو؟ تم تو دل میں یہ سمجھ رہے ہو کہ گویا ہم ایمان لا کر مسیح پر کچھ احسان کرتے ہیں۔ درحقیقت اُس پر اور اس کے کلام پر ایمان لانے کی قدرت و قابلیت رکھنا ایک بڑا استحقاق اور عزت ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے غور وفکر۔ عجز و فروتنی اور خود انکاری کی ضرورت ہے۔

ہمیں یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک شخص کے اعتراضات کا جو وہ ہمارے دین پر کرتا ہے۔ جواب دیں۔ مذہب درحقیقت ایک ایسا مضمون ہے جس پر گفتگو کرنا ہر ایک شخص اپنا حق سمجھتا ہے۔ نہایت ناپاک خیال اور بد چلن آدمی بھی اس کی نسبت بات چیت کرتے اور قلم لے کر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ گویا کہ انہیں اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ مگر درحقیقت یہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر بہت تھوڑوں کو گفتگو کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم بہتوں کے خیالات کو پہلے ہی سے اُن کے چال چلن سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اور سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی کیا وقعت و حقیقت ہے۔

بعض شاید یہ کہیں کہ یسوع کو چاہیے تھا کہ ہیرودیس کو جواب دیتا اور ایسا نہ کرنے سے اس نے ایک ایک عمدہ موقع کھودیا۔ کیا یہ مناسب تھا وہ اس امر میں اس کے ضمیر کو شاید لاتا۔ اور جس طرح ہو سکتا۔ اسے گناہ سے متنبہ کرنے کی کوشش کرتا؟ ان لوگوں کو میرا جواب یہ ہے کہ اُس کی خاموشی ہی بجائے بولنے کے ایک بڑی صاف اپیل تھی۔ اس میں ذرہ بھر بھی ضمیر زندہ ہوتا تو وہ آنکھیں جو اس کے کو دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ الٰہی اختیار و اقتدار جو اس کا اندازہ و مقیاس تھا ضرور اس کے گناہوں کو قبر میں سے نکال کر اس کے سامنے لاتا اور اسے پریشان حال کر دیتا۔ یسوع خُداوند خاموش تھا۔ تاکہ مردہ بپتسمہ دینے آواز صفائی سے سُنائی دے۔۔۔۔

اگر ہم اس کا مطلب سمجھ سکتے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یقیناً مسیح کی خاموشی اُس وقت نہایت موثر تقریر سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔ کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب تم اُس کی آواز سُنا کرتے تھے جب کہ کتابِ مقدس اور واعظ گرجے میں تمہارے دل کے اندر تحریک پیدا کیا کرتے تھے۔ گیتوں کو سن کر تمہارے دل میں طرح طرح کی اعلیٰ اُمنگیں اُٹھتیں۔ جب سبت کا روز تمہارے نزدیک نہایت ایک مقدس دن تھا۔ جب خُدا کی رُوح اندر جدوجہد کرتی تھی۔ اور کیا یہ سب گذر گیا یا گذر رہا ہے؟ کیا وہ تم سے گفتگو نہیں کرتا؟ اگر کوئی آدمی بیمار پڑا ہو اُس کے ارد گرد کے سب لوگ اُسکی حالت دیکھ

کردن بدن چھپ جاتے ہیں۔ بیوی کلام سے پرہیز کرتی ہے۔ ملاقاتی دھیمی آواز میں ہیں۔آنے جانے والے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہیں۔اور دروازہ اس طرح بند کرتے ہیں۔کہ آہٹ نہ ہو۔تووہ جان لیتاہے۔کہ اُس کا مرض خوفناک درجہ کو پہنچ گیاہے۔جب ایک مسافر برفانی طوفان سے جنگ کرتاہواآخر کارآرام کے لئے لیٹ جاتاہے۔اور سردی اور درد اور بے قراری محسوس کرنے لگتاہے۔اور اگراُس وقت اُسے میٹھی نیند آنے لگے۔تب وقت ہے کہ اُسے جگایا جائے کہ وہ اُٹھ کر پھر چلنے اور طوفان سے لڑنے میں مشغول ہو۔ورنہ اُسے قیامت تک کبھی دوبارہ کھڑاہونانصیب نہ ہوگا۔رُوحانی زندگی میں بھی اسی قسم کی حالت طاری ہوجایاکرتی ہے۔اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ رُوح نے جدوجہد کرنا چھوڑدیاہے۔اور مسیح نے بُلانا ترک کردیاہے۔اگراس قم کی نیند تم پر غلبہ پاتی چلی آتی ہے۔توتمہیں ضرور فکر مند ہوناچاہیے۔کیونکہ اس وقت تمہاری جان معرضِ خطر میں ہے۔

۴۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہیرودیس نے کہاں تک یسوع کی خاموشی کا مطلب سمجھ لیا۔اغلب امر یہ ہے کہ اس نے سمجھنا نہ چاہا۔ بہرکیف اس کی حرکات سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں سمجھا۔اس نے اسے حماقت سمجھا۔اُس نے خیال کیا کہ یسوع کے معجزہ نہ دکھانے کی وجہ یہ ہے۔کہ وہ اس پر قادر ہی نہیں ہے۔جولوگ اس قسم کے جھوٹے دعویٰ دار ہوتے ہیں۔جب وہ پولیس کے ہاتھوں پڑجاتے ہیں۔تواُن کی ساری قدرت انہیں جواب دے جایاکرتی ہے۔اُس نے بھی یہی سمجھا۔کہ یسوع کا پول کھل گیا۔اُس کا مسیحیت کا دعویٰ باطل (جھوٹ)ثابت ہوا۔اوراب اس کے پیرو بھی اپنی غلطی سے خبردار ہوگئے ہوں گے۔

یہی اُس کا خیال تھااور ایسا ہی اُس نے ظاہر بھی کیا۔اوراُس کے تخت کے اردگرد کھڑے ہونے والوں نے بھی اُس کے اس خیال کی تائید کی۔کیونکہ مشکل سے کوئی اور مقام ہوگا۔جہاں ایک بڑے آدمی کے الفاظ کی ایسی طوطے کی طرح نقل اُتاری جاتی ہے۔جیسے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں۔اورجب ہیرودیس نے یسوع کو پیلاطس کے پاس واپس بھیجنے سے پہلے یہ حکم دیاکہ اُس کے کندھوں پرایک تلہ دار لباس ڈالا جائے۔تویقیناً انہوں نے اس کوایک ایسامذاق سمجھاہوگا۔جوبڑی تحسین وآفرین (تعریف) کے قابل ہے۔غالباًیہ اُس لباس کی نقل کے طورپر تھا۔جوروم میں کسی عہدہ کے اُمیدوار پہنا کرتے تھے۔اس سے گویایہ جتانامقصود تھا۔کہ یسوع گویا ملک کے تاج وتخت کا اُمیدوار ہے۔مگروہ ایساذلیل وقابلِ تمسخر ہے کہ اُسے حقارت کے سوا کسی اور سلوک کا سزاوار سمجھنا سخت غلطی ہوگی۔اس طرح قہقہہ کی نعروں کے درمیان یسوع اُس کے حضور سے دھکیل کرلے جایا گیا۔

چھٹا باب

پیلاطس کے پاس واپس آنا

یسوع کوہیرودیس کے پاس بھیجنے سے جوپیلاطس کا منشا(مقصد) تھاپورا نہ ہوا اس لئے قیدی پھر شاہی محل میں واپس لایا گیا۔ہیرودیس نے تو اپنی طرف سے یسوع کی بہت تحقیر وتضحیک(بے عزتی) کی مگر حقیقت میں جیسا کہ ہم اب جانتے ہیں۔وہ اس وقت خود قابلِ سزا ٹھہرا اوراُس نے اپنے ہی کورسوا کیا۔اوراب یسوع پیلاطس کے پاس واپس آیاتاکہ ظاہر کردے کہ وہ یعنی پیلاطس بھی اس قسم کا آدمی ہے۔اگرچہ اس وقت پیلاطس مطلقاًاُس امر سے بے خبر تھا کہ کیا کچھ ہونے کو ہے۔اُسے اس وقت صرف اس امر کارنج تھا کہ مقدمہ جس سے وہ اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔آخراُسی کے گلے پڑگیا۔اُسے

خواہ نخواہ اُسے کرناپڑا۔اورآخراُس نے فیصلہ کرکے ہی چھوڑا۔مگر پیشتر اس کے کہ اُس مقدمہ کا خاتمہ ہوا اُس کی اپنی خصلت ومزاج اس کی تہ کی تہ تک مسیح کی روشنی میں منکشف(ظاہر ہونا)ہوگیا۔

ہیرودیس کے مزاج میں توہاکاپن اور دُنیاپرستی سمائی ہوئی تھی۔ایسی دُنیاپرستی جو ساری زندگی کوایک کھیل اور مسخری سمجھتی ہے۔مگر پیلاطس کی دُنیاپرستی ایک اور ڈھنگ کی تھی یعنی اس قسم کی جو میں کو اپنا مقصد ومُدعا ٹھہراتی ہے اور سب کچھ اُسی کے حصول کے تابع کردیتی ہے۔ان دونوں میں سے شاید اس آخری قسم کی دُنیاپرستی زیادہ عام ہے۔اوراس لئے اُس راز کھول دینے والی روشنی میں جو مسیح سے درخشاں(روشن)ہوتی ہے۔اُس کو درجہ بدرجہ اپنی اصلی صورت کو ظاہر کرتے دیکھنا دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ا۔

پیلاطس شاید اس امر میں بالکل حق بجانب ہوتا۔اگروہ یسوع کی رہائی کواُس کے ہیرودیس کے پاس سے واپس آنے تک ملتوی کردیتا کیونکہ اگرچہ اُس نے خود اُس میں کچھ قصور نہ پایا۔توبھی یہودیوں کی شریعت اور رسوم کی ناواقفیت کے سبب وہ اُس مقدمہ میں فتویٰ لگانے میں تامل کرتااور مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک ماہر کی رائے کو معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا۔لیکن جب اُس نے یہ معلوم کرلیاکہ ہیرودیس کی رائے بھی اس کے ساتھ متفق ہے۔تواب اس امر میں زیادہ ڈھیل کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔اس لئے اُس نے یہودیوں سے صاف صاف کہہ دیاکہ اس نے خود قیدی کا امتحان کیااوراس میں کچھ قصور نہ پایا۔اُس نے اُسے ہیرودیس کے پاس بھیجااور وہاں بھی یہی بات ثابت ہوئی۔اس لئے۔۔۔۔مگر کیا؟شاید تم یہ سننے کے اُمیدوار تھے۔کہ اس لئے میں اُسے بالکل بَری کرتاہوں اوراگر ضرورت ہوتواُس کی حفاظت کروں گاتاکہ کوئی اُسے ضرر(نقصان)نہ پہنچائے۔منطق اور عدل کے لحاظ سے تواُسے یہی الفاظ کہنے مناسب تھے۔مگر پیلاطس کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ زیادہ تعجب انگیز تھے۔اس لئے میں اُسے پٹوا کر چھوڑدیتا ہوں۔یایوں کہو کہ وہ اس بات پر آمادہ(راضی)تھا۔کہ محض اُن کے غصہ کو دور کرنے کے لئے اُسے کوڑوں کی سخت سزادے گا۔اور پھر انصاف کے مطابق اُسے رہا کروں گا۔

یہ نہایت ہی بے انصافی کی بات تھی۔لیکن اس سے اس شخص کی طبیعت اور اُس انتظامِ حکومت کی جس کا وہ قائم مقام تھا۔رُوح کا حال بخوبی آشکارا(ظاہر)ہوتاہے۔سلطنتِ روما کی روح یہ تھی۔کہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع جس طرح سے کام نکلے کچھ دے دلا کر اور چھوڑ چھڑا کر بھی مطلب نکال لینا چاہیے۔جیساکہ نہ صرف دُوسری سلطنتوں میں بلکہ کلیسیاء کے انتظام میں بھی اکثر اوقات دیکھا گیاہے۔پیلاطس نے بیسیوں مقدمات اسی اصول کے مطابق فیصلہ کئے ہوں گے۔اور بیسیوں حاکم روم کی وسیع سلطنت میں اُس وقت اسی اصول کے مطابق عمل درآمد کررہے تھے۔صرف پیلاطس کے حصّہ میں یہ آیاکہ اس کمینہ اصول کوایک ایسے مقدمہ میں عمل میں لائے جہاں اُس کی یہ حالت تاریخ کی روشنی کی نگرانی میں آگئی۔

لیکن کیاہمیں یہ یقین نہیں کرناچاہیے کہ دوسرے تمام مقدمات میں خواہ مظلوم کیساہی گمنام شخص کیوں نہ ہو یہ رُوح جو پیلاطس سے ظاہر ہوئی۔خُدا کے نزدیک ویسی ہی نامقبول تھی؟ہمارے خُداوند نے جو آخری روز عدالت کی تصور کھینچی ہے۔اُس میں ایک بات ایسی ہے جس پر سب کو خُداوند کے فتویٰ پر تعجب(حیرانگی)پیداہوتاہے۔وہ جو دہنی طرف کھڑے ہیں اُن سے کہاجاتاہے کہ انہوں نے مسیح کو جب وہ بھوکا تھا کھانا کھلایا۔جب پیاساتھاپانی پلایاوغیرہ وغیرہ۔اوروہ حیرت سے سوال کرتے ہیں کہ اے خُداوند ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھااور کھانا کھلایا کب پیاسا دیکھااور پانی پلایا؟اسی طرح وہ جو بائیں طرف کھڑے ہیں اُن پر یہ الزام لگایاجاتاہے۔کہ انہوں نے مسیح کو بھوکا دیکھ کر کھانانہ کھلایا۔پیاسا دیکھ کر پانی نہ پلایاوغیرہ۔یہ بھی پوچھتے

ہیں۔ خُداوند۔ ہم نے کب تجھے بھوکا اور پیاسا دیکھا اور تیری خدمت نہ کی۔ شاید تم یہ خیال کرو کہ وہ اپنے گناہ چھپانے کے لئے جن سے وہ خوب واقف ہیں اس قسم کے کلمات کہتے ہیں ہر گز نہیں۔ وہ سچ مچ عالمِ حیرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید کہنے والے نے اُن کی نسبت غلطی کھائی ہے۔ اور اب انہیں ایسے گناہوں کے لئے سزا دی جاتی ہے۔ جو ان سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے فقط چند بچوں اور بڑھیا عورتوں کی طرف سے بے پروائی کی تھی۔ مگر یہ کس حساب میں ہیں۔ لیکن مسیح فرماتا ہے یہ سب میرے جا بجا تھے۔ اور اگر تم نے اُن کی طرف سے غفلت کی یا انہیں نقصان پہنچایا۔ تو یہ تم نے میرے ہی ساتھ کیا۔ اس طور سے ہر ایک جان آخر کار ایسی عالی پایہ اور قابلِ لحاظ ثابت ہوگی۔ کہ ہم اس وقت اُس کا تصور بھی نہیں باندھ سکتے۔ خبر دار رہو کہ تم اپنے بھائی سے کیسا سلوک کرتے ہو! ممکن ہے کہ تم اُس وقت خود خُدا کی آنکھ کی پتُلی کو چھو رہے ہو۔ خبر دار رہو کہ تم ایک بچے سے بھی کس طرح بے انصافی سے پیش آتے ہو! شاید تم آخر کار یہ دریافت کرو کہ در حقیقت تم نے خود مسیح پر حملہ کیا تھا۔

۲۔

پیلاطس نے در حقیقت اپنے اصول کو بالائے طاق (پروانہ کرنا) رکھ دیا تھا۔ جب کہ اُس نے ظاہر تو یہ کیا کہ مسیح بے گناہ ہے۔ مگر ساتھ ہی اُسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ مگر اُسے یہ خیال تھا کہ آخر کار وہ اس طریق سے اپنے اصلی مُدعا کو حاصل کرلے گا۔ مگر ہم دیکھیں گے۔ کہ وہ کس طرح اس امر میں قاصر رہا۔ اور اُس نے آخر کار بالکل منہ کی کھائی۔ جب وہ اس تحقیقات میں مشغول تھا۔ تو اُس کی طرف کئی ہاتھ بڑھے ہوئے تھے۔ بعض تو اُس کے بچانے کے لئے۔ اور بعض اُس کے خلاف۔ مگر اُس نے تو بسم اللہ ہی غلط کی تھی۔ اور اس لئے وہ آخر کار اُسی غلطی کے رُو میں بہتا ہوا چلا گیا اور ہلاک ہوا پہلا ہاتھ جو اُس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ وہ محبت اور امداد کا ہاتھ تھا وہ خود اُس کی اپنی بیوی کا ہاتھ تھا۔ اُس نے اُسے کہلا بھیجا کہ اُس نے اُس قیدی کے متعلق ایک خواب دیکھا ہے۔ اور اس لئے چاہیے کہ تو اس نیک مرد سے کچھ واسطہ نہ رکھے۔ اس امر میں بعض لوگ مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ کہ بھلا اُسے یسوع کی کس طرح خبر مل گئی۔ مگر اس میں مشکل کون سی ہے۔ غالباً جب یسوع ہیرودیس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ تو پیلاطس نے محل میں جاکر اپنی بیوی سے اس عجیب مقدمہ کا سب حال بیان کردیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جتادیا ہوگا۔ کہ اس کے دل پر یسوع کی صورت دیکھ کر کیا کیا اثرات پیدا ہوئے۔ جب وہ چلا آیا تو وہ سوگئی۔ اور اُسی کا خواب دیکھا کیونکہ اگرچہ ہمارے ترجمہ میں لکھا ہے کہ آج رات میں نے اُس کی نسبت خواب دیکھا ہے مگر لفظی ترجمہ ہے۔ "آج کے روز" اور کئی ایک سامان ایسے پیش آسکتے ہیں کہ ایک معزز خاتون دن کے وقت سوجائے۔ اُس کا خواب ایسا تھا کہ اُس سے وہ کچھ خوف زدہ سی ہوگئی۔ اور اس لئے اُس نے اپنے خاوند کو کہلا بھیجا۔

اس واقع نے مسیحیوں کی قوت واہمہ (سوچنے کی قوت) پر بہت کچھ اثر پیدا کیا ہے۔ جس سے طرح طرح کی کہانیاں بن گئیں ایک روایت کہتی ہے کہ پیلاطس کی بیوی کا نام کلاڈیا پروکلہ تھا اور کہ اُس نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ جیسا کہ اُس زمانے میں اکثر ہوا کرتا تھا کہ معزز خواتین جو عہدِ عتیق کی کتابوں سے واقف ہو جاتی تھیں تو اس مذہب کو اختیار کرلیتی تھیں۔ یونانی کلیسیاء نے تو یہ خیال کرکے وہ ضرور مسیحی ہوگئی۔ اُسے ولائت کا درجہ دے دیا ہے۔ شاعروں اور مُصوروں نے اُس کے خواب کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ ڈورے جیسے مشہور مُصور کی تصویر اب بھی لندن کے بڑے تصویر خانہ میں موجود ہے۔ اس تصور میں یہ دکھایا ہے کہ گویا یہ عورت خواب کی حالت میں ایک بالا خانہ پر کھڑی ہے اور ایک ڈھلوان وادی کی طرف جس پر بہت سے لوگ کھڑے ہیں دیکھ رہی ہے۔ یہی سالوں اور صدیوں کی وادی ہے۔ اور وہ لوگ مسیحی کلیسیاء کے آئندہ نسلیں ہیں جو بعد کو آنے والی ہیں۔ دفعتاً خود منجی اُس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اُس کے کندھے پر صلیب ہے۔ اُس کے پیچھے اور گردا گرد بارہ رسول اور مریدوں کی جماعت ہے۔ ان

کے بعد ابتدائی صدیوں کی کلیسیاء ہے۔ جن میں مشہور بزرگان دین مثل پو لیکارپ۔ طرطولین۔اتھناسس۔ گریگری۔ کرسسٹم اور اگستین کے شامل ہیں۔ان کے بعد قرونِ وسطیٰ کی کلیسیاء ہے۔ جن میں صلیبی جنگ کے بہادروں کی قدآور اور زرہ پوش صورتیں نظرآتی ہیں۔ان کے بعد زمانہ حال کی کلیسیاء مع اپنے جوانمرد فرزندوں کے ہے۔ پھر گروہوں کی گروہ میں اور جماعتوں کی جماعتیں قطاریں باندھی چلی آتی ہیں۔ جنہیں کوئی شخص گن نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اوپر سفید اور مُنور آسمان میں تہ درتہ اور دائرہ بردائرہ خُداکے فرشتوں کی جماعتیں اُن کے اُوپر اور دائیں بائیں انہیں گھیرتی ہوئی نظرآتی ہیں۔اوران سب کے درمیان وہ صلیب جو ظاہر صورت میں وہ شخص ایک مصیبت ناک حالت میں اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

خیر یہ توسب وہمی اور خیالی باتیں ہیں۔اس عورت کی اس فکر مندی میں کہ ایک بے گناہ آدمی کو کچھ گزند(نقصان)نہ پہنچے۔ ہم اُس قدیمی رومی عدل وانصاف کے آثار پاتے ہیں۔ جواُس وقت بھی بعض شریف النسب خواتین کے دل میں دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ والمینا[1] اور کورنیلیا[2] کے نام اب بھی صفحہ ٔتاریخ کو رونق دے رہے ہیں۔اور اُس کا اپنے خاوند کو گناہ کے فعل سے بچانے کی کوشش کرنا اُس کے نام کواُن شریف عورتوں کی فہرست میں داخل کرتاہے جو محافظ فرشتوں کی مانند اپنے خاوندوں کے پہلو میں جو دُنیا کے کاروبار میں غرق اور اُس کی غلاظتوں میں آلودہ ہونے کے خطرہ میں ہیں۔انہیں برابر اعلیٰ قوانین اور غیر مرئی قدرتوں کو یاد دلاتی رہتی ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خواب خُدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔اور یہ گویا بطور ہاتھ کے تھا۔جو پیلاطس کو اس ہلاکت سے جس میں وہ کرنے کو تھا۔بچانے کے لئے پھیلایا گیا تھا۔

۳۔

اُس وقت ایک اور ہاتھ بھی اُس کی طرف پھیلایا گیا تھا۔اور اُس نے اُسے فی الفور پکڑ لیا۔اس خیال سے کہ وہ اُسے بچالے گا۔ مگر اُس ہاتھ نے دفعتاً(اچانک)اُسے پاتال کی طرف دھکیل دیا۔یہ یروشلیم کے لوگوں کی بھیڑ کا ہاتھ تھا۔اس وقت تک جواشخاص یسوع کے مقدمہ کی سٹیج پر کھڑے تھے۔وہ چندایک ہی تھے۔یہودی حکام کی دلی خواہش یہ تھی۔کہ جہاں تک ہوسکے جلدی جلدی اُس مقدمہ کا تصفیہ(فیصلہ)کرلیں۔پیشتر اس کے کہ شہر کے عوام الناس کو اور عیدِ فسح کے زائروں(زیارت کرنے والوں)کو جو شہر میں آئے ہوئے تھے۔اس معاملہ کی خبر پہنچے۔اس لئے اس کی کارروائی رات بھر ہوتی رہی۔اور اس وقت بھی ابھی صبح سویرا تھا۔جب یسوع کو گلیوں میں سے ہیرودیس کے پاس لے گئے اور پھر واپس لائے۔اور اس کے ساتھ شہر کے سربرآوردہ(بزرگ۔معزز)لوگون کی بڑی جماعت بھی تھی۔اس لئے ان کو دیکھ کو یقیناً بہت سی بھیڑ جمع ہوگئی ہوگی۔ مگر اب ایک اور وجہ سے بھی بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔رومی گورنر کا یہ دستور تھا کہ عیدِ فسح کی صبح کو لوگوں کی خاطر ایک قیدی رہا کردیا جاتا تھا۔چونکہ عموماً بہت سے پولٹیکل قیدی قید خانہ میں ہوتے تھے۔جن میں ایسے باغی بھی تھے۔جنہوں نے کبھی نہ کبھی رومیوں کے جوئے کو اُتار پھینکنے کے لئے علمِ بغاوت(سرکشی کا جھنڈا)بلند کیا تھا۔اوراس سبب سے لوگوں کو بہت عزیز تھے۔اس لئے اس استحقاق کو ایک معمولی بات نہیں سمجھا جاتا تھا۔اور جب کہ یسوع کے مقدمہ کی پیشی کھلی جگہ میں ہورہی تھی۔تو شہر کے لوگ جوق درجوق(غول کی صورت میں)محل کے دروازہ کے اندر آگئے اور اس سالانہ تحفہ کے لئے چلانا شروع کیا۔

---

[1] ۔ ولمینیا روم کے مشہور جنرل کوریولانس کی ماں تھی۔جب اس کا بیٹا جلاوطن ہوا۔اور وہ مخالفوں کی بڑی فوج لے کر روم پر چڑھ آیا۔اور اُن سے سخت مطالبہ کرنے لگا۔تواُس کی ماں اور بیوی نے منت سماجت کرکے اُسے اپنی زادبوم کو غارت رکھنے سے باز رکھا۔گو اس امر کے لئے وہ اپنے ہمراہیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

[2] ۔ کورنیلیا ایک نہایت شریف اور معزز رومی لیڈی تھی۔اُس کی نسبت روائت ہے کہ جب اس کی سہیلی نے اپنے زیورات دکھا کر اس سے دریافت کیا کہ اس کے زیورات کہاں ہیں۔تواُس نے اپنے دونوں بیٹوں کو پیش کرکے کہا کہ میرے زیور یہ ہیں۔اُس کے لڑکے بڑے ہوکر بڑے نامی آدمی ہوئے۔

اس موقع پر پیلاطس کو ان کو درخواست بہت ہی دل پسند معلوم ہوئی۔ کیونکہ اُس نے خیال کیا کہ اس ذریعہ سے میں اس مشکل سے چھوٹ جاؤں گا۔ وہ اُن کے سامنے یسوع کو پیش کرے گا۔ جو اس سے چند روز پہلے لوگوں میں اس قدر ہر دل عزیز تھا کہ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے اُس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ مسیح ہونے کا دعویٰ دار ہے۔ اس لئے لوگ اور بھی خوشی سے اُس کی خلاصی کے لئے خواہش مند ہوں گے۔

یہ بات خلافِ انصاف تھی۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ یسوع کے ساتھ ایسا سلوک کر رہا تھا۔ کہ گویا وہ مجرم ہے اور اُس پر سزا کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ حالانکہ وہ خود اس سے چند منٹ پہلے اُس کے بے گناہ ہونے کا فتویٰ دے چکا تھا۔ دوسرے اس طور سے ایک بے گناہ آدمی کی جان کو ایک فرضی بات پر جس کا نتیجہ ممکن ہے کہ اُلٹ پڑے ایک عام شہری جماعت کے حوالہ کر رہا تھا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ پیلاطس نے اس امر کو اُس کے حق میں بہتر سمجھا۔ کیونکہ اُسے لوگوں کے مزاج کی نسبت یقین تھا۔ اور بہر حال اپنا پیچھا چھڑانے کا یہ ایک اچھا موقع اُس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ جسے وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔

مگر یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ لوگوں کے دل اپنے ہی ایک اور پسندیدہ شخص پر جمے ہوئے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُس شخص کا نام بھی یسوع تھا۔ مقدس متی کے بعض نسخوں میں اُس کا نام یسوع برا باس لکھا ہے۔ وہ ایک مشہور شخص تھا۔ جو شہر میں ایسی بغاوت پھیلانے کا مجرم ثابت ہو اتھا۔ جس میں بہت لوگ مارے گئے تھے۔ اور قید خانہ میں اپنے پیروؤں کی جماعت کے ساتھ محبوس (قید میں رکھنا) تھا۔ ایسے قزّاق (ڈاکو) جو نیم لٹیرے اور نیم باغی و سرکش ہوں۔ عوام الناس کے نزدیک اکثر بہت مقبول ہوتے ہیں۔ لیکن جب پیلاطس نے یسوع کا نام پیش کیا۔ تو انہوں نے کچھ تامل کیا معلوم ہوتا ہے کہ پیلاطس نے دوسرے قیدی کو بھی وہیں بلا بھیجا تھا۔ تاکہ وہ دونوں کو پاس پاس کھڑے دیکھ کر مقابلہ کر سکیں۔ کیونکہ اُسے یقین تھا۔ کہ اگر وہ دونوں کو دیکھیں گے تو وہ بلا تامل مسیح کے حق میں فیصلہ کر دیں گے۔

مگر اس مختصر وقت کو صدر مجلس کے ممبروں نے غنیمت سمجھا اور انہوں نے لوگوں کو ترغیب دینی شروع کی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کیا یہ گلیلی لوگ نہیں تھے۔ جو اس قدر دھوم دھام کے ساتھ یسوع کو اس سے چند روز پہلے شہر میں لائے تھے۔ بلکہ یروشلیم کے عوام الناس جن پر مذہبی پیشواؤں کو بڑا اثر و اختیار حاصل تھا۔ کاہن اور فقیہ اب ان کے درمیان گئے اور ہر طرح کے مکر و فریب سے انہیں اپنے ڈھنگ پر لانا شروع کیا۔ غالباً سب سے مضبوط دلیل یہ پیش کی ہو گی۔ کہ ظاہر ہے کہ پیلاطس یسوع کو چاہتا ہے۔ اور لئے انہیں اُس کے حق میں رائے نہیں دینی چاہیے۔

اگر درحقیقت پیلاطس نے دونوں یسوعوں کو پہلو بہ پہلو اُس چبوترہ پر کھڑا کیا۔ تو یہ کیسا عجیب نظارہ ہو گا۔ ایک تو سرکش اور فسادی شخص تھا۔ جس کے ہاتھ خون سے رنگے تھے۔ دوسرا لوگوں کو شفا بخشنے والا اور راہ حق کی تعلیم دینے والا جو برابر لوگوں کی بھلائی میں مشغول تھا۔ جو ابنِ آدم اور ابنِ اللہ تھا۔ اب بتاؤ تم ان دونوں میں سے کسے قبول کرو گے ؟ یسوع کو یا برا باس کو ؟ اور دس ہزار گلوں سے یہ صدا آئی۔ برا باس کو۔ یسوع پر اس کیا اثر ہوا ہو گا ؟ یہی وہ یروشلیم کے رہنے والے ہیں جن کے لئے اُس کی یہ خواہش تھی کہ جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ انہیں اپنے زیر سایہ جمع کر لے۔ یہی اُس کے کلام کو سنا کرتے تھے۔ انہیں پر اُس نے اپنے معجزے دکھائے تھے۔ یہی اُس کے محبوب تھے۔ اور یہی لوگ ایک خونی اور لیٹرے کو اُس پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اسی نظارہ کو اکثر اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ جمہور کی رائے کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگرچہ لوگوں کے خوشامدی یہ کہا کرتے ہیں۔

کہ زبانِ خلق کو نقارہ خُدا سمجھو۔

مگر سامنے نگاہ کرو۔ جب انہیں یسوع اور برا باس میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے تو وہ ہمیشہ برا باس ہی کو چنتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو اس مقدمہ نے امرا کی جماعت کا بھی فیصلہ کر چھوڑا ہے کیا کاہن و رفقیہ اور شرفا عوام الناس سے بہتر ہیں ؟ عوام الناس نے تو انہیں کی صلاح پر عمل کیا تھا۔

مگر دونوں میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنا یا ایک دوسرے پر طعن وتشنیع (بُرا بھلا کہنا) کے پتھر پھینکنا ہرگز نہیں سجتا۔ یہ بہت بہتر ہو گا۔ کہ اس قسم کے نظارہ سے ہم اپنے لئے اپنی جماعت اور اپنے ملک کے لئے خوف کھانا سیکھیں۔ ہمیں کس کا مداح ہونا چاہیے؟ کس کی پیروی کرنی چاہیے کس میں نجات ڈھونڈنی چاہیے۔ جمہور کے فیصلہ کے لئے بڑے بڑے سوال پڑے ہیں۔ وہ کس کو چنیں گے۔ انقلابِ عظیم پیدا کرنے والے کو؟ یا از سرنو پیدا کرنے والے کو؟ اور وہ کس پر اعتماد کریں گے۔؟ چالاک آدمی پر یا نیک طبیعت آدمی پر؟ وہ کونسا مزاج اختیار کریں گے؟ دست درازی کا یا محبت کا؟ وہ کون سے وسائل کام میں لائیں گے؟ جو باہر باطن کی طرف جاتے ہیں۔ یا جو باطن سے باہر کی طرف؟ وہ کس مُدعا کو ڈھونڈیں گے؟ کھانے پینے کی بادشاہت کو یا اُس بادشاہت کو جو روح قدس میں راستبازی اور اطمینان وسلامتی اور خوشی ہے؟ مگر یہ سوالات فقط جمہور کے واسطے ہی نہیں ہیں۔ تمام جماعتوں۔ تمام فرقوں۔ ہر ایک نسل اور ہر ایک ملک کو وقتاً فوقتاً اُن سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اور اسی ایک ایک فردِ واحد کو بھی مگر زندگی کے سب سے بڑے انتخابات آخرکار صرف اس بات میں کھپ جاتے ہیں۔ کہ کس کو انتخاب کرو گے؟ یسوع کو یا براباس کو؟۔

۴۔

پیلاطس کو یہ بات کہ انہوں نے براباس کو انتخاب کیا بڑی حیرت ناک معلوم ہوئی ہو گی۔ اور اُس سے اُسے سخت صدمہ بھی پہنچا ہو گا۔ اور وہ پوچھنے لگا۔ تو میں یسوع کو کیا کروں؟ غالباً اُسے اس جواب کی اُمید تھی کہ اُسے بھی ہمیں دے ڈال۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ بڑی خوشی سے اس قسم کی درخواست کو قبول کرتا ہے۔ مگر بجائے اس کے گونج کی طرح یہ جواب سنائی دیا۔ اُسے صلیب دے اور یہ ایک درخواست نہیں بلکہ ایک حکم کے طور پر معلوم ہوتا تھا۔

اب اُسے یہ سوجھا کہ جس بات کو وہ بچ نکلنے کا سوراخ سمجھا تھا وہ درحقیقت ایک پھانسی ثابت ہوئی جس میں اُس نے خواہ مخواہ اپنا گلا پھنسا دیا۔ وہ اُن سے کہہ سکتا تھا۔ کہ اُس نے انہیں فقط یہ اختیار دیا تھا۔ کہ دو جانوں میں سے ایک کو بچا لیں۔ نہ یہ کہ اُن میں سے کسی کو ضائع کریں۔ لیکن ایک طرح سے اُس نے دونوں قیدیوں کو اُن کی رائے پر چھوڑ دیا تھا۔ بہر صورت لوگوں نے اُس کا یہی مطلب سمجھا۔ اور اُس نے بھی اُن کے خیال کی تردید کرنے کی جرأت نہ کی۔

مگر تو بھی اس سے پر بہت ہی اثر ہوا۔ اور اب اُس نے ایک بالکل غیر معمولی حرکت کی۔ اُس وقت اُس نے ایک برتن میں پانی منگوایا اور سب کے سامنے اپنے ہاتھ دھو کر کہنے لگا کہ۔ میں اس راستباز آدمی کے خون سے پاک ہوں۔ تو جانو یہ ایک بڑا سنجیدہ کام تھا۔ مگر اس کی سنجیدگی ساری دکھاوے کی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ دھوئے۔ حالانکہ اُسے اُن ہاتھوں سے کام لینا چاہیے تھا۔ اور خون ایسی آسانی سے دھوئے نہیں دُھلتا۔ وہ اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کر کے اُسے دوسرے کے کندھے پر نہیں ڈال سکتا تھا۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدہ دار اور بااختیار آدمی اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم عام رائے کے سامنے اپنی گردن جھکاتے ہیں۔ مگر ہم بذاتِ خود اس سے اپنے ہاتھ دھوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا عہدہ پیلاطس کی طرح اس امر کا متقضی (تقاضا کرنا) ہے کہ انہیں اُس امر کا اپنے خیال کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ نتیجہ خواہ اُن کے حق میں کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ تو ایسے گناہوں کا جرم اُن کے ساتھ برابر لگا رہے گا۔ اور کسی صورت میں اُن سے جدا نہ ہو گا۔ یہ سارا نظارہ مجسٹریٹوں کے لئے بطور ایک آئینہ کے ہے۔ جس میں وہ دیکھ سکتے ہیں۔ کہ اگر وہ اپنے کو محض عوام کی رائے کا اوزار بنا دیں گے۔ تو انہیں کیسے کیسے گہرے اور تاریک کنوئیں جھانکنے پڑیں گے۔ پیلاطس کو چاہیے تھا کہ کچھ ہی

کیوں نہ ہو۔ عوام کی رائے کی مخالفت کرتا اور ایسے کام کو کرنے سے جسے وہ درست نہیں سمجھتا تھا انکار کردیتا۔ مگر ایسا کرنے سے اُسے نقصان ہونے کا اندیشہ (ڈر) تھا۔ اور اسی وجہ سے اُس نے ایسا نہ کیا۔

لوگوں نے اپنی کامیابی کو معلوم کرلیا۔ اور جب اُس نے یسوع کی موت کے بارہ میں اپنی صفائی ظاہر کی تو انہوں نے گستاخانہ جواب دیا۔ اُس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ پیلاطس کو تو اس جرم کو اپنے سر لیتے خوف آیا۔ مگر انہیں نہیں۔ کیا عجب کہ اُن کے یہ الفاظ سن کر ان کے سر پر آسمان تاریک ہو جاتا۔ اور اُن کے پاؤں کے نیچے زمین کانپ اُٹھتی اس سے بڑھ کر ناپاک الفاظ شاید ہی کبھی بولے گئے ہوں گے۔ مگر وہ مارے غضب کے دیوانہ ہورہے تھے۔ اور سوائے اس کے کہ انہیں اس معاملہ میں فتح حاصل ہو۔ اور کسی بات کی مطلق (بالکل) پروانہ تھی۔ مگر اُن کے یہ الفاظ اُس عدالت میں جس کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ فراموش نہ ہوئے۔ اور ابھی بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ وہ لعنت جو انہوں نے اپنے سر لی تھی۔ اُن کے شہر اور اُن کی قوم پر پڑ گئی۔ مگر اُس وقت تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور پیلاطس کی مرضی اُن کے کامل اصرار کے سامنے شکستہ ہو رہی تھی۔

ساتواں باب

کانٹوں کا تاج

پیلاطس اپنی ساری کوششوں میں جو اُس نے یسوع کو اُس کے ایذا (تکلیف) دینے والوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے کیں ناکام رہا۔ بلکہ جس قدر وہ زیادہ کوشش کرتا تھا۔ اُسی قدر ان کا غصہ اور بڑھتا جاتا تھا۔ اور اب اُسے سوائے اُس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ یسوع کو جلادوں کے حوالہ کر دے۔ کم سے کم اُن عقوبتوں (تکلیفوں) اور زدوکوب (مارپیٹ) کرنے کے لئے جو صلیب دیئے جانے سے پہلے مجرموں پر روا رکھی جاتی تھیں۔

یہ بات زمانۂ حال کے مسیحی خیال کے مطابق نہیں کہ مسیح کی اُن جسمانی تکالیف کا بہت کچھ ذکر کیا جائے۔ کسی زمانہ میں لوگوں کا خیال اس بارہ میں مختلف تھا۔ متقدمین شل ٹاؤلر کے ان تکالیف کے ہر پہلو کو بہت کچھ مبالغہ سے بیان کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صفحۂ تحریر خون سے بھرا معلوم ہوتا اور مارے خوف و دہشت کے پڑھنے والے کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ مگر ہمارے زمانہ میں زیادہ تر میلان (رجحان) اس طرف ہے کہ ان خوفناک نظاروں پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اور اگر یہ پردہ اُٹھانا روا بھی رکھتے ہیں۔ تو صرف اس قدر کہ جس سے اُس کے دل کی حالت کو بخوبی سمجھ سکیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اُس کے تمام تکالیف درحقیقت اُس کے دل کے ساتھ ہی وابستہ تھیں۔

ہمارے خُداوند کے مقدس جسم کو بہت سے صدمے اور بیرحمیاں جھیلنی پڑیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ صلیب کی خوفناک اور مرکب تکالیف کی نذر کیا گیا۔ اوّل اُس کی وہ جان کنی تھی جو باغ میں اُس پر طاری ہوئی۔ پھر اُن زنجیروں کا جن میں وہ گرفتار ہونے پر جکڑا گیا۔ ذکر چھوڑ کر بھی۔ وہ ضرب تھی جو سردار کاہن کے نوکر نے اُس کے منہ پر لگائی۔ جب رات کے وقت دینی حکام اُس پر فتویٰ لگا چکے۔ تو لکھا ہے کہ انہوں نے اُس کے منہ پر تھوکا۔ اور اُس کے مکّے مارے۔ اور اور لوگ اُس کے گالوں پر طمانچے مار کر کہتے تھے۔ کہ اے مسیح نبوت سے ہمیں بتا تجھے کس نے مارا۔ اس لئے یہ چوتھا موقع ہے۔ کہ اُسے جسمانی تکلیف اُٹھانی پڑی۔

پہلے انہوں نے اُس کے کوڑے لگائے۔ یہ رومی سپاہیوں کے ہاتھ سے اُن کے آقا کے حکم سے ہوا۔ اگرچہ ظن غالب (یقینی امکان) ہے کہ گورنر خود اُس وقت وہاں سے چلا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی چبوترہ پر جہاں مقدمہ ہو رہا تھا۔ اور سب کے رُوبرو وقوع میں آیا۔ مسیح کے کپڑے

اُتار کر اُسے ایک ستون سے باندھا گیا۔ یا اُس کے ہاتھ پس پشت باندھ کر ایک کھنبے پر جھکا دیا گیا۔ تاکہ کسی طرح اپنے کو بچا نہ سکے۔ کوڑے کی شکل یہ تھی۔ کہ ایک لکڑی کے ساتھ کئی ایک تسمے بندھے ہوتے تھے۔ جن کے سروں پر لوہے یا ہڈی کے ٹکڑے لگے تھے۔ ان کوڑوں کی ضربوں سے نہ صرف چمڑا پاش پاش ہو جاتا اور خون نکل آتا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات آدمی کوڑے کھاتے کھاتے جان بحق ہو جایا کرتے تھے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ پیلاطس نے یسوع کا کچھ لحاظ کر کے ان کوڑوں کی تعداد یا سختی کو ہلکا کر دیا ہوگا۔ مگر بر خلاف اس کے یہ واضح رہے کہ اُس کی اس تدبیر کا جو وہ اپنے زعم (گمان) میں اُس کی رہائی کے لئے کر رہا تھا۔ اصل مُدعا یہ تھا۔ کہ یہودیوں پر یہ ظاہر کرے کہ وہ آگے ہی بہت کچھ دُکھ اُٹھا چکا ہے۔ یسوع کا اپنی صلیب اُٹھا کر لے جانے کے ناقابل ہونا غالباً اسی تکان اور دُکھ کے سبب سے تھا۔ جو کوڑوں کے سبب سے اُس پر واقع ہوا۔ اور ایک محض فرضی خیال کے مقابلہ میں جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ یہ امر اس سزا کی سختی کو پورے طور پر ثابت کر رہا ہے۔

کوڑے لگانے کے بعد سپاہی اُسے محل میں اپنی رہائش گاہ میں لے گئے۔ اور ساری رجمنٹ کو اس تماشے کا لطف اُٹھانے کے لئے جمع کیا۔ ظاہر اُوہ یہ سمجھتے کہ اُس پر صلیب کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اور ہر ایک آدمی جس پر یہ فتویٰ لگ جاتا تھا۔ کوڑے لگانے کے بعد سپاہیوں کے حوالہ کر دیا جاتا تھا۔ کہ جس طرح چاہیں اُس کے ساتھ سلوک کریں جیسے جنگل میں شکار کو پکڑ لیتے ہیں۔ تو اُسے کتوں کے آگے ڈال دیا کرتے ہیں۔ اور یہ مثال بالکل بر محل (موقع کے مطابق) بھی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ لوتھر نے لکھا ہے اُن دنوں میں آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا کرتا تھا۔ جیسا آج کل حیوانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے لئے اس کا سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کیوں ساری رجمنٹ کو محض اس لئے جمع کیا گیا کہ اپنے ایک ہم جنس کے دُکھوں اور مصیبتوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں اور اُس کی درد تکلیف پر مضحکے اُڑائیں۔ مگر یہی اُن کا مقصد تھا۔ اور وہ اُس وقت ایسا ہی لطف اُٹھا رہے تھے۔ جیسے سکول کے لڑکے زخمی حیوان کو مرتے دیکھ کر۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہ لوگ تھے جو میدان جنگ میں خون دیکھنے کے بالکل عادی ہو رہے تھے۔ اور جب کبھی روم میں ہوتے تھے۔ تو تماشا گاہ کے کھیل تماشوں میں اور میلوں تیوہاروں کے موقعوں پر تلوار بازوں کو ایک دوسرے کو گھائل کرتے دیکھنا اُن کا پسند مشغلہ تھا۔

اس تمسخر کو انہوں نے ایک تاجپوشی کی رسم میں بدل دیا۔ انہوں نے تحقیقات کے اثناء میں یہ معلوم کر لیا تھا۔ کہ یسوع پر یہ الزام لگایا گیا ہے۔ کہ وہ بادشاہ ہونے کا دعویدار ہے۔ اور ایسے آدمی کی طرف سے جو بالکل کمینہ اور غریب ہو اس قسم کے اعلیٰ دعویٰ کا اظہار خواہ مخواہ اُسے یارانِ شاطر کا تختۂ مشق (کسی مقصد کے لئے کسی کو بار بار استعمال کرنا) بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے دل میں اس خیال پر کہ ایک یہودی قیصر سے بڑھ کر بادشاہ بننے کا مُدعی ہو ایک قسم کی نفرت و حقارت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ اجنبی سپاہی جو فلسطین میں متعین تھے۔ یہودیوں کو جو اُن سے اس قدر دشمنی رکھتے تھے۔ بھلا کب پسند کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے ایک یہودی مُدعی سلطنت کے حق میں اُن کی تحقیر اور بھی تیز ہو گئی ہوگی۔ اب انہوں نے اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا شروع کیا کہ گویا وہ سچ مچ بادشاہ ہے۔ بادشاہ کو ارغوانی پوشاک پہننی چاہیے اور اس لئے وہ کسی افسر کا اُس رنگ کا ایک پُرانا کوٹ لے آئے اور اُس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ پھر بادشاہ کے سر پر تاج ہونا چاہیے۔ اس لئے اُن میں سے ایک باغ میں دوڑا گیا اور چند ٹہنیاں کسی درخت یا جھاڑی کی توڑ لایا۔ یہ ٹہنیاں کانٹے دار تھیں مگر انہیں ان کی کیا پرواہ تھی۔ بلکہ یہ اور بھی اچھا ہوا۔ اب انہوں نے انہیں توڑ مروڑ کر ایک تاج کی شکل میں بنا دیا۔ اور پھر اُس کے سر پر رکھ کے اوپر سے دبا دیا۔ اب سارا سامان پورا کرنے کے لئے بادشاہ کے پاس عصائے شاہی بھی ہونا لازم ہے۔ اور اُس کے مہیا کرنے میں انہیں کچھ دقت پیش نہ آئی۔ ایک سرکنڈا جسے غالباً کوئی شخص بطور لاٹھی کے استعمال کرتا تھا۔ پاس ہی تھا۔ سو وہ اُس کے دہنے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔ اب بادشاہ سج سجا کر بالکل تیار ہو گیا۔ اور تب جیسا خاص خاص موقعوں پر انہوں نے رعایا کو شہنشاہ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی باری باری آگے بڑھ کر اور

گھٹنے ٹیک کر کہنا شروع کیا۔اے یہودیوں کے بادشاہ سلام۔لیکن ایسا کرنے کے بعد ہر ایک اُن میں قہقہہ لگاتا ہوا پیچھے لوٹتا۔اور اُسے ایک ضرب لگا جاتا۔ اور اس غرض کے لئے اُسی عصائے شاہی یعنی سر کنڈے کو استعمال کرتا تھا۔جو اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔اور اگرچہ مجھے اس بات کے بتانے میں شرم آتی ہے۔انہوں نے اُس کے منہ کو تھوکوں سے بھر دیا۔

کیسا عجب نظارہ! ظاہر میں تو یہ اُمید ہوتی تھی۔کہ وہ لوگ جو خود غریب اور رذیل (پاجی۔کمینہ) تھے۔اور اس لئے طاقتور لوگوں کے ہاتھوں ظلم سہتے رہتے تھے۔اپنے درجے کے ایک آدمی کے حق میں جو ظلم کے پاؤں تلے کچلا جارہا تھا۔ہمدردی اور رحم کو محسوس کریں گے۔مگر ادنیٰ نوکروں کی بے رحمی کے برابر شاید ہی کوئی اور بے رحمی ہو گی۔سب آدمیوں میں ایک چھپی خواہش ہے جو دوسروں کو اپنے سے ادنیٰ حالت میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔اور خاص کر ایسے آدمی کے لئے جس نے بڑا بننے کی کوشش کی ہو مگر ذلت میں پڑ جائے۔اُس کی افتاد میں ایک قسم کی ذاتی خوشی حاصل ہوتی ہے۔اس قسم کی کمینہ جذبات ہر انسان کے دل کی تہ میں بھری پڑی ہیں۔اور اس موقع پر انسان کی کمینہ جذبات کی تہ کی تہ اور اُس کی بڑی خواہشوں کی غلاظت کی غلاظت آشکارا ہو گئی۔

مگر یسوع پر اس قسم کا نظارہ دیکھنا کیسا شاق وسخت گذرا ہو گا۔یہ سب باتیں اُس کی آنکھوں کے سامنے پیش کی گئیں۔نہیں بلکہ خود اُس کی ذات پر وارد کی گئیں۔اور ایسے طور پر کہ وہ اپنا چھپا چھڑا کر اُن سے دور نہیں جاسکتا تھا۔اُس کے نازک اور لطیف جسم اور اُس کے سریع الحس دل (نرم دل) کے لئے ایسے وحشی اور بے رحم آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑنا کیا کچھ نہ ہو گا۔تاہم یہ بات ضروری تھی۔تاکہ اُس کام کو جس کے سرانجام کرنے کے لئے وہ اس دُنیا میں آیا تھا۔تکمیل کو پہنچائے۔وہ بنی انسان کو نجات دینے کے لئے آیا تھا۔تاکہ گہری سے گہری اور ادنیٰ سے ادنیٰ حالت تک غوطہ لگائے اور کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈے اور بچائے۔اور اس لئے اسے ضرور تھا۔کہ فطرت انسانی کے بڑے سے بڑے نمونوں اور ذلیل سے ذلیل خرابیوں سے پوری واقفیت پیدا کرے۔وہ تمام گنہگاروں ہاں ایسے خراب اور ذلیل آدمیوں کا بھی جیسے کہ یہ سپاہی تھے۔نجات دینے والا تھا۔اور اس لئے اُسے ضرور تھا کہ اُن سے ملے اور دیکھے کہ وہ کیسے ہیں۔

اس طور سے میں نے حتی الامکان جہاں تک ہوسکے نہایت سہولت کے ساتھ اُس کے دُکھوں کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اس سے زیادہ تفصیل کے خواہاں نہ ہوں گے۔مگر اس موقع پر تھوڑی دیر اور ٹھہرنا فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔تاکہ جو سبق اس نظارہ سے حاصل ہوتے ہیں۔اُن کو حاصل کریں۔

اوّل یسوع کے ایذا دینے والوں کے چال چلن میں اس امر کو دیکھو کہ انہوں نے خُدا کی بخششوں کا کیسا بُرا استعمال کیا۔رومی سپاہیوں کے چلن میں اوّل سے آخر تک خاص کر یہ بات نظر آتی ہے۔کہ کس طرح وہ ہر ایک موقع پر اپنے منصبی کام کو مسخری اور تماشے میں بدل ڈالتے تھے۔اب دیکھو! ہنسی خُدا کی ایک بخشش ہے۔یہ بطور مصالح کے ہے جو خُدائے تعالیٰ نے اس لئے عطا کیا ہے۔کہ روزمرہ زندگی کے بے مزہ طعام (کھانے) کے ساتھ بطور چاشنی کے استعمال کیا جائے۔یہ ایک بے لطف نظارہ کے لئے بطور سورج کی روشنی کی جھلکوں کے ہے۔اشیاء زندگی میں اُن کے خندہ انگیز پہلو کو دیکھنے کی قابلیت زندگی کے بوجھ کو بہت ہی ہلکا کر دیتی ہے۔اور وہ شخص جو لوگوں کو ہنسا سکتا اور اُن میں زندہ دلی پیدا کر سکتا ہے۔بنی انسان کا ایک سچا مربی (پرورش کرنے والا) اور فیض رساں (فائدہ پہنچانے والا) ہے۔

لیکن اگرچہ ہنسی اور مزاح خُدا کی بخشش ہے۔شاید ہی خُدا کی کوئی اور بخشش ہو گی۔جس کا ایسا بُرا استعمال کیا جاتا ہو گا۔یہاں تک کہ وہ بجائے برکت کے لعنت کا باعث ٹھہرتی ہے۔جب کہ لوگ مقدس اشیاء اور پاک اشخاص کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔جب وہ اُس کے ذریعہ سے بڑی اور قابلِ عزت اشیاء

کی توہین وتذلیل کرتے ہیں۔ جب وہ کمزوروں کی ایذارسانی اور بے گناہوں کی تضحیک وتمسخر کاآلہ بنائی جاتی ہے۔ تب ہنسی بجائے ساغر محفل کی اُبلتی ہوئی جھاگ ہونے کے سم قاتل کاکام دیتی ہے۔ اس وقت ان سپاہیوں کے بے رحمانہ افعال میں ہنسی ہی اُن کی رہنمائی کررہی ہے۔ وہ اُن کے افعال کی اصل صورت کواُن سے چھپائے ہوئے ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے مسیح کے دل پر پیلاطس کے کوڑوں سے بھی زیادہ گہرے زخم لگے ہوں گے۔

دُوسری بات قابلِ غور یہ ہے۔ کہ اس موقع پر منجی کے عہدہ شاہی کے خلاف ان لوگوں کی مخالفت ظاہر ہورہی تھی۔ دینی عدالت کے فتویٰ کے بعد جواُس کی بے حرمتی ہوئی وہ کچھ اور قسم کی تھی۔ اُس وقت اُس کے عہدہ نبوت کی ہنسی اُڑائی گئی تھی۔ چنانچہ لکھاہے۔ کہ وہ اُس کا منہ ڈھانپنے اور اُس کے مکّے مارنے اور اُس سے کہنے لگے۔ نبوت سے بتاکہ تجھے کس نے مارا۔ لیکن برخلاف اس کے یہاں تمام تمسخر اس امر پر ہورہا تھا۔ کہ اُس نے بادشاہ ہونے کادعویٰ کیا تھا۔ سپاہیوں کے نزدیک یہ ایک بے ہودہ اور قابلِ تمسخر بات معلوم ہوتی تھی۔ کہ ایک شخص جوایسا ذلیل اور بے یار ومددگار اور کمزور ہواس قسم کادعویٰ کرنے کاحوصلہ کرے۔

اُس زمانہ سے آج تک بہت دفعہ مسیح کے اسی دعوائے شاہی کی اسی طرح ہنسی اُڑائی جاتی ہے۔ وہ قوموں کا بادشاہ ہے۔ مگر زمینی بادشاہ اور حاکم اس خیال کی ہنسی اُڑاتے رہے ہیں۔ کہ اُس کی رضا اور اُس کی شریعت اُن کی تدبیر اور حرص وہوا پر حاوی ہونے کاحوصلہ رکھتی ہے۔ بلکہ جہاں کہیں اُس کے اختیار کوبرائے نام مانا بھی جاتاہے۔ خواہ وہ سلطنت جمہوری ہو یا شاہی۔ وہ بھی اس امر کے تسلیم کرنے میں سستی ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے قوانین اور اُن کی رسم ودستور اُسی کے کلام کے مطابق وضع اور قائم ہونے چاہییے۔ وہ کلیسیاء کا بادشاہ ہے۔ اینڈریوملول[1] نے جیمس شاہِ انگلستان کو کہا تھا۔ کہ سکاٹ لینڈ میں دو بادشاہ اور وہ بادشاہتیں ہیں ایک تو شاہ جیمس ہے جواپنی مملکت کا حاکم ہے۔ دُوسرا مسیح یسوع ہے جس کی رعایا خود شاہ جیمس ششم ہے اور وہ اُس کی سلطنت میں نہ بادشاہ ہے نہ امیر۔ نہ سردار۔ بلکہ ایک معمولی فرد کارتبہ رکھتاہے۔ اور سکاٹ لینڈ کی کلیسیاء کی ساری تواریخ کو محض اسی سچائی کے قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کی تاریخ کہیں تو بجاہے۔ اور اس جدوجہد کو بھی قریباً ایسی مخالفت ہوتی رہی۔ جیسے کہ خود یسوع کی پیلاطس کے محل میں ہوئی تھی۔

سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے۔ کہ افراد انسانی کی مملکت میں مسیح کی بادشاہت کو تسلیم کرلیا جائے۔ مگر یہیں زیادہ تر اُس کی مرضی کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ہم باتوں باتوں میں تواُس کی اطاعت کو تیار ہیں۔ لیکن ہم میں سے کون ایسا ہے جو یہ کہ اس لئے کہ وہ اپنے نفس پر ایسی کامل فتح حاصل کرچکا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُس نے مسیح کے دعویٰ کو کامل طور پر تسلیم کرلیاہے۔ کہ وہی ہمارے کاروبار اور فرصت کے گھنٹوں کا انتظام کرے۔ اور وہی ہمیں بتائے کہ ہمارے وقت اور وسائل اور خدمات سے کیا کام لیا جانا چاہیے۔

تیسرا سبق یہ ہے۔ کہ جو کچھ یسوع نے اُس وقت برداشت کیا وہ سب ہمارے لئے برداشت کررہا تھا۔

اس نظارہ کی تمام باتوں میں سے جس بات نے مسیحیوں کے خیال پر بڑا اثر کیاہے۔ وہ کانٹوں کا تاج ہے۔ یہ ایک غیر معمولی چیز تھی۔ اور بے رحمی کی قوت ایجاد اور شرارت پر شاہد (گواہ) تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ کانٹے کی چوٹ کو قریباً ہر ایک شخص کبھی نہ کبھی محسوس کرتاہے۔ اس لئے اس سے ہم منجی کی تکلیف کا بہ نسبت کسی اور چیز کے زیادہ آسانی سے اندازہ لگاسکتے ہیں۔ مگر اس کی تاثیر کا اثر زیادہ تر اس وجہ سے ہے۔ کہ وہ ایک اعلیٰ خیال کی علامت ہے۔ جب آدم اور حوا باغِ عدن سے نکالے گئے اور انہیں ایک خشک اور پُر محنت دُنیا میں زندگی بسر کرنی پڑی تواُن کو یہ حکم سنایا گیا تھا۔ کہ زمین

---

[1] ، اینڈریوملول ۱۵۴۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۲ء میں مرگیا۔ وہ سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اور اپنے علم وفضل کے لئے اپنے زمانہ میں نہایت مشہور تھا۔ وہ علاوہ عالم علم الٰہی ہونے کے مشرقی زبانوں میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا۔ وہ فرانس۔ جنوا اور گلاسکو اور سینٹ اینڈریوز کی یونیورسٹیوں میں مختلف اوقات میں پروفیسر کے عہدہ پر رہا۔ اُس کی زندگی کے آخری سال شاہ جیمس کے مقابلہ میں کلیسیائے سکاٹ لینڈ کے حقوق کی حفاظت کے لئے لڑنے جھگڑنے میں خرچ ہوئے۔ سخت کلامی کی وجہ سے وہ چار سال قید رہا اور بعد ازاں اپنے ملک کو واپس جانے کی اجازت نہ ملنے کے سبب وہ فرانس میں چلا گیا اور وہیں مرگیا۔

اُن کے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے پیدا کرے گی۔ کانٹا لعنت کا نشان تھا۔ یا یوں کھو کہ خُدا کی حضوری سے رد کئے جانے کا اور اُن تمام افسوس ناک اور دردانگیز نتائج کا جو اُس سے پیدا ہوتے ہیں۔اور کیا یہ کانٹا بھی جب کہ موسم سرما میں برہنہ شاخ پر سے اپنی بڑی صورت کے ساتھ ڈراتا ہوا نظر آتا ہے۔اور موسم سرما میں پتوں یا پھولوں میں چھپا ہوا ہاتھ کو چبھتا ہے۔اور مسافر کے کپڑوں اور جسم کو جو جھاڑی میں سے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے پھاڑتا اور گھائل کرتا ہے۔اور جہاں کہیں جسم میں لگتا ہے جلن سی پیدا کرتا ہے۔ہاں کیا یہ کانٹا۔ زندگی کے اس پہلو کی جو گناہ سے وابستہ ہے۔ایک مناسب علامت نہیں ہے۔ وہ زندگی جو افکار اور اضطراب۔ دُکھ اور مایوسی۔ بیماری اور موت سے بھری پڑی ہے۔القصہ وہ لعنت کا ایک مناسب نشان ہے۔ مگر مسیح اس لئے آیا تھا کہ اس لعنت کو برداشت کرے۔اور جب کہ اُس نے اُسے اپنے سر پر اُٹھا لیا تو اُس نے اُسے دُنیا کے سر پر سے اُٹھا دیا۔اُسنے ہمارے گناہ اُٹھا لئے اور ہمارے غم برداشت کئے۔

مگر اس کیا سبب ہے کہ ہم اب جب کبھی کانٹوں کے تاج کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہمارے دل میں فقط ترس اور دہشت کے خیال ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ اُس کے ساتھ ہی ایک قسم کی شادمانی بھی حاصل ہوتی ہے۔ جسے ہم دبا نہیں سکتے۔اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ گو سپاہیوں کی مسخری سخت بے رحمی پر مبنی تھی۔ مگر اُن کے اس فعل میں بھی ایک الٰہی کارسازی سمجھنی چاہیے۔الٰہی حکمت اُن کے گناہ کے ذریعہ بھی اپنے مقصد و منشاء کو پورا کر رہی تھی۔ بعض اشخاص ایسے خوبصورت واقع ہوئے ہیں کہ اگر انہیں خراب سے خراب کپڑے بھی پہنا دیئے جائیں جو اگر دوسروں کے جسم پر ہوں تو انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آئے یا نفرت پیدا ہو۔ مگر اُن پر بالکل سج جاتے ہیں۔اور ٹوٹے پھوٹے زیور جو اُن پر بلا امتیاز لگا دیئے جائیں ایسے دل کش معلوم دیتے ہیں۔ کہ اوروں کی نہایت پر تکلف پوشاک اور زیب وزینت بھی اُن کے سامنے ہیچ (کمتر) معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح مسیح میں ایک ایسی بات ہے۔ کہ جس سے وہ چیزیں بھی جو اُس کی بے ادبی و بے حرمتی کی نظر سے اُس پر پھینکی جاتی تھیں۔اُس کے لئے زیور کا کام دیتی ہیں۔ جب لوگوں نے اُسے محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا دوست کہا۔ تو اگرچہ یہ نام انہوں نے براہ تمسخر اُسے دیا تھا۔ لیکن آخر کار یہ لقب ایسا دلکش ثابت ہوا کہ اُس کے سبب سے سینکڑوں نسلیں برابر اُس کی محبت کا دم بھرتی چلی آئی ہیں۔اور اسی طرح جب انہوں نے اُس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا تو وہ انجانے اُس کے سر پر شرافت کا سہرا باندھ رہے تھے۔ جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا ہو گا۔ ان زمانوں کے اتراؤ میں یسوع برابر وہی کانٹوں کا تاج پہنے چلا آتا ہے۔اور اُس کے عاشق اور پیرو اُس کے لئے کسی اور تاج کے خواہاں نہیں ہیں۔

چہارم۔اس نظارہ سے ہم سبق سیکھتے ہیں کہ دُکھ اور درد کے وقت تحمل اور برداشت کو کس طرح کام میں لانا چاہیے۔

میں ایک مقدس خاتون سے واقف ہوں جس کی واقفیت کی عزت مجھے اپنے خادم الدین کے ابتدائی زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اگرچہ وہ غریب اور ناتعلیم یافتہ تھی۔ مگر اس کی خُدا داد ذہانت و قابلیت قابل تعریف تھی۔اُس کے خیالات عجیب و غریب اور طبع زاد اور اُس کی گفتگو ایسی پسندیدہ تھی۔ کہ سننے والوں کا دل خود بخود کھنچا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت عمر رسیدہ نہ تھی۔ مگر وہ جانتے تھے۔ کہ اُس کی موت کا دن بہت دُور نہیں ہے۔اور جس مرض میں وہ مبتلا تھی۔ وہ تمام امراض میں سے جو انسان کو لاحق ہوتی ہیں۔نہایت دردناک تھا مجھے یاد ہے کہ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی۔ کہ جب اُس کی تکلیف وجان کنی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ تو وہ چپکے لیٹے لیٹے منجی کے دُکھ اور تکالیف پر غور کیا کرتی تھی۔اور اپنے دل میں کہا کرتی تھی۔ کہ یہ چبھیں ایسی بڑی نہیں ہیں۔ جیسے کانٹوں کے تاج کی سولیں تھیں۔

مسیح کے دُکھوں کو دیکھ کر ہمیں اپنی عیش پرستی اور آرام طلبی قابلِ ملامت معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کی آسائشوں اور عیش وآرام سے حظ (لطف) اُٹھانے میں کچھ بُرائی تو نہیں ہے۔ خُدا ہی ہمیں یہ سب کچھ عطا کرتا ہے۔اور اگر ہم انہیں شکر گذاری کے ساتھ قبول کریں تو ممکن ہے۔ کہ یہ

چیزیں ہمیں اُٹھا کر اُس کے زیادہ زیادہ قریب لے جائیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ ہمیں اُن کی جدائی کا خیال کرنے سے بھی دہشت دامنگیر ہو جاتی ہے۔اور درد اور افلاس (بھوک) کاذکر کرتے بھی ڈر معلوم دیتا ہے۔ خاص کر مسیح کے دُکھوں سے ہمیں حوصلہ ہونا چاہیے کہ خواہ کسی قسم کی تکلیف ہمیں پیش آئے یالعنت ملامت ہمیں جھیلنی پڑے۔ ہم سب کچھ اُن کی خاطر سے برداشت کرنے کو تیار رہیں۔ بہت آدمی ہیں جو مسیحی بننے کے خواہاں تو ہیں۔ مگر اس خوف سے کہ علانیہ اقرار کرنے سے ہم پر ہمارے لنگوٹے یار ہنسیں گے۔ یادُنیاوی عزت وبہبودی میں نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ اس سے باز رہتے ہیں۔ مگر منجی کے دُکھوں پر نظر کرکے ہم کو ایسی بزدلی اور خوف سے شرم آنی چاہیے۔ اگر کانٹوں کا تاج اس وقت بھی مسیح کے سر پر ایسا سہانا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آدمی اور فرشتے بھی اس پر فخر کرتے اور اُس گیت گاتے ہیں۔ تو یقین جانیئے کہ اُس تاج کی شاخوں کا کوئی ٹکڑا جو ہمیں پہننا پڑ جائے گا۔ وہ کسی نہ کسی دن ہمارے نہایت خوشنما زیورات میں سے شمار کیا جائے گا۔

آٹھواں باب

پیلاطس کی بربادی

ہم پیلاطس کے تختِ عدالت کے سامنے بہت دیر تک ٹھہرے رہے ہیں۔ پیلاطس نے ہمیں بہت ہی دیر تک ٹھہرائے رکھا ہے۔ وہ خوب جانتا تھا بلکہ مقدمہ پر سرسری نظر ڈالتے ہی اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اس بارہ میں اپنے فرض کی بجاآوری میں اُسے کیا کرنا چاہیے۔ مگر بجائے اسکے کہ فی الفور اپنے یقین کے مطابق عمل کرتا۔ وہ اُسے معرضِ التوا (دیر کرنا) میں ڈالتا رہا۔ اس قسم کی دیر و تساہل (سستی) سے عموماً فائدہ نہیں نکلا کرتا۔ پیلاطس نے آزمائش کو موقع دیا۔ کہ اُس پر حملہ کرے۔ اُس نے اُس کا مقابلہ تو کیا۔ وہ دیر تک بڑی سختی سے اُس سے لڑتا رہا۔ مگر اُسے سرے ہی سے اُسے حملہ کرنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔ اور آخر کار وہ نہایت ذلت کے ساتھ اُس کا شکار ہو گیا۔

ا۔

جب پیلاطس نے یسوع کو کوڑے مارنے کے لئے حوالہ کردیا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اُس نے درحقیقت اُسے صلیب دیئے جانے کو حوالہ کردیا ہے۔۔ اور غالب معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے بھی ایسا ہی سمجھا۔ کیونکہ کوڑے لگانا صلیب دیئے جانے کا شروع ہوا کرتا تھا۔ تاہم اُس نے ابھی یسوع بچانے کی اُمید کو بالکل ہاتھ سے نہ دیا تھا۔ وہ اب بھی اُسی تجویز کو جو اُس نے پیش کی تھی۔ مدنظر رکھے ہوئے تھا کہ اُسے کوڑے لگوا کر چھوڑ دے۔ شاید جب کوڑے لگائے جانے کے وقت وہ محل میں چلا گیا ہو گا۔ تو اُس کی بیوی نے ضرور اُسے ترغیب دی ہو گی۔ کہ اس راستباز آدمی کو بچانے کے لئے اور بھی کوشش کرے۔

بہر صورت وہ پھر باہر اُس چبوترہ پر آبیٹھا جس کے اردگرد یہودی ٹھٹ (ہجوم۔ گروہ) باندھ سے کھڑے تھے۔ اور انہیں مطلع (اطلاع دینا) کیا کہ مقدمہ کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ اور جب کہ یسوع جس کا پیٹنا ابھی ختم ہوا تھا۔ سامنے آیا۔ تو وہ پھر اور اُس کی طرف اشارہ کرکے بڑے اضطراب (بے چینی) سے پکارا۔ اس آدمی کو دیکھو۔ خواہ مخواہ اُس کی زبان سے یہ رحم انگیز کلمات نکل گئے اور اس میں گ گویا یہودیوں سے یہ درخواست کی گئی تھی۔ کہ وہ آخر کار اس امر کو پہچان لیں کہ اس مقدمہ اور زیادہ کچھ کرنا بالکل نامعقول بات ہو گی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یسوع ہرگز اُن لوگوں میں سے نہیں معلوم ہوتا۔ جیسا کہ وہ اُسے سمجھے بیٹھے ہیں۔ بہر صورت اُسے کافی دُکھ اور سزا مل گئی ہے۔

مگر مسیحی ذہن ہر زمانہ میں ان الفاظ سے اور بھی زیادہ گہرے معنی نکالتا رہاہے۔ جیسے کہ قائفا بھی ایک بڑی سچائی کو بیان کر رہا تھا۔ گو وہ خود اُسے نہ سمجھتا تھا۔ جب اُس نے یہ کہا تھا۔ کہ ضرور ہے کہ ایک آدمی سب کے لئے مرے۔ اسی طرح ان الفاظ میں رومی گورنر نے بھی بلا جانے ایک نبوت کر دی۔ واعظین ہر زمانہ میں انہی الفاظ کا استعمال کرتے رہے ہیں اور یسوع کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔ اس آدمی کو دیکھو۔ مصوروں نے بھی اس موقع کو انتخاب کر کے۔ جب کہ یسوع کوڑوں کے مارے خون سے لتھڑا ہوا اور ار غوانی لباس اور کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے باہر آیا۔ اس مرد غم ناک کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اور بہت بیش قیمت صفحہ تصویر پر الفاظ اکسی ہو مو یعنی۔ اس آدمی کو دیکھو۔ ثبت دیکھے جاتے ہیں۔

پیلاطس کی زبان سے دو لفظ نکلے جنہیں دُنیا کبھی نہ بھولے گی۔ اوّل تو یہ سوال کہ ''حق کیا ہے''؟ اور دوسرے یہ الفاظ۔ اس آدمی کو دیکھو۔ ایک کو گویا دوسرے کا جواب سمجھنا چاہیے۔ جب کہ یہ سوال سچے دل سے پوچھا جاتا ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہوتا ہے کہ کون شخص ہمیں خُدا کی معرفت عطا کرے گا؟ کون شخص زندگی کے راز کو کھولے گا؟ کون شخص آدمی کو اُس کی حقیقت اور انجام سے مطلع کرے گا؟ اور ان سوالوں کا سوائے اس کے اور کیا کوئی جواب ہو سکتا ہے۔ کہ اس آدمی کو دیکھو! اُس نے ابنائے آدم کو دکھا دیا ہے کہ انسان کو کیا بننا چاہیے۔ خود اُسی کی وہ کامل زندگی ہے۔ جس کے مطابق ہر ایک شخص کو اپنی زندگی ڈھالنی چاہیے۔ اُسی نے غیر فانی زندگی کے دروازے کھول دیئے۔ اور دوسرے عالم کے بھید ظاہر کر دیئے۔ اور ان سے بھی بڑھ کر ایک عظیم بات یہ ہے۔ کہ اُس نے نہ صرف ہمیں یہ بتا دیا ہے۔ کہ ہماری زندگی اس جہان میں اور اُس جہان میں کیسی ہونی چاہیے۔ بلکہ یہ بھی کہ ہم کس طرح اس معراج (بلندی) کو حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ فقط کمالیت کی تصویر ہی نہیں ہے۔ بلکہ گناہ سے نجات دہندہ بھی ہے۔ اس لئے ہم دُنیا کو اُس کی طرف متوجہ کرتے اور کہتے ہیں۔ کہ دیکھو اس آدمی کو۔

۲۔

پیلاطس کو یہ اُمید تھی کہ یسوع کے دُکھ اور تکلیف کو دیکھ کر اُس کے ایذا دینے والوں کے دل بھی اُس کے اپنے دل کی طرح پگھل جائیں گے۔ مگر وہاں اُسے فقط یہ جواب ملا کہ۔ اُسے صلیب دے۔ مگر اس امر کو یہاں یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہ الفاظ اب سردار کاہنوں اور حاکموں نے کہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ عوام الناس کے دل متاثر ہو گئے تھے۔ اور اگر اُن کے سر گروہ انہیں اجازت دیتے۔ تو وہ ضرور اپنی ہٹ سے باز آجاتے۔ مگر ان سنگ دلوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ بلکہ خون کو دیکھ کر اُن کا جوش اور بھی بھڑک اُٹھا۔ اور انہیں یقین ہو گیا۔ کہ اگر وہ اپنی بات پر جمے رہیں گے۔ تو پیلاطس کو آخر کار اُن کی بات ماننی ہی پڑیں گی۔

اب اُس کا بالکل قافیہ تنگ ہو گیا۔ اور وہ غصے سے بولا۔ تو تم اُسے لو اور صلیب دو کیونکہ میں اُس میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ جس سے غالباً اُس کا یہ مطلب تھا۔ کہ وہ قیدی کو اُن کے حوالہ کر دے گا۔ بشرطیکہ وہ اُس کے صلیب دینے کی ذمہ داری کو اپنے سر لے لیں۔ اگر در حقیقت اُس کے دل میں مذکورہ بالا الفاظ کے کچھ معنی تھے۔ اور وہ اُن الفاظ میں محض اپنے غصے کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ تو اُن کے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔

انہوں نے دیکھ لیا کہ اب وہ نازک موقع آپہنچا اور آخر کار انہوں نے اُس کے قتل کرنے کی اصلی وجہ بیان کر دی اور کہنے لگے۔ ہم اہلِ شریعت ہیں اور شریعت کے موافق وہ قتل کے لائق ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے آپ کو خُدا کا بیٹا ٹھہرایا۔

تو یہ بنیاد تھی جس پر انہوں نے اُس پر قتل کا فتویٰ لگایا تھا۔ اگرچہ اُس وقت تک انہوں نے اُسے برابر چھپائے رکھا۔ انہوں نے اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ پیلاطس اُس بات کی مسخری اُڑا رہا ہے۔ مگر اب پیلاطس پر اس بات نے اُلٹا اثر پیدا کیا۔ وہ اُس دن سارے وقت کچھ بے چینی سی محسوس کرتا رہا تھا۔ اور جس قدر زیادہ وہ یسوع کے رویہ پر نظر کرتا تھا۔ اُسی قدر وہ اس مقدمہ میں اپنے اُلجھاؤ کو ناپسند کرتا تھا۔ اور اب جب انہوں نے

ذکر کیا کہ وہ ابنِ اللہ ہونے کا دعوٰی دار ہے۔ تو وہ مارے خوف کے کانپ اُٹھا۔ اُس کو دفعتاً (اچانک) وہ ساری کہانیاں یاد آگئیں۔ جن سے خود اُس کا اپنا مذہب بھرا پڑا تھا۔ کہ کس طرح بعض اوقات دیوتا یا دیوتاؤں کے بیٹے بھیس بدل کر زمین پر ظاہر ہوئے۔ اُن کے ساتھ معاملہ پڑنا خوفناک بات ہے۔ کیونکہ اگر انہیں کچھ ضرر پہنچ جائے۔ گو انجانے ہی کیوں نہ ہو۔ تو اُس کا سخت خمیازہ (نقصان) اُٹھانا پڑے گا۔ اُس نے پہلے ہی خود یسوع میں بھی کوئی چیز ایسی پُر راز اور ناقابل بیان معلوم کرلی تھی۔ اگر وہ سچ مچ یہوواہ کا بیٹا ہو۔ جسے وہ یروشلیم کا محافظ دیوتا خیال کرتا تھا۔ جیسے کہ کاسٹر اور[1] پولکس۔ جوپیٹر یعنی مشتری دیوتا کے بیٹے تھے۔ تو پھر کیا ہوگا؟ اور کیا خود یہوواہ۔ اگر اُسے نقصان پہنچایا جائے۔ آدمی کو اپنی لعنت سے برباد نہ کرے گا۔ اب اس قسم کا خوف و دہشت اُس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اور یسوع کو پھر محل کے اندر لے جا کر اور دہشت اور شوق جستجو سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ پوچھنے لگا۔ تو کہاں کا ہے؟

مگر یسوع نے اُسے کچھ جواب نہ دیا۔ اور پھر وہی خاموشی اختیار کرلی جو ہم اس تحقیقات کے تین موقعوں پر پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ مسیح نے اپنے دُکھ اُٹھانے کے اثناء میں جو رویہ اختیار کیا۔ اُس میں یہ خاموشیاں بہت ہی عجیب وغریب اور عظیم معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ہر ایک موقع پر اُس کے دل کی حالت کا جس کے سبب سے اُس نے یہ خاموشی اختیار کی اندازہ لگانا آسان بات نہیں۔ اس موقع پر یسوع خاموش کیوں رہا؟ بعض کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس سوال کا جواب دینا ناممکن تھا۔ وہ اُس کے جواب میں ہاں یا نہیں نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ کہتا کہ خدا اُس کا باپ ہے۔ تو پیلاطس اُس کے وہی سادے اور فحش معنی سمجھتا جیسا کہ اُس کا مذہب اُسے تعلیم دیتا تھا۔ تو بھی اس بات سے پہلو تہی کرنے کے لئے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ ابنِ اللہ نہیں ہے اس لئے یہی بہتر تھا کہ کچھ بھی نہ کہے۔

مگر اس امر کی سچی تشریح زیادہ سادہ ہے۔ یسوع نے اپنے ابنِ اللہ ہونے یا نہ ہونے کی نسبت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ اس امر کی بنا پر رہا کیا جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابنِ اللہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بے گناہ آدمی کی حیثیت سے۔ جس کا پیلاطس بھی بار بار اقرار کر چکا تھا۔ وہ رہائی کا خواستگار تھا۔ اور اُس کی خاموشی پیلاطس سے اسی امر کی طلب گار تھی۔

جج کو اب کو بھی تعجب (حیرانی) ہوا۔ اور اس بات پر وہ کچھ کھسیانا سا بھی ہو گیا۔ اور بولا۔ تو مجھ سے بولتا نہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ مجھے تیرے چھوڑ دینے کا بھی اختیار ہے اور صلیب دینے کا بھی؟ بےچارہ پیلاطس۔ یہ تو ابھی چند منٹ میں ہی ظاہر ہونے والا تھا۔ کہ اُس کا اختیار کیا کچھ ہے۔ اور قدرت جس کا اسے فخر تھا۔ کیا تھی؟ اُس کی بات سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا وہ جو کچھ چاہے بلا روک ٹوک کر سکتا ہے۔ کوئی عادل حاکم اس قسم کا دعوٰی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ عدل وانصاف ہر قسم کے ایسے میلان (رجحان) کو جو خلافِ انصاف ہو اُس سے دُور کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور اب جب کہ یسوع نے بڑے اقتدار کے ساتھ اُس کے جواب کے لئے منہ کھولا تو اُس نے اُسے اسی امر کو یاد دلایا۔ اگر تجھے اُوپر سے نہ دیا جاتا تو پھر مجھ پر کچھ اختیار نہ ہوتا[2]۔ وہ اُسے یاد دلاتا ہے کہ جو قدرت اُسے حاصل ہے وہ اُسے خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اس لئے اُسے اُس کو اپنی خواہش یا ہوس کے موافق استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ عدل کے تقاضاً کے موافق۔ مگر ساتھ ہی اُس نے یہ بھی فرمایا۔ اس لئے جس نے مجھے تیرے حوالہ کیا اُس کا گناہ زیادہ ہے اُس نے اس امر کو

---

[1] ۔ دیکھو یونانیوں کا علم الاصنام۔

[2] ۔ اس کے اگلے فقرے میں جو لفظ "اس لئے" واقع ہوا ہے۔ اس سے ہمیں خواہ مخواہ یہ وہم گذرتا ہے کہ لفظ "اوپر سے" کا اشارہ یہودی عدالت کی طرف ہے۔

تسلیم کیاکہ پیلاطس ایسی حالت میں ہے کہ اُسے مجبوراًاس مقدمہ کی تحقیقات کرنی پڑی ہے۔اُس نے یہودیوں کے حاکموں کی طرح اپنے آپ اُسے ہاتھ میں نہیں لے لیا۔

اس طور سے یسوع نے اپنے جج کی تمام مشکلات کااقبال(ماننا) کر لیا۔اور وہ اُس کے لئے ہر ایک مناسب معذرت کرنے کو تیار تھا۔ یہ وہی شخص تھاجسے پیلاطس نے چند منٹ ہوئے پٹوانے اور عذاب دینے کے لئے حوالہ کر دیا تھا۔ بھلاایسی عظیم الشان اور ناخود غرضانہ رحمت بھی کبھی دیکھنے میں آئی ہے؟ کیاکینہ اور غصہ پراس سے بھی بڑھ کو کوئی فتح یابی ہوسکتی ہے؟ اگر یسوع کی خاموشی عالی شان تھی۔ تواُس کے الفاظ بھی جب اُس نے بولنا گوارا کیا۔اُس سے کچھ کم عالی شان نہ تھے۔

۳۔

پیلاطس نے اپنے قیدی کی عظمت و بزرگی اور عالی حوصلہ کو فوراً معلوم کر لیا۔اور یہ عزم باندھ کر باہر نکلا کہ خواہ کچھ ہی ہو میں اُسے ضرور رہا کروں گا۔یہودیوں نے اُس کے چہرہ سے اس بات کو جان لیا۔اور آخر کار انہوں نے وہ آخری ہتھیار نکالا جوانہوں نے اب تک محفوظ رکھا تھا۔اور جس کا پیلاطس کو برابر خوف لگارہاتھا۔انہوں نے یہ دھمکی دی کہ وہ شاہنشاہ کے پاس اُس کی شکایت کریں گے۔ کیونکہ اُن کے ان الفاظ کا یہی مطلب تھا۔اگر تو اس کو چھوڑے دیتاہے توتو قیصر کا خیر خواہ نہیں۔جو کوئی اپنے آپ کو بادشاہ بناتاہے وہ قیصر کا مخالف ہے۔

رومی صوبہ کے حاکم کے لئے کوئی چیزاس سے زیادہ ہولناک نہ تھی۔کہ قیصر کے حضور میں اُس کے خلاف شکایت کی جائے۔اور پیلاطس کے حق میں اس قسم کی شکایت کئی وجوہات سے نہایت خوفناک ہوتی۔اس وقت شاہی تخت پر ایک ایسا شخص بیٹھا تھا۔جو بڑاہی شکی آدمی تھا۔علاوہ بریں خاص اس زمانہ میں وہ بہت ہی خوفناک ہو گیا تھا۔اُس کی جسمانی بیماری کے سبب جو عرصہ دراز کے عیش و عشرت کا نتیجہ تھی۔اُس کادل بالکل تاریک اور وحشیانہ ہورہاتھا۔درحقیقت اُس کی حالت دیوانگی سے کچھ ہی بہتر ہوگی۔اُس کامزاج بالکل سڑاہوا تھا۔اور وہ شک وشبہ اور انتقام اور ضرررسانی پر آمادہ تھا۔اور اُس کی غضب کی آگ بھڑکانے کے لئے شاید اس الزام سے بڑھ کر اور کوئی دوسراالزام ایسا برمحل(مناسب) نہ تھا۔روم میں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ کہ سارے مشرقی ممالک میں ایک آنے والے مسیح کی انتظاری لگی ہوئی ہے۔اور اگر کسی صوبہ کے حاکم کی نسبت یہ شبہ پیدا ہو کہ وہ کسی اس قسم کے دعویٰ دار کی حمایت کرتا یااُس دعوؤں سے چشم پوشی کرتاہے تواُس کاحکومت سے علیٰحدہ ہونایقینی تھا۔اور اُس کے بعد غالباًجلاوطنی یا قتل حدامکان سے خارج نہ تھا۔ قیصر کاخیر خواہ یادوست ایک ایساخطاب تھا۔جس کے حاصل کرنے کے لئے پیلاطس کی حیثیت والے لوگ سخت خواہش مند تھے۔اور کوئی ایسافعل کرناجس سے قیصر کی خیر خواہی ظاہر نہ ہو۔سب خطروں سے زیادہ خطرناک تھا۔

مگراس کے علاوہ اور باتیں بھی تھیں۔جن سے یہودیوں کی اس دھمکی کی دھار اور بھی تیز ہوگئی۔پیلاطس جانتاتھاکہ اُس کے عہدِ حکومت میں بہت سی ایسی باتیں واقع ہوئی ہیں۔جن کااُس تفتیش وتحقیقات کے نیچے آنا۔جس کاہونااس قسم کی شکایت کے بعد ضروری تھاکسی طرح سے مناسب نہیں۔یہ ایک عجیب بات ہے کہ اُس زمانہ کاایک دوسرامورخ (تاریخ لکھنے والا) بھی ایک اور موقع کاذکر کرلکھتاہے۔جب کہ پیلاطس کواسی قسم کی دھمکی دی گئی تھی۔اور وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر کرتاہے۔کہ اُسے خوف تھاکہ اگر یہودیوں کی سفارت (سفیر بھیجنا) روما کو بھیجی گئی تو ممکن ہے کہ وہ اُس کی عہدِ حکومت کی بہت سی بے ضابطگیوں۔ سخت گیریوں۔رشوتوں۔بے انصافیوں۔اور بے رحمیوں کی بھی تحقیقات کریں۔پیلاطس کی گذشتہ زندگی اس قسم کی تھی۔اور اب جب کہ وہ ایک ایساکام کرناچاہتاتھا۔جوانصاف اور انسانیت کے تقاضا کے موافق تھا۔ تواُس کی پچھلی بدکاریاں اُس کی سدراہ

(رکاوٹ)ہوئیں۔اچھے ارادوں اور شریفانہ کوششوں کی راستہ میں کوئی چیز ایسی سخت رُکاوٹ کا باعث نہیں ہوتی جیسے کہ گذشتہ گناہوں کا بوجھ۔جو لوگ انسان کی زندگی کے خفیہ اور ناقابل بیان حصّوں سے واقف ہوتے ہیں۔وہ اس واقفیت کے زور پر اُس کو مجبور کر سکتے ہیں۔کہ وہ ہر گز اُس نیک کام کو جسے وہ کرنا چاہتا ہے۔نہ کرلے۔یا وہ اس بدی وشرارت یا شرم ناک حرکت کو عمل میں لائے۔جس کا وہ اُسے حکم دیتے ہیں۔ایسی صحبتیں ہوتی ہیں۔جن میں ایک آدمی ایسے اعلیٰ اور عمدہ فقرے استعمال نہیں کر سکتا جو وہ اور لوگوں کے سامنے کیا کرتا ہے۔کیونکہ وہاں ایسے اشخاص موجود ہوتے ہیں۔جو جانتے ہیں کہ اُس کی زندگی ان الفاظ کے مخالف ہے۔وہ کون سی بات ہے جو ہمارے دلوں میں عالی خیالات کو اُٹھتے ہی دبا دیتی ہے۔جو ہمارے ہونٹوں پر شریفانہ کلمات کو روک دیتی ہے۔جو ہمارے افعال کی طاقت کو جذب کرلیتی ہے؟ کیا یہ وہ اندرونی دھیمی آواز نہیں جو کہتی ہے کہ یاد کرکہ پہلے تُو فلاں امر میں کس طرح قاصر رہا؟یہی گذشتہ گناہوں کی لعنت ہے۔یہی ہمیں وہ نیکی جو ہم کرناچاہتے ہیں نہیں کرنے دیتی۔

لیکن اگر کسی شخص نے گذشتہ بداطوار زندگی کے سبب اپنے کو اس حالت میں گرفتار کردیا ہے۔تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟ بھلا پیلاطس کو کیا کرنا چاہیے تھا؟اس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔یہ کہ انسانیت کی ساری ہمت واستقلال کو اکٹھا کرکے اور نتائج کی طرف سے بے پرواہو کر۔خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو حق اور سچائی کے مطابق عمل کرو۔اگر اپنی ضمیر کی پیروی میں ایک قدم بھی اُٹھاؤ گے۔اور اگر اقرار گناہ میں ایک کلمہ بھی کہو گے۔تو دیکھو گے کہ ایک لمحہ میں اس ظالم کی قدرت کا بند ٹوٹ جائے گا۔اور افسوس زدہ آدمی گذشتہ زمانہ کی بدکاریوں کی قید کو توڑ کر باہر کی آزادی میں نکل آئے گا

مگر افسوس! پیلاطس اس قسم کی جدوجہد کے لئے تیار نہ تھا۔صداقت کی خاطر۔اور اس دل کش اور بے گناہ مگر گمنام اور بے یار ومددگار گلیلی آدمی کی خاطر۔اور اس بات کے لئے تیار نہ تھا۔کہ اُس کی شکایت قیصر کے سامنے کی جائے۔اور وہ جلاوطنی اور افلاس میں مارا مارا پھرے۔بھلا ایسے دُنیا پرست سے اس سے بڑھ کر اور کیا اُمید ہوسکتی ہے۔وہ دُنیا کا تھا۔اور اُسی کے فیشن اور عزت کا گرویدہ (عاشق) تھا۔اُسی کے عیش وعشرت اور آرام وآسائش گویا اُس کی جان تھے۔اور جب اُس نے اپنی رعایا کی یہ دھمکی سُنی تو کھلے بندوں اپنے کو اُن کے حوالہ کردیا۔

اس طور سے یہودیوں کا جوش وخروش وار اصرار اور ہٹ آخر کار کامیاب ہوا۔پیلاطس بھی دیر تک اپنی بات پر جمارہا۔مگر آخر کار اُسے مجبوراً قدم بقدم پسپا (شکست کھانا) ہونا پڑا۔وہ حق کے مطابق عمل کرناچاہتا تھا۔وہ یسوع کا گرویدہ ہوگیا تھا۔اور اُسے اپنے ضمیر کے خلاف کرنا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔مگر اُس کی رعایا نے اُسے اُن کی شرارت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کردیا۔مگر اُس کی ناکامی کی اصلی بنیاد خود اُس کے اندر ہی تھی۔ہاں خود اُس کی دُنیا پرستی اور بے اصول زندگی میں۔جو اس موقع پر اُس کی جڑوں تک آشکارا ہوگئی ۔[1]

۴۔

اب بہت تھوڑا کرنا باقی رہ گیا تھا۔پیلاطس کے سر میں وحشت سمارہی تھی۔اور اُس کا دل جل رہا تھا۔اُس کو اُس وقت سخت زک اُٹھانی پڑی تھی۔اور اگر موقع ملتا تو وہ بہت ہی خوش ہوتا کہ اپنے مخالفوں کو بھی کسی نہ کسی طرح ذلیل کرسکے۔اب وہ تختِ عدالت پر جابیٹھا۔جو چبوترہ یا عبرانی زبان میں گبتا کہلاتا تھا۔غالباً اُس کا یہ فعل ایسا ہی تھا۔جیسا کہ انگریزی جج موت کا فتویٰ صادر کرنے سے پہلے کالی ٹوپی سر پر پہن لیتے ہیں۔اور پھر یسوع کی طرف

[1] ، یہ ایک عجیب تاریخی واقعہ ہے کہ پیلاطس آخر کار اُسی مصیبت میں گرفتار ہوگیا جس سے بچنے کے لئے اُس نے یسوع پر جور وستم روا رکھا تھا۔یسوع کے مصلوب ہونے کے تھوڑا عرصہ بعد اُس کی رعایا نے روم میں اُس کے خلاف عرضی بھیجی۔وہ واپس بلا لیا گیا۔اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔آخر کار لکھا ہے کہ اُس نے اپنی مصیبت ناک زندگی کا اپنے ہی ہاتھ سے خاتمہ کردیا۔اُس کے متعلق بہت سی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔اور کئی ایک مقام بتائے جاتے ہیں۔جہاں اُس کی بے چین رُوح بھٹکتی پھرتی ہے اور لوگوں کو ڈراتی ہے۔

اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ''اپنے بادشاہ کو دیکھو''۔ جس سے اُس کا یہ مطلب تھا کہ وہ اُس شخص کو۔ ہاں اس بے چارے خون آلودہ اور ظلم رسیدہ شخص کو درحقیقت اُن کا مسیح سمجھتا ہے۔ وہ انہیں طعن و شنیع کی برچھی سے گھائل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس امر میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ کیونکہ وہ مارے دُکھ کے چلا اُٹھے کہ ''لے جا۔ لے جا۔ اُسے صلیب دے''۔ اور وہ بولا۔ ''کیا میں تمہارے بادشاہ کو صلیب دُوں؟'' اور نہایت غضب ناک ہو کر وہ چلا اُٹھے کہ '' قیصر کے سوا ہمارا کوئی بادشاہ نہیں''۔ ایسی قوم کے قائم مقاموں کے منہ سے جنہیں لے پالک ہونے کا حق اور جلال اور چند عہد اور شریعت اور عبادت اور وعدے، حاصل تھے اس قسم کے کلمات نکلنا جائے تعجب ہے۔ یہ گویا اپنے حق ولادت کو چھوڑنا اور اپنی تقدیر کو ترک کر دینا تھا۔ پیلاطس خوب جانتا تھا۔ کہ اس طور پر اپنے آباد اجداد کی اُمیدوں کو دے ڈالنے اور اپنے فاتحوں کے حق کو تسلیم کرنے میں اُن کے مغرور دلوں کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑا ہوگا۔ مگر انہیں اس قسم کی تلخ کلامی پر مجبور کرنے میں بھی اُس کو اُس مجبوری و عجز کا بدلہ مل گیا۔ جس کا وہ خود شکار ہو رہا تھا۔ اور اُس نے اُن کے اس اقرار کو مان لیا۔

نواں باب

یہوداہ اسکریُوتی

خُداوند کی اس روبکاری (پیشی) کا بھی ایک افسوس ناک ضمیمہ (زائد پرچہ) ہے۔ جیسا ہم مذہبی عدالت کی روبکاری کے متعلق ایک اور ضمیمے کا ذکر کر چکے ہیں۔ سردار کاہن کی عدالت میں جب مسیح نے ایک عظیم الشان اقرار کیا۔ تو اُس کے ساتھ ہی مقام عدالت کے باہر عظیم انکار پطرس کی زبانی ہو رہا تھا۔ اور اُسی پیلاطس کی عدالت کی کاروائی کے ساتھ یہوداہ کی دغا بازی کا آخری فعل وقوع میں آیا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس آخری صورت میں ہم بڑی صحت کے ساتھ اُس کے وقوعہ کا وقت اور مقام صحیح صحیح نہیں بتا سکتے۔

ا۔

یہوداہ تاریخ انسانی میں ایک۔۔۔ لاینحل ہے۔ ڈانٹی شاعر اپنی مشہور نظم۔۔۔ کی روائت میں اس عالم رد و رنج کے تمام طبقوں میں سے جہاں ہر ایک شرارت علیحدہ علیحدہ قسم کی سزا ا بھگت ہی ہے۔ آخر کار اپنے رہنما کے ہمراہ طبقہ زیرین میں پہنچتا ہے۔ جو قعر جہنم ہے۔ اور جہاں سخت ترین گنہگار سزا پا رہے ہیں۔ یہ ایک جھیل ہے۔ آگ کی نہیں۔ بلکہ برف کی۔ جس کی شفاف سطح کے نیچے خوفناک حالتوں میں اُن لوگوں کی یخ بستہ صورتیں نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنے آقاؤں سے بیوفائی کی تھی۔ کیونکہ ڈانٹی کی نظر میں یہ گناہ سب گناہوں سے زیادہ قبیح و کریہ (بُرا۔ شرمناک) ہے۔ ان سب کے درمیان اپنے خوفناک اور گراں ڈیل ڈول میں وہ ''شاہنشاہ جو اس درد تکلیف کی مملکت کا حاکم ہے''۔ یعنی خود ابلیس کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اسی گناہ کی وجہ سے وہ فردوس سے نکالا گیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ دُوسری صورت یہوداہ اسکریوتی کی ہے۔ وہ شیطان کے منہ میں ہے۔ جسے وہ اپنے دانتوں میں کاٹتا اور چباتا رہتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں اس شخص کا اور اُس کے گناہ کا یہ خیال لوگوں کے درمیان مروج (رواج) تھا۔ مگر زمانہ حال میں یہ خیال دو متضاف نقطوں کے درمیان گھوم رہا ہے۔ ہمارا زمانہ اعتدال اور مذہبی تحمل اور برداشت کا زمانہ ہے۔ اور بعض اشخاص کا دل پسند مشغلہ یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ میں جو آدمی بدکرداری میں مشہور تھے۔ جہاں تک ہو سکتا ہے اُن کے نیک نامی کو بحال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرد و عورت جو صفحہ تاریخ پر مجرموں کے چبوترہ پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ انہیں وہاں سے اُتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اُن کے مقدمات کی دوبارہ تحقیقات کی جاتی ہے۔ اور انہیں قابلِ تعریف

وتکریم ثابت کیا جاتاہے۔ بعض اوقات یہ امر قرین انصاف ہوتا ہے۔ مگر اور صورتوں میں اس کو بے ہودگی کی حد تک پہنچایا جاتاہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ در حقیقت دُنیا میں کوئی بھی شخص نہیں۔ جو نہایت شریر ہو۔ سخت بدکار اور بدمعاش بھی ایسے ہیں۔ جن کے اصلی مدعا کو لوگوں نے غلط سمجھاہے۔ اور اُن لوگوں میں سے جن پر سے تاریخ کے فیصلہ کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہوداہ اسکریوتی بھی ہے۔ اُنیس صدیاں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ بنی آدم میں سب سے کمینہ انسان تھا۔ مگر ہماری صدی میں یہ دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ ایک قسم کا الوالعزم مرد تھا۔ یہ خیال اہل جو من کی ایجاد ہے۔ مگر انگریزی قوم کے سامنے پہلے ڈی کونزی نے اس خیال کو اپنی تمام فصاحت وبلاغت (خوش بیانی) سے رنگین اور دلکش بنا کر پیش کیا تھا۔

یہ بیان کیا جاتاہے کہ یہوداہ کا اصلی منشا مسیح کی گرفتاری میں اُس امر سے جواب تک سمجھا جاتا رہاہے۔ بالکل مختلف تھا۔ اُس نے روپیہ کے لالچ سے مسیح کو گرفتار نہیں کرایا تھا۔ وہ حقیر سی رقم جو آج کے حساب سے پچاس ساٹھ روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ جس کے لئے اُس نے اپنے اُستاد کو بیچ ڈالا ۔ثابت کرتی ہے کہ اُس کا اصلی مدعا کچھ اور ہی تھا۔ روایت کے ذریعہ جو خیال ہم تک پہنچاہے۔ وہ اس کے امر کے ساتھ مسیح نے اُسے منتخب کرکے اپنے بارہ شاگردوں کے زمرہ میں داخل کیا بالکل جوڑ نہیں کھاتا۔ اور نہ اس واقعہ سے میل کھاتاہے۔ کہ بعد ازاں اُس نے پچھتا کر کس طرح اپنے آپ کو ضائع کر دیا۔ بلاشبہ جو کچھ تصور اُس نے مسیح کے کام کی نسبت باندھا تھا۔ وہ محض دُنیاوی اور مادی قسم کا تھا۔ اُسے یہ اُمید تھی کہ مسیح بادشاہ ہوگا۔ اور وہ بھی اُس کے دربار میں اعلیٰ عہدہ پر مامور ہوگا۔ مگر دوسرے شاگردوں کے بھی تو ایسے ہی خیال تھے۔ اور وہ بھی آخری دم تک اسی امر کے منتظر رہے کہ مسیح اب بھی اپنے عجز وفروتنی کا بہروپ اُتار کر عنانِ سلطنت (سلطنت کی بھاگ دوڑ) کو ہاتھ میں لے لے گا۔ صرف اتنا فرق تھا۔ کہ انہوں نے اس امر کے متعلق وقت اور مکان کا فیصلہ مسیح ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ اور اُس کی کارروائی پر نکتہ چینی نہیں کرتے تھے۔ مگر یہوداہ ایسا صابر نہ تھا۔ وہ چُست وچالاک آدمی تھا اور اُسے یہ خیال پیدا ہوگیا۔ کہ مسیح کی خصلت (عادت) میں ایک قسم کی کوتاہی ہے۔ وہ بہت ہی رُوحانی آدمی ہے۔ اور دُنیا پرستی سے کوسوں دُور ہے۔ اس لئے وہ اُس کام کو۔ جس کے لئے وہ آیاہے۔ سرانجام کرنے میں ڈھیل کرتاہے۔ اُس کا سارا وقت تو مریضوں کے شفا بخشنے۔ وعظ ونصیحت کرنے اور غور وفکر میں خرچ ہوتاہے۔ یہ سب کچھ اچھا توہے۔ مگر پہلے سلطنت کا قائم ہوجانا لازمی ہے۔ مگر اس طرح تو وہ اپنا موقع کھورہاہے۔ اس کی اس ڈھیل نے اُمرا وشرفا کو اُس کے خلاف برانگیختہ (طیش میں بھراہوا) کر دیاہے۔ ایک بڑی طاقت وقدرت یعنی عوام الناس کی عقیدت۔ اب بھی اُس کی جانب ہے۔ مگر وہ اس سے کچھ بھی کام لیتا ہوا نظر نہیں آتا۔ جب کھجور کے اتور کے دن ایک بڑی جماعت۔ جو مسیح موعود کی منتظر تھی۔ بڑے جوش وخروش کے نعرے لگاتی ہوئی اُسے یروشلیم میں لے گئی۔ تو یہوداہ کو خیال گذرا کہ اب اُس کی زندگی کا اصلی مقصد پورا ہونے کو ہے۔ مگر مسیح نے اب بھی کچھ نہ کیا۔ اور جماعت مایوس وناامید ہوکر منتشر ہوگئی۔ یہوداہ کے نزدیک جو کچھ اب یسوع کے لئے ضروری تھا۔ سو یہ تھا کہ اُسے ایک ایسی حالت میں پھنسا دیا جائے۔ جس میں اُسے مجبوراً کچھ نہ کچھ کرپڑے۔ اُس میں چستی اور قوتِ فیصلہ کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ حکام کے ہاتھوں میں پڑ جائے۔ جو اس کی جان لینے کی فکر میں ہیں۔ تو وہ اس تساہل (سُستی) کو چھوڑ دے گا۔ جب وہ اُسے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ تو یقیناً وہ اُن کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اور اُس کی معجزانہ قدرت اپنے سارے زور وقوت میں ظاہر ہوگی۔ جس سے سب لوگوں میں ایک عالمگیر جوش وخروش پیدا ہوجائے گا۔ اس طور سے اُس کی سلطنت شان وشوکت کے ساتھ قائم ہوجائے گی۔ اور یقیناً وہ اُسی شاگرد کو سب سے بڑھ کر عزت واقتدار بخشے گا۔ جس کی معاملہ فہمی اور دلیرانہ کارروائی سے یہ سب کام انجام کو پہنچا۔

۲۔

لیکن اگر مذکورہ بالا بیان کو یہوداہ کی سچی تاریخ بھی سمجھیں تو بھی اس کا چال چلن الزام سے ایسا بری نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ظاہر میں نظر آتا ہے۔ ہمارا خُداوند اپنی زندگی کے اثنا میں اکثر اوقات ایسے اشخاص سے دوچار ہوتا رہا جو گو نیک غرض سے ہی کیوں نہ ہو اُس کے ارادوں اور تجاویز میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے۔ کہ یا تو پیش از وقت اُسے کسی کام کے کرنے پر مجبور کریں۔ یا جب وقت آتا تھا۔ تو اُسے کسی کام سے روک رکھیں۔ لیکن وہ اس قسم کی خلل اندازی اور دخل اور معقولات پر ہمیشہ سخت ناراضگی اور غصہ ظاہر کرتا تھا۔ خود اُس کی ماں بھی جب اُس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اس کی ناراضگی سے نہ بچی۔ اور اُس کی زندگی کا اصل اصول یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھیک۔ نہ تو افراط کے ساتھ۔ نہ تفریط کے ساتھ نہ آگے اور نہ پیچھے۔ خُدا کی مرضی کو جیسی کہ وہ ہے۔ بجالائے۔ اور جب کوئی اس میں دست اندازی کرتا تھا تو وہ اُسے شیطان کی آزمائش سمجھتا تھا۔

مگر یہ نیا مسئلہ جس کا اُوپر بیان ہوا کسوٹی پر ٹھیک نہیں اُترتا۔ پاک نوشتوں میں اس کا کہیں بھی اشارہ تک نہیں ملتا۔ بلکہ اُن میں جہاں کہیں یہوداہ کا ذکر ہوتا ہے۔ تو اس میں ایک قسم کی نفرت اور حقارت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اُس کے اس فعل کو ایک بالکل مختلف غرض پر محمول کرتے ہیں۔ وہاں صاف لکھا تھا۔ کہ یہوداہ چور تھا۔ اور وہ تھیلی میں سے جس میں سے یسوع غریبوں کو دیا کرتا اور اپنی ضروریات کو بھی پورا کرتا تھا۔ چُرا لیا کرتا تھا۔ اور یہ ایسی بدذاتی تھی کہ غالباً اکثر چور بھی اس قسم کے کام سے نفرت کرتے۔ اور وہ الفاظ جو اُس نے صدر مجلس کے سامنے کہے۔ وہ بھی ٹھیک اس خیال سے مطابقت کھاتے ہیں۔ کہ تم مجھے کیا دوگے۔ یہ امر کہ وہ بالکل تھوڑے پر راضی ہو گیا ثابت کرتا ہے۔ کہ اُس کی طبیعت پر لالچ اور طمع کس قدر غالب ہو رہا تھا۔

یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی طبیعت میں اس قسم کی گرم جوشی جیسا کہ نئے خیال والے اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ گو کہ غلط خیال ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔ جگہ پائی۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ ممکن ہے کہ مسیحی سلطنت کی اُمیدوں کی مایوسی نے اس لالچ اور طمع کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا ہو۔ اور ڈی کونزی کی تحریر اُلٹا اس خیال کو پختہ کرنے کے لئے اور اُس کی زندگی کا بھید کھولنے کے لئے بہت سی دلائل اور اشارات کے مہیا کرنے کا ذریعہ ٹھہرتی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک زمانہ میں یہوداہ کی زندگی بالکل ہونہار بروہ کے چکنے چکنے پات کی مصداق معلوم ہوتی تھی۔ یسوع جو اپنے پیروؤں کے انتخاب میں بڑا محتاط تھا۔ اُس کو کبھی انتخاب کر کے رسولوں کے دائرہ میں داخل نہ کرتا۔ اگر اُس میں اپنی ذات اور کام کے لئے وہ عقیدت اور سرگرمی نہ پاتا۔ البتہ یہ تو وہ خوب جانتا تھا۔ کہ اُس کے اغراض میں خود غرضی کی آمیزش ہے۔ مگر اُس کے سارے پیروؤں میں سے کوئی اس سے خالی نہ تھا۔ اور یہ میل اُس کی صحبت کی آگ میں صاف ہو جاتا۔

دوسرے رسولوں میں تو یہ صفائی واقع ہو گئی۔ وہ اُس کی رفاقت و صحبت میں پاک صاف ہو گئے۔ اُن کی دُنیا پرستی تو درحقیقت اُس کی زمینی زندگی کے خاتمہ تک اُن سے لگی رہی۔ مگر وہ دن بدن کم ہوتی جاتی تھی۔ اور دوسرے رشتے جو اُن کی زمینی شان و شوکت کی اُمید سے بھی زیادہ مضبوط اور سخت تھے۔ اُنہیں یقینی طور پر اُس کے معاملہ کے ساتھ وابستہ کرتے جاتے تھے۔ مگر برخلاف اس کے یہوداہ اوپر پر بالکل اس کے برعکس اثر ہوا۔ جو نیکی اُس میں تھی وہ دن بدن کم سے کمتر ہوتی گئی۔ اور آخر کار اُس کا سارا تعلق مسیح کے ساتھ فقط یہی رہ گیا کہ وہ اس معاملہ سے کیا کچھ کما سکتا تھا۔

جب پہلے اُس کے دل یہ شبہ وارد ہوا کہ جو مسیحی سلطنت کی اُمید وہ پکار رہا تھا کبھی پوری ہونے والی والی نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہوداہ کی باطنی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہو گئی۔ مگر یہ بات خاتمہ سے کوئی ایک سال پہلے واقع ہوئی جب کہ یسوع نے اپنے پیروؤں کی اس کوشش کو جو اُسے بجر پکڑ کر بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ مخالفت کی۔ جب کہ بہت سے شاگرد اُسے چھوڑ گئے اور پھر کبھی اُس کے ہمراہ نہ ہوئے۔ اُس وقت یسوع نے یہوداہ کو اُس بُری روح سے جو اُس کے دل پر قابو پاتی جاتی تھی۔ خبردار کیا اور فرمایا کہ کیا میں نے تم بارھوں کو نہیں چُنا اور تم میں سے ایک شیطان ہے۔ مگر شاگرد نے اس تنبیہ پر توجہ نہ کی۔ شاید اس وقت سے اُس نے تھیلی میں سے جو اُس کے سُپرد تھی چوری کرنی شروع کی۔ شاید اُس نے یہ سوچا کہ یسوع کی پیروی میں مجھے اور نہیں کچھ تو فائدہ حاصل ہونا چاہیے۔ اور غالباً وہ اپنی اس چوری کو اس خیال سے جائز ٹھہراتا ہوگا۔ کہ جو کچھ وہ اس وقت لے رہا ہے۔ اُس رقم سے جس کی اُسے اُمید دلائی گئی تھی۔ بہت ہی کم ہے۔ اور وہ اپنے کو ایسا شخص سمجھنے لگا ہوگا۔ کہ گویا اُس کے ساتھ سخت بدسلوکی ہوئی ہے۔

اس خفیہ گناہ کے متواتر ارتکاب سے ممکن نہ تھا۔ کہ اُس کی خصلت بگڑنے اور تنزل (زوال آنا) کرنے سے بچی رہتی۔ یسوع کبھی کبھی تنبیہ کے چند کلمات اشارتاً کہہ دیا کرتا تھا۔ مگر اُس پر اُن الفاظ کا اُلٹا اثر پڑتا تھا۔ یہوداہ کو معلوم تھا کہ یسوع اس بات کو جانتا ہے۔ اور اس لئے اُس کے دل میں اس کی طرف سے نفرت اور عداوت اور بھی بڑھتی گئی۔ یہ علامت بہت ہی ردی تھی۔ دوسرے شاگرد تو دن بدن زیادہ زیادہ اپنے اُستاد کے گرویدہ (عاشق) ہوتے جاتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ اُس نے اُن پر کس قدر احسان کئے ہیں۔ برخلاف اس کے یہوداہ کا یہ خیال دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ کہ اُس نے دھوکا کھایا ہے۔ اس لئے وہ بھی اُلٹا اُسے دھوکا دے کر اپنا بدلہ کیوں نہ اُتارے شاید مسیح کو اس تھوڑی سی رقم کے عوض بیچ ڈالنے میں ایک قسم کی تحقیر بھی مقصود ہو کہ وہ اُسے بالکل خفیف (معمولی) سمجھتا ہے۔

ایک سے زیادہ انجیل نویسوں نے اُس کی اس دغابازی کو اُس واقع کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جب کہ مریم نے بیش قیمت عطر خُداوند یسوع کے پاؤں پر ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دل کش اور محبت آمیز حرکت نے اُس کے دل کی ساری بدی کو تحریک دے کر اس امر پر آمادہ کیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے کر گزرے۔ اُس نے اپنے غصے کا اظہار تو ان الفاظ میں کیا یہ روپیہ غریبوں کو دیا جانا چاہیے تھا۔ مگر اصل مقصد اور ہی تھا۔ یہ ایک بڑی رقم تھی۔ اور اگر وہ اُس کی تھیلی میں پڑتے تو اس کا ایک بڑا حصّہ اُس کے ہاتھ لگتا۔ لیکن غالباً اس وقت اور بھی باتیں تھیں۔ جن سے اُس کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا ہوگا۔ اُس کو یہ ضیافتیں اور عطر ملنا ایسے وقت میں جب کہ مسیح کی قسمت کا فیصلہ نزدیک تھا۔ محض ایک حماقت معلوم ہوتی ہوگی۔ اور وہ اس امر کو اپنے نزدیک قابلِ حقارت سمجھتا ہوگا۔ اُس پر یہ ظاہر تھا۔ کہ معاملہ ختم ہو چکا۔ ایک سرکردہ آدمی جو ایسے موقع پر اس طور سے آوارہ و سرگردان پڑا پھرتا اور بے پروائی جتاتا ہے۔ اُس کے دن پورے ہو چکے۔ اب ایسے ڈوبتے بیڑے میں سے نکل کھڑے ہونا ہی بہتر ہے۔ مگر نکلیں بھی تو اس طور سے کہ انتقام بھی مل جائے اور روپیہ بھی ہاتھ لگے۔

اس طور سے اُس کے جذبات جوش مارتے اور زور آور ہوتے گئے۔ لیکن درحقیقت حرص و طمع (لالچ) بجائے خود بھی ایک نہایت پُر زور چیز ہے۔ منبروں (پلپٹ) پر سے شاید اُس کے متعلق بہت کم وعظ سنائی دیتے ہیں۔ لیکن پاک نوشتوں اور تاریخ عالم میں اُسے ایک بڑی بلند جگہ دی گئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ جتنی خرابیاں اور بربادیاں دُنیا میں واقع ہوتی ہیں۔ اُن میں اس حرص و طمع سے بڑھ کر کسی اور چیز کو بھی دخل ہے۔ طمع سارے احکام کو توڑتا ہے۔ قاتل کے ہاتھ میں اکثر یہ طمع تلوار دیتا ہے۔ اس طمع نے دُنیا کے ہر زمانہ اور ہر ملک کی منڈی اور تجارت کے کاروبار کو ایک جھوٹ اور فریب کا بازار بنا رکھا تھا۔ مردوں کے جسم اور عورتوں کے دل اسی چاندی سونے کے عوض بکتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ بڑی بڑی شرارتیں زمانہً بعد زمانہً جاری رہتی ہیں۔ اور ایسے ایسے فعل جن کی تائید میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا سوسائٹی کی منظوری سے برابر جاری رہتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ اُن

میں روپیہ کو دخل ہے۔ طمع شیطانی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اس بات کو یاد کر کے کہ یہی گناہ تھا۔ جس نے یہوداہ کا بیڑا ڈبو یا۔ ممکن ہے کہ ہم اُسے اپنے دلوں سے باہر رکھنے میں کامیاب ہوں۔

۳۔

بعض لوگ یہوداہ کی توبہ کو اُس کی رُوح کی عظمت کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ یقیناً یہ اُس نیکی وخوبی کا ثبوت تو ضرور ہے۔ جو کسی زمانہ میں اُسے حاصل تھی۔ کیونکہ گناہ کی تاریکی کو محسوس کرنے کے لئے نیکی کے چنگارے کا ہونا لازم ہے۔اور جس قدر ضمیر کو زیادہ روشنی ملی ہو گی۔ اُسی قدر ضمیر کے خلاف کرنے کے بعد آدمی کو سخت درد وتکلیف محسوس ہو گی۔ جو لوگ کسی درجہ تک مسیح کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ وہ کبھی پھر اُس حالت کو جو اُس کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے بھول نہیں سکتے۔اور مذہب اگر انسان کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوتا تو روح کی بربادی کی حالت میں نہایت بے رحم دُکھ دینے والا ثابت ہوتا ہے۔

یہ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہوداہ کے دل میں یہ معکوس (ٹیڑھی) تبدیلی کس ذلت سے شروع ہوئی۔ یسوع کی تحقیقات میں کئی ایک باتیں واقع ہوئیں جن سے اُس کے خیالات پر بہت کچھ اثر پیدا ہوا ہو گا۔ مگر آخر کار ضمیر کی وہ بدلہ لینے والی طاقتیں بالکل جاگ اُٹھیں۔ جن کے بیان سے تمام افسوس ناک ناٹک اور تاریخی قصے کہانیاں بھری پڑی ہیں۔اور جس کا عمدہ نمونہ بائبل میں قائن ہے۔ جو اپنے بھائی کے خون کی چیخوں کے آگے آگے بھاگتا پھرتا ہے۔ جس کا نمونہ یونانی لٹریچر میں خوفناک یومینانڈس ہیں۔ جن کی شکل بھیانک اور آنکھیں خون آلودہ ہیں اور بے رحمانہ اپنے شکار کے پیچھے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ جس کی تصور شیکسپیر کے مشہور ڈراموں میکبتھ اور رچرڈ سوم میں نہایت موثر طور پر کھینچی گئی ہے۔ اب اُس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کسی طرح وہ سب جو اُس کے ہاتھوں ہوا ہے نہ ہوا ہوتا۔ روپیہ جس پر اُس کا دل لگا ہوا تھا۔ اب اُس کی قوت واہمہ کے سامنے سانپ اور بچھو نظر آنے لگا۔اور ہر ایک سکہ ایک آنکھ کی طرح دکھائی دینے لگا جس میں سے ابدی انصاف اُس کے جرم پر نظر کرتا معلوم ہوتا تھا۔اور زبان حال سے انتقام کے لئے پکارتا تھا۔ جیسے کہ قاتل ایک پوشیدہ کشش کے باعث پھر اُسی مقام کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ جہاں اُس کا مقتول ایک پوشیدہ کشش کے باعث پھر اُسی مقام کی طرف کھنچا جاتا ہے۔۔ جہاں اُس کا مقتول پڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی مقام کو واپس گیا جہاں اُس کی نمک حرامی کا فعل عمل میں آیا تھا۔ اور اُن لوگوں سے رُوبرو ہو کر جنہوں نے اُسے اس کام کے لئے استعمال کیا تھا۔ اُس نے روپیہ اُن کو واپس دے دیا اور ساتھ ہی بڑے جوش سے یہ اقرار بھی کیا۔ کہ میں نے بے قصور کو قتل کے لئے پکڑوایا۔ مگر وہ بہت بڑے تسلی دینے والوں کے پاس آیا تھا۔اور وہ بڑے حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ ’’ہمیں کیا؟۔ تو جان ‘‘۔ جب وہ پہلے آیا تھا تو انہوں نے اُس کی بڑی خاطر وتواضع کی تھی۔ لیکن اب وہ اپنا کام اُس سے نکال چکے تھے۔ اس لئے اُسے حقارت کے ساتھ الگ ڈال دیا۔ اب وہ کمبخت آدمی اپنے گناہ کے شرکا کے سامنے سے بھاگ نکلا۔ لیکن وہ اُس روپیہ کو اور زیادہ عرصہ تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اُس کے ہاتھ میں دہکتے انگارے کی مانند معلوم ہوتا تھا۔اور اس لئے وہاں سے نکلنے کے پیشتر اُس نے وہ روپیہ اُن کے سامنے پھینک دیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ واقع ہیکل کے اُس حصّہ میں واقع ہوا۔ جہاں صرف کاہن لوگ جا سکتے تھے۔ اس لئے یا تو وہ دوڑ کر ممنوع دروازہ میں سے آگے نکل گیا ہو گا۔ یا اُس نے کھلے دروازہ میں سے باہر ہی سے روپیہ پھینک دیا ہو گا۔ وہ صرف اُس روپیہ سے پیچھا چُھڑانے کا ہی خواہش مند نہ تھا۔ بلکہ اُس کے دل میں پُرزور خواہش یہ تھی۔ کہ کاہنوں کے پاس بھی اُن کے گناہ کا حصّہ چھوڑ جائے۔

تب وہ بھاگ کر ہیکل سے باہر نکل گیا مگر وہ کہاں جارہا تھا؟ کاش کہ اُس کے اندر کوئی چیز ہوتی جو اُسے مسیح کے پاس بھاگ جانے کی تحریک کرتی۔ کاش کہ وہ سب رُکاوٹوں اور قاعدوں پر پانی پھیر کر اُسی کے پاس جہاں کہیں وہ مل سکتا تھا جاتا اور اپنے کو اُس کے پاؤں پر ڈال دیتا! ایسا کرنے میں اگر سپاہی اُس کے ٹکڑے بھی کر ڈالتے تو بھی کیا پرواتھی؟ تب تو وہ شہید توبہ سمجھا جاتا۔ اور اُسی دن مسیح کے ساتھ فردوس میں ہوتا۔ یہوداہ اپنے گناہ سے تائب تو ہوا۔ اُس کا اقرار بھی کیا۔ بدکرداری کی اُجرت بھی اپنے سے دُور پھینک دی۔ مگر اُس کی توبہ میں اُس عنصر یا جز کی کمی تھی۔ جو سب سے زیادہ ضروری تھی۔ وہ خُدا کی طرف نہ پھرا۔ سچی توبہ فقط اس کا نام نہیں کہ ضمیر خوف زدہ ہو کر اپنے گناہ سے ڈرے اور مضطرب و پریشان ہو جائے۔ بلکہ سچی توبہ بدی کو چھوڑ دینا ہے۔ اس لئے کہ مسیح نے غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ وہ نہ صرف گناہ سے پھرتا بلکہ خُدا کی طرف پھرتا بھی ہے۔ اس میں نہ صرف خوف بلکہ ایمان بھی داخل ہے۔

۴۔

یہوداہ کے انجام کو بھی بعض لوگ اُس کے حق میں اچھا خیال رکھنے کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ خودکشی کے فعل کو اکثر اوقات ایک قسم کی اُلوالعزمی (مستقل مزاجی) کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ اور اس رومی طریق سے زندگی سے باہر قدم رکھنے کو بعض مسیحی بھی۔ باوجود یکہ یہ مذہبی طور پر گناہ ہے۔ ایک غیر معمولی عالی حوصلگی اور مستقل مزاجی کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ درحقیقت خودکشی کو بالکل اس کے برعکس سمجھنا چاہیے۔ سوائے اُن اشخاص کے جن کی عقل و دانش کو مراق (جنون) اور افسردہ دلی نے کھو دیا ہے۔ اس فعل کو انسان کے تمام بُرے افعال میں سے نہایت ہی قابلِ تحقیر سمجھنا چاہیے۔ اس کے ذریعہ سے انسان گویا زندگی کے بوجھ اور ذمہ داریوں سے خلاصی ڈھونڈتا ہے۔ اور یہ بوجھ اور ذمہ داریاں نہ صرف دوسروں کے سر پر چھوڑ جاتا ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ ہی شرم و بے عزتی کی ناقابلِ برداشت وارثت بھی اُس کے پس ماندوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ مذہبی پہلو سے تو خودکشی اور بھی خراب اور نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ غیر مسیحی مصنفوں کی رائے میں بھی خودکشی کرنے والا نہ صرف اُس جگہ کو جہاں تقدیر نے اُسے متعین کیا تھا۔ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے وہ خُدا کی صفات اور اُس کی ہستی کا بھی انکار کرتا ہے۔ وہ اُس کی صفات سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ سچ مچ اُس کی رحمت و محبت پر یقین رکھتا تو وہ ضرور اُس کی طرف بھاگتا۔ نہ اُس سے دُور۔ وہ اُس کی ہستی کا منکر ہے۔ کیونکہ جو شخص یقین رکھتا ہے کہ اُسے اس پردۂ حیات کی دوسری طرف ضرور خُدا کے رُوبرو حاضر ہونا ہوگا۔ وہ اپنے کو اس ناواجب طریق سے اُس کی حضوری میں ہرگز نہ پھینکتا۔

یہوداہ کی خودکشی کا طریق بھی بالکل کمینہ تھا۔ پھانسی یہودیوں کے درمیان ہرگز موت کا معمولی طریق معلوم نہیں ہوتا۔ سارے عہدِ عتیق میں اس قسم کا صرف ایک ہی واقع بیان ہوا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ یہ بھی اُس شخص کے متعلق جسے اُس کی زندگی کے بُرے فعل کے لحاظ سے بالکل یہوداہ کا نمونہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اخی توفل نے جو حضرت داؤد کا دوست اور صلاح کار تھا۔ اپنے آقا سے نمک حرامی کی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے یہوداہ نے مسیح سے۔ اور اُس کا انجام بھی ویسا ہی بُرا ہوا۔

علاوہ بریں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہوداہ کی پھانسی کے ساتھ اور بھی غیر معمولی دہشت ناک بات واقع ہوئی۔ جس کا کتاب اعمال کے شروع میں ذکر ہے۔ وہاں جو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اُن سے ٹھیک ٹھیک مطلب نہیں کھلتا۔ مگر غالباً وہ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اس خودکشی کے ساتھ ایک اور حادثہ بھی واقع ہوا۔ جس کے سبب اُس کا جسم جو ایک گھاٹی کے اُوپر لٹکا ہوا تھا۔ دفعتہً (اچانک) رسّی کے ٹوٹ جانے سے نیچے گر کر ایسا کچلا گیا۔ کہ جو کوئی اُس پر نظر کرتا تھا۔ اُسے دیکھ کر خوف وہیبت دامنگیر ہوتی تھی۔

اور اُس کے انجام بد کا خیال قدیم مسیحیوں کے ذہن میں اس امر سے اور بھی مضبوط ہو گیا۔ کہ وہ روپیہ جس کے عوض اُس نے مسیح کو بیچ ڈالا تھا آخر کار ایک قبرستان کے خریدنے میں خرچ کیا گیا۔ جس میں اجنبی اور مسافر لوگ گاڑے جاتے تھے۔ کاہنوں نے اگرچہ روپیہ فرش پر سے۔ جہاں یہوداہ اُسے پھینک گیا تھا۔ اُٹھالیا۔ مگر اُن کی پابندی شرع نے انہیں یہ اجازت نہ دی کہ اُسے پھر ہیکل کے پاک خزانہ میں داخل کیا جائے۔ اس لئے اُس روپیہ کو اس اس مقصد کے لئے خرچ کر ڈالا لوگوں نے یہ حال سُن کر اُس جگہ کا نام خون کا کھیت رکھ دیا اور اس طور سے یہ قبرستان گویا اُس نمک حرام کی یادگار کے طور پر ہو گیا۔ جس میں سب سے پہلے وہ خود ہی گاڑا گیا۔

ساری دُنیا کا اس امر پر اتفاق کرتی ہے کہ یہوداہ سب سے بڑا گنہگار تھا۔ لیکن اُس پر یہ فتویٰ لگانے میں وہ اپنے اختیار سے آگے نکل گئے ہیں۔ انسان اپنے بھائی کے قاضی بننے کا حق نہیں رکھتا۔ یہوداہ نے جس بڑے جذبے کے تابع ہو کر یہ فعل کیا وہ نہایت کمینہ تھا۔ ڈانٹے کا یہ خیال بھی صحیح ہو تو ہو کہ نمک حرامی نہایت ہی سخت گناہ ہے۔ اور مسیح کی اعلیٰ اور بے مثال عظمت کے سبب اُس کے نقصان پہنچانے والے پر بھی ایک بے مثل داغ لگ گیا ہے۔ مگر اُس کے فعل کا منشاء (مقصد) ہم سے مخفی (چھپا ہوا) ہے۔ اور ہر ایک فعل کی تاریخ ایسی پیچ در پیچ ہوتی ہے۔ کہ ہم راستی کے ساتھ یہ ہر گز نہیں کر سکتے کہ کون شخص سب سے بڑھ کر سیاہ کار ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جن کو لوگ اولیاءاللہ اور نیک ترین بندگانِ خُدا سمجھتے ہیں وہ آخری دن کو جب کہ ہر ایک شخص کو اُس کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اسی اعلیٰ پایہ کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ اور اسی طرح کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گنہگاروں کے حق میں بھی عام رائے کا فتویٰ آخر کار بالکل صحیح ثابت ہو گا۔ یہوداہ کے متعلق دو باتوں کو مد نظر رکھنا ہمارا فرض ہے۔ اوّل تو یہ کہ اُس کے گناہ کو ایسا خفیف (معمولی) ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں جس سے وہ طبعی اور صحیح نفرت جو اُس گناہ کے خلاف ہمارے دلوں میں پیدا ہونی چاہیے۔ کمزور ہو جائے۔ دوسرے اُسے ایسا گنہگار نہ سمجھیں کہ وہ اس گنہگاری میں بالکل یکتا و بے مثل ثابت ہو یا یہ کہ اُس کے گناہ کی ماہیت کوئی ایسی مختلف اور خاص قسم کی ہے۔ جس کے سبب سے وہ ہمارے لئے مثال نہیں ٹھہر سکتا۔ باقی کے لئے ہم صرف اُس فتویٰ کو دُہرا سکتے ہیں۔ جو بالکل بجا اور بر محل (مناسب) ہے۔ اور جس میں کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پطرس کے ان الفاظ میں ہے کہ وہ "اپنی جگہ گیا"۔

دسواں باب

راہِ غم

ہم اب اپنی کتاب کا پہلا حصّہ ختم کر چکے۔ ہم نے یسوع کی تحقیقات اور مقدمہ کا کل حال بیان کر دیا۔ اور اب ہم دوسرے حصّہ کی طرف جو زیادہ دردناک ہے۔ یعنی اُس کی موت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تحقیقات کی نسبت سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ عدل وانصاف کی مسخری تھی۔ دینی عدالت تو مقدمہ پیش ہونے سے پہلے ہی اُس پر حکم لگا چکی تھی۔ مگر حاکم فوجداری نے سرے ہی سے عدل وانصاف کا خون کر دیا۔ کیونکہ اُس نے محض اپنی خود غرضی اور پالیسی کا لحاظ کر کے ایک شخص کو جس کی بے گناہی کا وہ خود مقر (اقرار کرنے والا) تھا قتل کے لئے حوالہ کر دیا۔ لیکن خیر اس ساری تحقیقات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اب صرف اس ظالمانہ فتویٰ کا عمل درآمد باقی رہ گیا۔ اب پیلاطس کی عدالت دن بھر کے لئے بند ہو گئی۔ لوگ اُس کے محل کی نواحی سے چلے گئے۔ اور موت کا جلوس تیار ہونے لگا۔

ا۔

جن لوگوں پر آج کل سزائے موت کا فتویٰ صادر ہوتا ہے انہیں ابدیت کے لئے تیاری کرنے کے لئے چندروز کی مہلت دی جایا کرتی ہے۔ مگر یسوع کو اُسی روز جب کہ اُس پر فتویٰ لگایا گیا صلیب پر کھنچا گیا۔ روم میں بھی اُس وقت ایک رحیمانہ قانون جاری تھا۔ جسکی رُو سے سزائے موت اور اُس کے عمل درآمد کے مابین دس دن کا وقفہ دیا جاتا تھا۔ لیکن یا تو اس قانون کا بیرونی صوبہ جات میں میں رواج نہ تھا یا یہ کہ یسوع کو اس قانون کی حدود سے باہر سمجھا گیا تھا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ ہونے کا دعویدار تھا۔ بہر صورت اُسے فی الفور عدالت گاہ سے سیدھے قتل گاہ کو لے گئے۔ اور اُسے تیاری یا دوستوں کو الوداع کہنے کا بھی موقع نہ دیا۔

اس فتویٰ کے جاری کرنے والے پیلاطس کے سپاہی تھے۔ مقدس یوحنا کی طرزِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا پیلاطس نے اُسے یہودیوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ اور انہوں نے سزائے موت کا عمل درآمد کیا۔ مگر اُس کے کلام کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس معاملہ کی اخلاقی ذمہ داری یہودیوں کے سر پر تھی۔ انہوں نے ہر طور سے یہ ظاہر کیا کہ یہ سب کچھ جو ہوا ہے انہیں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ وہ یسوع کی موت پر ایسے تلُے ہوئے تھے۔ کہ انہوں نے اس کام کو اُن لوگوں کے ہاتھوں میں بھی نہ چھوڑا جن کا یہ منصبی فرض تھا۔ بلکہ وہ جلادوں کے ہمراہ گئے۔ اور دیکھتے رہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کو مناسب طور پر ادا کرتے ہیں۔ مگر اصل کام در حقیقت رُومی سپاہیوں نے ایک صوبہ دار کی نگرانی میں سرانجام دیا۔

اس ملک میں اب پھانسی وغیرہ کی سزا بالکل علیحدہ جگہ میں عموماً قید خانہ کی دیواروں کے اندر ہی عمل میں آتی ہے۔ لیکن ابھی بہت سال کا عرصہ نہیں گذرا جب کہ عوام الناس کے سامنے پھانسی دی جایا کرتی تھی۔ اور اُس سے بھی پہلے یہ دستور تھا۔ کہ جب کبھی کسی کو پھانسی ہوتی تھی۔ تو پہلے اُسے شہر کے سارے گلی کوچوں میں پھراتے تھے۔ تاکہ جہاں تک ممکن ہو سب لوگ اُسے دیکھیں اور اُس پر نفرین (لعنت ملامت) بھیجیں۔ یسوع کو بھی اسی طور سے مقتل (قتل گاہ) کی طرف لے گئے۔ رومیوں اور نیز یہودیوں کے درمیان بھی سزائے قتل شہر کے دروازہ کے باہر عمل میں آتی تھی۔ قدیم روائت کے مطابق جو مقام یسوع کے قتل کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور جس پر اب مزار مقدس کی کلیسیاء تعمیر ہے۔ شہر کی موجودہ فصیل کے اندر واقع ہے۔ لیکن جو لوگ اس روایت کو صحیح مانتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اُس زمانہ میں یہ مقام شہر کے باہر واقع تھا۔ مگر یہ روایت مشتبہ (جس پر شک ہو) ہے۔ اور یہ بات بھی تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ متصل کون سے دروازہ کے باہر واقع تھا۔ کلوری یا گلگتا کے ناموں سے ظاہر ہے۔ کہ یہ مقام غالباً کھوپڑی کی شکل تھا۔ مگر اس خیال کے لئے کہ وہ مقام اس قدر بلند تھا۔ کہ اُسے کلوری کی پہاڑی کہنا درست ہو۔ کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ در حقیقت اُس شکل و جسامت کی کوئی پہاڑی یروشلیم کے گردونواح میں نہیں پائی جاتی۔ جس کا تصور عوام الناس نے باندھ رکھا ہے۔ زمانہ حال کے یروشلیم میں ایک کوچہ ہے۔ جو وایاڈولوروسا یعنی راہِ غم سے مشہور ہے۔ جس میں سے مقتل کو جاتے ہوئے مسیح کا گذرنا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہ امر بھی مشتبہ ہے۔ قدیم رومتہ الکبریٰ کی طرح قدیم یروشلیم بھی صدہا سال کی مٹی کے نیچے دبا پڑا ہے۔ جس مقام پر مقدمہ کی تحقیقات ہوئی۔ وہاں سے قتل گاہ کوئی ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور یہ ممکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ یسوع کو اس قدر یا اس سے زیادہ فاصلہ پر جانا پڑا ہوگا۔ اور راستہ میں لوگ جلوس کو دیکھ کر جوق در جوق جمع ہوتے گئے ہوں گے۔

ایک اور بے عزتی جو صلیبی موت کے ساتھ وابستہ تھی یہ تھی کہ مجرم کو وہ صلیب جس پر وہ لٹکنے کو تھا اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر جائے قتل تک لے جانی پڑتی تھی۔ تصویروں میں یسوع کی صلیب اتنی بڑی بنائی جاتی ہے۔ جس کے اُٹھا کر لے جان کے لئے کئی ایک آدمیوں کی ضرورت پڑتی۔ مگر اصل میں وہ

اس سے بالکل مختلف شکل کی ہو گی اُس کی لمبائی غالباً اُس کے جسم کی لمبائی سے کچھ ہی زیادہ ہو گی۔ اور اُس میں اتنی ہی لکڑی لگی ہو گی جو ایک آدمی کے جسم کو اُٹھانے کے لئے کافی ہو۔ لیکن تو بھی وہ بڑی بوجھل ہو گی۔ اور اُس پیٹھ پر جہاں پہلے ہی اتنے کوڑے لگ چکے تھے۔ اُسے اُٹھانا نہایت ہی دشوار اور باعث دردو تکلیف ہو گا۔

اور اگر اُس کے سر پر کانٹوں کا تاج اب بھی دھرا تھا۔ تو وہ بھی سخت تکلیف کا باعث ہو گا۔ لکھا ہے کہ پیشتر اس کے کہ اُسے قتل گاہ کو لے گئے۔ ارغوانی پوشاک جو مسخری کے طور پہنائی گئی تھی۔ اُتار کر اُس کے اپنے کپڑے اُسے پہنائے گئے تھے۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کانٹوں کا تاج بھی اُٹھا دیا گیا تھا۔ مگر سب سے سخت اور ناقابلِ برداشت شرم و بے عزتی تھی۔ آدمی سے اُس کی موت کا آلہ اُٹھوانے میں ایک قسم کا سخت وحشی پن تھا۔ اور ہم قدیم لٹریچر میں مصنفین کو اس قسم کے طریق سزا پر بار بار وحشیانہ تمسخر کرتے اور مضحکہ اُڑاتے دیکھتے ہیں۔

اناجیل سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ کہ یسوع کی قوت واہمہ (سوچنے کی طاقت) پہلے ہی سے اس قسم کی موت کا تصور باندھتی رہی تھی۔ خاتمہ سے بہت پہلے اُس نے پیشن گوئی کی تھی۔ کہ اُسے کس قسم کی موت سے مرنا ہو گا۔ مگر اس قسم پیشن گوئیوں سے بھی پہلے وہ ان قربانیوں کو جو اُس کے پیرو ہونے کے لئے کرنی ضروری ہوں گی۔ صلیب اُٹھانے سے تشبیہ دے چکا تھا۔ گویا کہ یہ سزا ہر ایک قسم کے دُکھ اور تکلیف اور بے حرمتی کی آخری حد تھی۔ کیا اُس نے ان لفظوں کو محض اس سبب سے استعمال کیا کہ جہاں تک اُسے دُنیا کی باتوں کا علم تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سزا انسانی زندگی میں سب سے زیادہ شرم ناک ہے؟ یا کیا اس قسم کے الفاظ کے استعمال کی وجہ وہ علمِ غیب تھا۔ جس کے ذریعہ سے اُسے معلوم تھا۔ کہ ایک دن یہی سزا خود اُس پر وارد ہونے والی ہے؟ کچھ شبہ نہیں کہ آخری وجہ درست ہے۔ اب وہ گھڑی جس کا پہلے سے تصور باندھ رکھا تھا۔ آپہنچی اور کمزوری اور لاچاری کی حالت میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے جو اُس پر نفرین (لعنت ملامت) کر رہے تھے۔ اُسے یہ صلیب اُٹھانی پڑی۔ ایک شریف مزاج آدمی کے لئے شرم سے بڑھ کر کوئی سخت مصیبت نہیں۔ اُس کے لئے ہنسی و تمسخر کا تختہ مشق بنایا جانا نہایت شاق (مشکل۔ دشوار) ہوتا ہے۔ یسوع میں وہ عظمت و صلاحیت تھی۔ جس کی وجہ سے کسی کے آگے سر جھکانے یا دب نکلنے کی ضرورت کا محتاج نہ تھا۔ وہ لوگوں سے جس قدر محبت رکھتا اور اُن کی عزت کرتا تھا۔ کہ ممکن نہ تھا۔ کہ اُن سے محبت و عزت کا طالب نہ ہو۔ وہ اچھے دن دیکھ چکا تھا۔ جب کہ سب لوگ اُس کی عزت کرتے اور اُسے عزیز رکھتے تھے۔ لیکن اب اُس کی جان لوگوں کی ملامت و تحقیر سے معمور ہو رہی تھی۔ اور وہ زبور کے ان الفاظ کو اپنے حق میں لگا سکتا تھا۔ کہ "میں تو ایک کیڑا ہوں نہ انسان آدمیوں کا ننگ ہوں اور قوم کی عار"۔

اب مسیح کی عار و ننگ (شرمندگی) سب جلال میں بدل گئی ہے۔ اور اس بات کا متحقق (تحقیق) کرنا نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دراصل کس قدر گہری ذلت تھی۔ جو اُسے برداشت کرنی پڑی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت کا ثبوت ہو گا۔ کہ دو چوروں کو بھی اُس کے ہمراہ صلیب پر کھینچنے کے لئے بھیجا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بات پیلاطس نے خاص کر یہودیوں کو ذلیل کرنے کو شش کی تھی۔ جس سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ وہ اُس شخص کو جو اُس کے نزدیک اُن کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ دار تھا۔ کیسی حقارت سے دیکھتا ہے۔ مگر میرے نزدیک زیادہ اغلب (یقینی) بات یہ ہے کہ رومی حکام کی نظر میں مسیح کی اُن قیدیوں کی نسبت جو آئے دن ان سپائیوں کے ہاتھ سے سزایاب ہوتے رہتے تھے۔ کچھ بڑی عزت نہ تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پیلاطس کو اس معاملہ میں کچھ زیادہ دلچسپی تو تھی۔ اور وہ اس مقدمہ کے فیصلہ کرنے میں کسی قدر اُلجھاؤ میں بھی پڑا رہا۔ لیکن پھر بھی یسوع ایک معمولی یہودی تھا۔ جس کی مانند سینکڑوں اُس کے ہاتھوں میں سے نکلتے رہے تھے۔ اور اُس کا صلیب دیا جانا بھی دوسرے مجرموں کے مقدمہ سے کچھ بڑھ کر وقعت (حیثیت) نہیں رکھتا تھا۔ اس طور سے تینوں قیدی اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے ہوئے اکٹھے محل کے دروازہ سے نکلے اور راہِ غم پر روانہ ہوئے۔

۲۔

لیکن اگرچہ وہ پیلاطس کے محل میں سے اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے نکلا۔ مگر وہ اُسے بہت دُور تک نہ لے جا سکا۔ یا تو وہ اُس کے بوجھ کے مارے دب کر زمین پر بیٹھ گیا۔ یا وہ ایسی سُست قدمی سے چل رہا تھا۔ کہ سپاہیوں نے دیری کے خیال سے یہ مناسب سمجھا کہ بوجھ اُس کے کندھے پر سے اُٹھا لیا جائے۔ اُس قسم کی نقاہت اور ماندگی کے لئے کوڑوں کی سختی ہی کافی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ ہمیں ساری رات کی بے خوابی اور فکر اور بد سلوکی کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ اور اس سے پہلے گتسمنی کی جانکنی بھی واقع ہوئی تھی۔ اس لئے جائے تعجب (حیرانگی) نہیں کہ اُس کی کمزوری اس درجہ کو پہنچ گئی تھی۔ کہ ایسا بوجھ اُٹھائے ہوئے آگے بڑھنا اُس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ ایک یا دو سپاہی اُسے اس بوجھ سے خلاصی دے سکتے تھے۔ مگر شرارت اور تمسخراب بھی اُن پر سوار تھا۔ اور انہوں نے ایک آدمی کو جو اتفاقاً اس راہ سے گذر رہا تھا۔ بے گاری پکڑ کر اس خدمت میں لگا دیا۔ وہ انہیں باہر سے شہر کے پھاٹک کے اندر آتا ہوا ملا۔ اور اس امر میں وہ ایک جنگی قانون یا رسم کے مطابق عمل کر رہے تھے۔

اس آدمی کو تو یہ بات نہایت تکلیف دہ اور شرمناک معلوم دی ہو گی۔ غالباً وہ کسی ضروری کام پر جا رہا تھا جو اس وجہ ملتوی کرنا پڑا۔ اُس کے بال بچے اور دوست آشنا اُس کے منتظر بیٹھے ہوں گے۔ مگر وہ راستہ میں روک لیا گیا۔ اس موت کے آلہ کو چھونا اُس کے لئے ایسی ہی قابل نفرت بات ہو گی۔ جیسے ہم پھانسی کی رسی کو چُھوتے جھجکتے ہیں۔ شاید اُس وقت اُس کو یہ بات اور بھی بُری معلوم ہوئی ہو گی۔ کیونکہ یہ عیدِ فسح کا وقت تھا۔ اور اس کے چھونے سے وہ ناپاک ہو گیا۔ مگر وہ اُس وقت سپاہیوں کی ظرافت (ہنسی مذاق) کا تختۂ مشق (کسی کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا) بن رہا تھا۔ جب وہ چوروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہو گا تو معلوم ہوتا ہو گا کہ گویا اُسے بھی صلیب پر کھینچنے کو لے جا رہے ہیں۔

یہ اُس صلیب اُٹھانے کی جس کے لئے مسیح کے پیرؤں کو بلایا گیا ہے۔ ایک عمدہ تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ہم جب کبھی کسی قسم کی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُسے صلیب کے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ اور بلاشبہ تکلیف خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو مسیح کے نام سے اس کا اُٹھانا ایسا دوبھر نہیں معلوم ہوتا۔ مگر صحیح طور پر وہی دُکھ یا تکلیف مسیح کی صلیب کہلانے کی مستحق ہے جو اُس کا اقرار کرنے یا اُس کی خدمت کی بجاآوری میں برداشت کرنی پڑی۔ جب کوئی شخص کسی مسیحی اُصول کی بنا پر کسی بات پر جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اُس سے جو کچھ ذلت اور شرمندگی اُس پر وارد ہو اُس کی کچھ پروا نہیں کرتا تو اُسے مسیح کی صلیب اُٹھانا کہہ سکتے ہیں۔ جو تکلیف تمہیں مسیح کے نام سے کسی کے ساتھ کلام کرنے میں محسوس ہو۔ یا مسیح کی خدمت میں جو وقت یا آسائش تمہیں قربان کرنی پڑے۔ یا اپنے مال و دولت کو مسیح کی سلطنت کے لئے اپنے وطن اور دوسرے ممالک میں پھیلنے کے لئے دے ڈالنے سے جو خود انکاری کرنی پڑے۔ یا جو لعنت ملامت تمہیں ایسے معاملات میں حصّہ لینے یا اشخاص کے ساتھ شریک ہونے میں جنہیں تم مسیح کے طرف دار سمجھتے ہو اُٹھانی پڑے۔ ان سب باتوں کو مسیح کی صلیب کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس میں تکلیف بے آرامی اور قربانی تو ضرور ہے۔ اس کی برداشت کرنے میں شاید شمعون کی طرح کُڑھنا پڑے یا خود مسیح کی طرح اُس کے بوجھ سے گر جائیں۔ وہ بہت دردناک۔ بھیانک اور شرمناک تو ہو گی۔ مگر مسیح کا کوئی سچا شاگرد اس سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ہمارا آقا فرماتا ہے۔ کہ جو شخص اپنی صلیب اُٹھا کر میری پیروی نہیں کرتا میرے لائق نہیں۔

۳۔

جو بات شمعون کو صلیب اُٹھانے کا نا کامل نمونہ ٹھہراتی ہے۔ سو یہ ہے کہ ہمیں تحقیق نہیں کہ آیا اُس نے اُسے برضا و رغبت اُٹھایا یا مجبوری سے۔ یہ تو سچ ہے کہ کہ رومی سپاہیوں نے اُسے جبراً اس کام کے لئے پکڑا تھا۔ مگر کیا اس میں محض جبر ہی جبر تھا۔ اور اور کچھ نہیں؟

بعض کا خیال ہے کہ وہ مسیح کے پیروؤں میں سے تھا۔ لیکن یہ امر اغلب (یقینی) نہیں معلوم ہوتا کہ ٹھیک اُس وقت جب کہ سپاہیوں کو اس مقصد کے لئے ایک شخص کی ضرورت پڑی تو یسوع ہی کے پیروؤں میں سے ایک اُن کے ہاتھ لگ گیا۔ طرزِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض اتفاقی طور پر وہاں آنکلا تھا۔ اور صرف اُسی وقت اور اپنی مرضی کے خلاف وہ بھی اس ڈراما میں شریک کیا گیا۔

انجیل نویس اُسے قُرینی کا باشندہ لکھتا ہے جو شمالی افریقہ کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کے رہنے والوں کا بھی اُس فہرست میں ذکر ہوا ہے۔ جہاں عید پنتیکوست کے روز جب کہ رُوح قدس آتشی زبانوں کی صورت میں کلیسیاء پر نازل ہوا۔ اُن لوگوں کا بیان کیا گیا ہے۔ (جو بیرونی تجارت سے عید کے موقع پر آئے ہوئے تھے)۔ اور اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمعون بھی اسی طرح اپنے دُور دراز مکان سے عیدِ فسح کے موقع پر یروشلیم میں آیا ہوا تھا[1]۔

وہ غالباً وہاں حج و زیارت کے لئے آیا تھا۔ شاید وہ اُن دینداروں میں سے تھا۔ جو اسرائیل کی تسلی کے منتظر تھے۔ وہ اپنے دُور دراز گھر واقع قرینی میں مسیح کی آمد کے لئے دعائیں مانگتا رہا ہو گا۔ اور سفر پر روانہ ہونے سے پہلے خُدا کی برکت و رحمت کا طالب ہوا ہو گا۔ خُدا نے اُس کی دعا سُنی اور اب پایہ قبول کو پہنچائی۔ مگر ایسے مختلف طور پر کہ اُس کو پہلے اُس کا شان و گمان بھی نہ تھا۔

کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیح سے اس طور پر سابقہ (واسطہ) پڑنا اُس کی اپنی اور اُس کے خاندان کی نجات کا باعث ہوا۔ انجیل نویس اُسے "اسکندر اور روفس" کا باپ بتاتا ہے۔ اور ایسے طور سے ذکر کرتا ہے کہ گویا وہ اُس سے خوب واقف تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس کے ان بیٹوں سے وہ لوگ جن کے لئے مقدس مرقس اپنی انجیل کو تحریر کر رہا تھا۔ خوب واقف ہوں گے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ وہ کلیسیاء کے شرکا میں سے ہوں گے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اُس کے خاندان کا تعلق کلیسیاء سے اُن کے باپ کی زندگی کے اس واقع کے ساتھ وابستہ تھا۔ مقدس مرقس نے اپنی انجیل روم کے مسیحیوں کے لئے تیار کی تھی۔ اور رومیوں کے نام کے خط میں ایک روفس کا ذکر ہے۔ جو اپنی ماں کے ہمراہ روم میں مقیم تھا۔ ممکن ہے کہ یہی شخص شمعون کا بیٹا تھا۔ اور اعمال ۱۳: ۱ میں ایک اور شمعون کا ذکر ہے۔ جو لوکیس قرینوی کے ہمراہ انطاکیہ کے سر برآوردہ (معزز۔ بزرگ) عیسائیوں میں سے تھا۔ اُس کے نام کے ساتھ لفظ نیگر و یعنی سیاہ فام بھی استعمال ہوا ہے جو اُس کی رنگت کا جو افریقہ کے گرم سورج کا نتیجہ تھی نشان دیتا ہے۔ عہدِ جدید میں اور بھی کئی اسکندروں کا ذکر ہوا ہے۔ مگر یہ نام عام تھا اور اسی لئے ان میں سے کسی ایک کو شمعون کا بیٹا ٹھہرانا ناممکن ہے۔ مگر ان تفصیلی باتوں کو چھوڑ کر ہمارے پاس اس امر کی صاف شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شمعون اسی حادثہ کی وجہ سے مسیحی ہو گیا۔

کیا یہ ایک پُر معنی بات نہیں معلوم ہوتی۔ جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دُنیا میں کوئی بات اتفاقی طور پر واقع نہیں ہوتی؟ اگر شمعون اس سے ایک گھنٹہ پہلے یا ایک گھنٹہ پیچھے شہر میں داخل ہوتا تو اُس کی زندگی کے بعد کی تاریخ مختلف ہوتی۔ بعض اوقات نہایت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک اتفاقی ملاقات کسی شخص کی زندگی بھر کی خوشی یا غمی کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ بلاشبہ شمعون کو اُس وقت یہ اتفاقی واقعہ نہایت ہی خراب اور مکروہ معلوم ہوا ہو گا۔ کیونکہ اُس کے سبب سے نہ صرف وہ اپنے کام سے رُک گیا ہو گا۔ بلکہ سخت بے عزتی اور شرمندگی بھی اُٹھانی پڑی۔ لیکن آخر کار وہ اُس کے لئے گویا حیاتِ ابدی کا دروازہ ثابت ہوا۔ اسی طرح الٰہی برکات بعض اوقات ایک دوسرے بھیس میں آیا کرتی ہیں۔ اور ایک بھوت کی صورت میں سے جسے دیکھ کر ہم مارے خوف کے چلا اُٹھیں۔ دفعتاً (اچانک) ابن آدم کی صورت دکھائی دی جاتی ہے۔ مگر اس واقع سے شمعون کو فقط

---

[1] بہت سے یہودی جو کسی زمانہ میں قرینی کے باشندے تھے۔ اب یروشلیم میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ غالباً اُن میں زیادہ تر وہ ضعیف العمر لوگ تھے۔ جو پاک زمین میں دفن ہونے کی غرض سے وہاں آرہے تھے۔ کیونکہ اعمال کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلیم میں اُن کی اپنی عبادت گاہ تھی۔ اور ممکن ہے کہ شمعون بھی انہیں میں سے تھا۔ مگر دوسری بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

اپنی ہی نجات حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ اُس میں سارا کنبہ شریک ہوا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسیح کسی ایک شخص پر جلوہ گر ہو تو اس سے کیا کچھ اُمید نہیں ہو سکتی۔اس ایک شخص کے ایمان لانے میں اُس کے بچوں اور بچوں کے بچوں کی جو ابھی تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ نجات و بہبودی بھی شامل تھی۔

لیکن سوچو تو کہ اگرچہ شمعون کو اُس وقت مسیح کی صلیب اُٹھانا تلخ معلوم ہوا لیکن بعد کی زندگی میں وہ اُس کے لئے خُدا کا کس قدر شکر کرتا ہو گا۔ بلاشبہ وہ اُسے اپنی زندگی کا ایک عجیب ماجرا خیال کرتا ہو گا۔اور آج کے دن تک کون ہے جو اس امر کے لئے اُس پر رشک نہ کھاتا ہو کہ اُس شخص کو یہ نصیب ہوا کہ اُس نے غش کھاتے ہوئے منجی کا ہاتھ بٹایا۔اور اُس کی خون آلود اور دردناک پیٹھ پر سے اُس کا بوجھ اُٹھا کر اپنے سر لے لیا؟اسی طرح سب کی زندگی میں ایک نہ ایک دن آتا ہے جب کہ ہر ایک خدمت جو وہ مسیح کے لئے بجالا سکتے ہیں ایک ایسی عمدہ یادگار ہوتی ہے۔ جس کے لئے وہ باقی عمر بھر سب سے زیادہ تر کیا کرتے ہیں۔ زندگی کے خاتمہ پر جب ہم اپنے سارے کارناموں پر نظر کریں گے۔تو وہ انعامات جو ہم نے حاصل کئے۔ یا وہ عیش و عشرت جس سے محفوظ ہوئے۔ یا وہ تکلیف و مصائب جن سے ہم بچ گئے۔اُن کی یاد ہمیں اتنا خوش و خرم نہیں کرے گی۔ لیکن اگر ہم نے کبھی خود انکاری کر کے مسیح کی صلیب اُٹھائی ہے۔تو اُس کی یاد ہمارے بستر مرگ پر ہمارے سر کے نیچے ملائم تکیہ کا کام دے گی۔اُس وقت ہمارے دل میں یہ خواہش ہو گی کہ کاش وہ منٹ جو ہم نے مسیح کی خدمت میں صرف کئے۔ سال ہوتے اور وہ پیسے اشرفیاں ہوتیں۔اور اُس وقت ٹھنڈے پانی کا ہر ایک پیالہ اور ہر ایک تسلی آمیز کلمہ اور ہر ایک خود انکاری کا کام ایسا خوشنما معلوم ہو گا۔ کہ ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گی۔ کہ کاش وہ اُس سے جو ہیں ہزار گناہ زیادہ ہوتے۔

گیارھواں باب

یروشلیم کی بیٹیاں

خُداوند کی زندگی کے اس حصّہ کے متعلق بہت سی حکائتیں کی جاتی ہیں۔

مثلاً یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ جب وہ صلیب اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ جارہا تھا تو راستہ میں ستانے کے لئے وہ ایک گھر کے دروازے سے تکیہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر گھر کے مالک نے اُسے ایک مکا مار کر ہٹا دیا اور کہا کہ چلو اپنا راستہ لو۔اس پر خُداوند اپنے مارنے والے کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔تو چلتا ہی جائے گا اور کبھی ٹھہرے گا۔ جب تک کہ میں پھر نہ آؤں۔اور آج کے دن تک نہ اُس شخص کو آرام ملتا ہے۔نہ موت آتی ہے۔ بلکہ یہ کمبخت برابر زمین پر سفر کرتا رہتا ہے۔اور خُداوند کی آمد ثانی تک ایسا ہی کرتا رہے گا۔یہی آوارہ گرد یہودی کی حکائت ہے۔ جس پر مختلف صورتوں میں زمانہ گذشتہ میں اور نیز آج کل بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک خیالی تصویر ہے۔ جس میں ایک آدمی کی مثال میں یہودی قوم کی اُس دردناک قسمت کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔جو اُس دن سے جب کہ انہوں نے خُداوند پر ہاتھ ڈالے۔ ساری دُنیا میں ماری ماری پھرتی ہے۔اور جس کے پاؤں کو تختۂ زمین پر کہیں بھی قرار و آرام نصیب نہیں ہوتا۔

ایک اور کہانی ہے جس کو مُصوری میں وہی جگہ دی گئی ہے۔ جو آوارہ گرد یہودی کو لٹریچر میں حاصل ہے۔ویرونیکا یروشلیم کی ایک معزز خاتون مسیح کو اپنے مکان کے پاس سے گذرتے اور بوجھ کے نیچے دبے دیکھ کر گھر سے باہر نکل آئی اور ایک رومال کے ذریعہ اُس کے چہرہ پر سے خون اور پسینہ پونچھ دیا۔اور دیکھو جب اُس نے اُس رومال پر جس اُس نے مسیح کا منہ پونچھا تھا نظر کی تو کیا دیکھتی ہے کہ اُس پر اس مرد غمناک کی شبیہ عین بعین نقش ہے۔

بعض مشہور اور عالی قدر مُصوروں نے اس نظارہ کی تصویر کھینچی ہے۔اور میرے نزدیک اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اس زندگی کی معمولی باتیں بھی جب رحمت کے کاموں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔تواُن پر مسیح کی صورت کا نقش ہو جاتا ہے۔

رومن کیتھولک گرجاؤں میں عموماً دیواروں پر قریباً ایک درجن تصویروں کا سلسلہ دیکھا جاتا ہے۔جو خُداوند کی زندگی کے اس حصّہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ان تصویروں کا نام منازلِ صلیب ہے۔کیونکہ لوگ عبادت کے وقت ایک سے شروع کے برابر آخر تک گھوم جاتے ہیں۔اور ایک ایک تصویر کے سامنے تھوڑی تھوڑی دیر تک ٹھہر کر اور اُس پر نظر کر کے خُداوند مسیح کے دُکھوں اور مصیبتوں پر غور وفکر کرتے ہیں۔بعض ممالک میں جہاں کیتھلک مذہب زوروں پر ہے۔اسی خیال کو ایک اور طرح سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔جو زیادہ موثر ہوتا ہے۔شہر کے قریب ایک پہاڑی کے سرے پر تین صلیبیں نصب کی جاتی ہیں۔اور شہر کی ایک گلی جس کا نام راہِ کلوری ہوتا ہے۔اُس میں کچھ کچھ فاصلہ پر خُداوند کے اس سفر کے مختلف نظاروں کو ظاہر کرنے کے لئے بڑی بڑی تصویریں یا منقش پتھروں کی سلیں نصب کی جاتی ہیں۔

مگر اس راہِ غم کے صرف دو واقعات ہیں۔جن کا یقینی علم ہمیں حاصل ہے۔ایک تو شمعون قرینی کا خُداوند کی صلیب کو اُٹھانا۔دوسرے یروشلیم کی بیٹیوں کی ہمدردی کا اظہار جس کا ذکر ہم اب کرنا چاہتے ہیں۔

ا۔

جو شخص خُداوند کی زندگی کی آخری گھڑیوں کا حال پڑھتا ہے۔اُسے ہر قدم پر سخت دہشت ناک نظاروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔بعض نظارے جن میں سے ہم ابھی ابھی گذرتے آئے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے۔کہ اُن میں ہم آدمیوں سے نہیں بلکہ عفریتوں (بُھوتوں) اور شیطانوں سے ملاقاتی ہوئے ہیں۔اور دل اُن کو دیکھ دیکھ کر ایسا دق آجاتا ہے۔کہ وہ اس امر کا آرزو مند ہوتا ہے کہ کاش کوئی اور چیز نظر آئے جس سے دم بھر کے لئے مذہبی تعصب (مذہب کی بے جا حمایت) اور خونخواری کے دردناک نظاروں سے خلاصی ملے۔اس لئے وہ نظارہ بہت ہی فرحت بخش اور دل کش معلوم ہوتا ہے۔جس میں اس شبِ غم پر روشنی کی کچھ کرنیں پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں دل انسانی سے بالکل نااُمید نہ ہو جانا چاہیے۔بلکہ اُس میں ابھی کچھ کچھ جان باقی ہے۔

یہ فی الحقیقت ایک خلافِ اُمید اور حیرت میں ڈالنے والا نظارہ تھا۔اگر اس وقت اُس کا ایسا بین (واضح) اظہار نہ ہوا ہوتا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ یسوع کو یروشلم کے باشندوں کے کسی حصّہ کے دل میں بھی ایسی گہری جگہ حاصل تھی۔یہودیوں کے صدر مقام میں ہمیشہ اُسے مخالفت سے سابقہ پڑتا رہا تھا۔اور اُن میں اُس کی تعلیم کی قبولیت کا مادہ بہت کم دکھائی پڑتا تھا۔یروشلیم میں ربیوں اور کاہنوں کا زور تھا۔جو اپنے علم اور عہدے پر بڑے نازاں تھے۔یہی فریسیوں اور صدوقیوں کی جولانگاہ تھا۔اور عوام الناس انہیں کی رائے پر چلتے تھے۔اور یہاں اوّل سے آخر تک اُس کے صرف چند ہی آدمی پیرو بنے تھے۔وہ صرف بیرونی علاقہ اور خاص کر گلیل میں کامیاب ہوا تھا۔وہاں لوگ اُس کی بڑی قدر وعزت کرتے تھے۔یہ گلیلی حاجی تھے۔جو عید فسح کے موقع پر آئے ہوئے تھے۔جو ہوشعنا کے نعرے لگاتے ہوئے اُسے دار الخلافہ کے اندر لے گئے تھے۔مگر شہر کے باشندے اُس کی طرف سے بے پروا تھے۔اور یہی لوگ تھے۔جو پیلاطس کی عدالت کے سامنے چلارہے تھے۔اُسے صلیب دے۔اُسے صلیب دے۔

لیکن اس واقع سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔کہ کم سے کم یروشلیم کی آبادی کے ایک حصّہ کے دل میں اُس نے کچھ اثر پیدا کر لیا تھا۔چنانچہ لکھا ہے کہ لوگوں کی بڑی بھیڑ اور بہت سی عورتیں جو اُس کے واسطے روتی پیٹتی تھیں۔اُس کے پیچھے پیچھے چلیں۔بعض کو یہ امر ایسا عجیب وغریب معلوم ہوا ہے کہ

اُن کا خیال ہے کہ یہ گلیلی عورتیں ہوں گی۔ مگر یسوع نے انہیں "یروشلیم کی بیٹیو" کہہ کر خطاب کیا۔ اہلِ گلیل میں سے جو اُس کی فتح وکامیابی کے گھڑی میں اُسے اس طرح گھیرے ہوئے تھے۔ اب اُس کی مصیبت کے گھڑی میں ایک بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مگر یروشلیم کی عورتوں نے مردوں کی اس مثال کی پیروی نہ کی۔ بلکہ علانیہ اُس کی جوانی۔ نیک چلنی اور مصائب پر آنسو بہائے۔ بیان کرتے ہیں۔ کہ یہودیوں میں ایک قانون تھا۔ جس کے مطابق سزا یافتہ آدمی کے ساتھ کسی قسم کے اظہار ہمدردی کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو اس اظہار ہمدردی کے لئے یہ لوگ اور بھی زیادہ تعریف کے مستحق (حقدار) ہیں۔ اُن کے جذبات کا بہاؤ اس قدر زوروں پر تھا۔ کہ قانون ودستور کے بند اُس کو نہ روک سکے۔

کہا گیا ہے کہ اناجیل میں کوئی بھی ایسی نظیر (مثال) نہیں پائی جاتی جس میں کسی عورت کا ذکر ہو جو یسوع کی دشمن تھی۔ کسی عورت کی نسبت یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی یا اُس نے اُس پکڑا دیا۔ یا اُسے کسی قسم کا دُکھ دیا یا اُس کی مخالفت کی بلکہ عورتیں اُس کی پیروی کرتی تھیں۔ اپنے مال ودولت سے اُس کی خدمت کرتی تھیں۔ اُس کے پاؤں آنسوؤں سے دھوتی تھیں۔ خوشبوئیں اُس کے سر پر ملتی تھیں۔ اور اب جب کہ اُن کے خاوند اور بھائی وموت تک اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ روتی۔ چلاتی اور نوحہ زاری کرتی ہوئی اُس کے مقتل تک اُس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔

یہ واقع ایک طرف تو مسیح کی خصلت (عادت) کی خوبی کے لئے ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ اور دوسری طرف عورتوں کی خصلت کے لئے۔ عورت کی عقل وتمیز نے اُسے سمجھا دیا۔ گو وہ ابھی تک اس سچائی کو صاف طور پر نہ بھی سمجھی ہوں کہ یہی شخص اُس کا رہائی دینے والا ہے۔ کیونکہ اگرچہ مسیح سب کا نجات دینے والا ہے۔ لیکن وہ عورت کا نجات دہندہ خاص معنوں میں ہے۔ اُس کی آمد کے زمانہ میں چونکہ اُس کی ذلت اور بے چارگی مردوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی اس لئے وہی اُس کی زیادہ حاجت مند تھی۔ اور اُس وقت سے جہاں کہیں انجیل پہنچی ہے اُس کے لئے گویا رہائی اور آزادی کا پیغام لے کر گئی ہے۔ اُس کی حضوری میں وہ تمام ملائم اور خوب صورت اوصاف جو اُس کی خصلت جو اُس کے باطن میں پنہاں (چھپے) ہیں۔ عیاں (ظاہر) ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کے اثر سے اُس کی خصلت ومزاج میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

بعض یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ یروشلیم کی بیٹوں کا یہ جذبہ کچھ بہت گہرا نہ تھا۔ اور اس سے انکار کرنا بھی ضروری نہیں۔ اُن کا یہ جذبہ اور یہ آنسو بہانا ایمان وتوبہ کا پُر جوش اظہار نہ تھا۔ جس سے عجیب وغریب نتائج اور تبدیلیاں واقع ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ فقط ایک طبعی جوش کا اظہار تھا جو ہر ایک دردناک نظارہ کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے۔ یہ اُسی قسم کے آنسو تھے۔ جو آج کل بھی مسیح کے دُکھوں اور مصیبتوں کا حال سن کر نرم دل لوگوں کی آنکھوں سے نکل آیا کرتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے جذبات دیرپا نہیں ہوتے۔ ہماری طبیعت ومزاج میں کئی ایک تہیں ہیں۔ اور غالباً اس قسم کے جذبات ان سب کے اُوپر کے حصّوں میں واقع ہیں۔ اس لئے یہی کافی نہیں کہ مذہب ان اوپر کی تہوں میں کام کرے۔ بلکہ اُسے ان اُوپر کی تہوں میں سے ہو کر نیچے اُتر جانا چاہیے اور گہری گہری تہوں میں مثلاً ضمیر اور قوتِ ارادی میں اُتر جانا چاہیے۔ اور ان پر قبضہ کرکے اپنی آگ کو روشن کرنا چاہیے۔ تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب مذہب نے انسان کی کل ہستی پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اُس میں گویا رچ گیا ہے۔

مگر عورتوں کا مسیح کی بابت اس طور سے رنج وغم ظاہر کرنا محض ایک ابتدائی بات تھی۔ اور اسی میں اس کی خوبی منحصر ہے۔ اُس کے لئے یہ گویا اُس اعلیٰ اور گہری عقیدت کا جو دُنیا کی عورتیں آئندہ زمانہ میں اُس کی نسبت رکھنے کو تھیں ایک پیش خیمہ تھا۔ اُس مصیبت اور تنہائی کے گڑھے میں وہ اُس کے لئے ایسی ہی خوش آئندہ ثابت ہوئی ہو گئی جیسے صحرائے لق ودق (ویران وسنسان جنگل) میں گھاس کی ایک پتی کا نظارہ پیاسے راہ گیر کے لئے ہوتا ہے اس ہمدردی کی آوازوں نے اُس کی رُوح پر ویسا ہی کام کیا ہو گیا جیسے مریم کے محبت آمیز تحفہ نے اُس کے حواس پر کیا تھا۔ جب کہ گھر عطر کی خوشبو سے مہک گیا تھا۔

اس طور سے راہِ غم پر یسوع کواپنی مصیبت اور دُکھ میں دو دفعہ تسلی وتسکین نصیب ہوئی۔ایک آدمی کی قوتِ بازو سے اُس کے جسم کو صلیب کے بوجھ سے نجات ملی۔اور عورتوں کی ہمدردی سے اُس کی رُوح کے دُکھ کو تسکین ملی۔ کیایہ واقع اس امر کی تمثیل کے طورپر نہیں ہے۔کہ اب بھی مرد وعورت اُس کے لئے کیاکچھ کر سکتے ہیں۔ مسیح کو مردوں کو قوتِ بازو کی ضرورت ہے۔ہاں ایسے مضبوط اور جفاکش کندھوں کی جواُس کی خدمت کابوجھ اُٹھا سکیں۔اُس کوایسے ذہنوں اور رعقلوں کی ضرورت ہے۔جواُس کی بادشاہت کے پھیلانے کے لئے ضروری تجاویز سوچ سکیں۔اُسے اُن کے مستقل ارادوں کی ضرورت ہے۔جو باوجود مخالفتوں اور رُکاوٹوں کے استقلال کے ساتھ اُس کی سلطنت کی حدود کو پھیلاتے جائیں۔اُسے ایسے فیاض ہاتھوں کی ضرورت ہے۔جو کھلے دل سے اُس کے مقدمہ کی کامیابی اور ترقی کے لئے اپنے مال ودولت کو نثار (قربان) کردیں۔عورتوں سے وہ ہمدردی اور آنسوؤں کا طالب ہے۔وہ اُس حس و ملائمت کو دے سکتی ہیں۔جو دُنیا کے دل کو پتھر ہونے سے محفوظ رکھتی ہے وہ اُن سے اُس خفیہ علم کا طالب ہے جس کے ذریعہ سے عورتیں فوراًدریافت کرلیتی ہیں کہ کون شخص رحم وہمدردی کاحاجت مند ہے۔اور اُس کی حاجتوں کو معلوم کرکے اُن کو پورا کرسکتی ہیں۔وہ اُس سرگرمی کاخواہاں ہے۔جو مذہبی کاروبار کے دل میں آگ کی طرح جلتے رہتے ہیں۔اور اُسے زندہ رکھتی ہے۔عورت کااثر بہت ہی پوشیدہ اور دُور از کار معلوم ہوتاہے۔مگر خاص اسی وجہ سے وہ نہایت طاقت ور ہے۔کیونکہ وہ انسانی زندگی کے دریاؤں کے منبع پر بیٹھی اُن کے بہاؤ کارُخ قائم کرتی رہتی ہیں۔جہاں ایک ذراسی تبدیلی سے اس کی رَو کارُخ سے کہیں سے کہیں بدل جاتاہے۔

۲۔

ہر زمانہ میں یہ دستور رہاہے۔کہ جن لوگوں پر سزائے موت کافتویٰ صادر ہوتاتھا۔انہیں مرنے سے پہلے یہ اجازت دی جاتی تھی کہ لوگوں سے جو تماشادیکھنے کو جمع ہوتے تھے۔جو کچھ چاہیں کہیں۔اور اس ملک میں بھی جب سزائے موت عام طورپر لوگوں کے سامنے دی جاتی تھی۔مرتے دم کی سپیچ ساری کارروائی کالوازمہ (ضروری چیز) سمجھا جاتا تھا۔بلکہ اُن زمانوں میں بھی جب کلیسیاء پر ظلم وستم روا رکھا جاتا تھا۔شہیدوں کو عموماً دار پر چڑھنے سے پہلے لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔اور اس قسم کی مرتے دم کی شہادتیں جن میں سے اکثر بہت ہی پُرزور اور موثر ہوتی تھیں اب تک مذہبی دُنیا میں محفوظ چلی آتی ہیں۔اس لئے یہ کوئی جائے تعجب نہیں کہ یسوع کو بھی اپنے تماشائیوں سے گفتگو کرنے کی اجازت دی گئی۔ یاکم سے کم اُسے اُس سے روکا نہیں گیا۔اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اُس وقت نہایت ہی ضعیف ودرماندہ (کمزور۔مصیبت زدہ) ہورہاتھا۔لیکن جب صلیب کے بوجھ سے اُسے چھٹکارا ملاتواُس کی کچھ جان میں جان آگئی اور وہ تقریر کرنے کے قابل ہوگیا۔اس لیے سڑک پر ذرا ٹھہر کراور پیچھے پھر کر وہ اُن عورتوں سے جن کے رونے چلانے کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔یوں مخاطب ہوا۔

اُس کے الفاظ سے اوّل توخود اُس کے مزاج کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔اُن سے ظاہر ہوتاہے۔جیسا کہ ہم مصلوب ہونے کے زمانہ میں اور موقعوں پر بھی باربار اس کاثبوت پاتے ہیں۔کہ وہ کس طرح قطعی طورپر دوسروں کے فکر واندیشہ میں اپنے دُکھ اور تکلیف کو بالکل بھول جاتاتھا۔اُس کے درد تکالیف پہلے ہی حدود کی تھیں۔اُس کی رُوح بے انصافی اور لعنت ملامت سے سیر ہوچکی تھی۔اور عین اس وقت بھی اُس کی بوٹی بوٹی مارے درد کے کانپ رہی تھی۔اور اُس کاذہن آنے والی سخت دردوں کے خیال سے تاریک ہورہاتھا۔لیکن جب اُس نے اپنے پیچھے یروشلیم کی بیٹیوں کی آہوں کی صدا سُنی اُس کی رُوح پر رحمت کی ایک لہر پھر گئی۔جس کے سبب لحہ بھر کے لئے اُسے اپنے تمام دُکھ اور تکلیفیں فراموش ہوگئیں۔

ہم اُس کے کلام میں حب الوطنی کی گہرائی اور جوش بھی دریافت کرتے ہیں۔ جب اُس نے عورتوں کے آنسو بہتے دیکھے۔ تو اس سے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور سماں پھر گیا اور اُسے یاد آیا کہ کس طرح اُس شہر پر جس کی وہ لڑکیاں ہیں ایک سخت آفت و مصیبت کی تلوار جھوم رہی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یروشلیم نے کبھی بھی اُس کی قبولیت کے لئے اپنے بازو نہیں پھیلائے تھے۔ اُس نے اُس کے ساتھ ماؤں کا سا سلوک نہیں کیا تھا۔ مگر باوجود اس کے اب بھی اس کے دل میں اُس کی نسبت فرزندانہ محبت باقی تھی۔ اُس نے اس سے چند روز پہلے بھی اُس کا ثبوت دیا تھا۔ جب کہ عین فتح اور کامیابی کی گھڑی میں ہو کوہ زیتون کی ایک چوٹی پر جہاں سے سارا شہر بخوبی نظر آتا تھا۔ ٹھہر گیا اور زار زار روتے ہوئے وہ شیریں الفاظ زبان سے فرمائے جو شاید ہی کسی اور شہر کے حق میں سُنے گئے ہونگے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے شاگردوں کے ہمراہ ہیکل کے مقابل بیٹھا تھا۔ تو اُس نے ظاہر کیا کہ وہ اُس آفت سے جو اُس کے وطن کے صدر مقام پر آنے والی ہے کیسی اچھی طرح واقف ہے۔ اور اُس کو یاد کر کے اُس کے دل میں کیسی چوٹ لگتی ہے۔ شہر کی بربادی نزدیک تھی۔ اس بربادی میں پچاس سے بھی تھوڑے سال باقی تھے۔ اور یہ بربادی ایسی سخت تھی کہ جس کی نظیر (مثال) مشکل سے ملتی ہے۔ ایک اور یہودی مورخ اس بربادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ دُنیا میں شاید ہی کوئی قوم ہوئی ہوگی۔ اور شاید ہی آئندہ ہوگی جس کے مصائب کا یروشلیم کے اُن مصائب سے جو محاصرہ کے دنوں میں اُس پر واقع ہوئے۔ مقابلہ کرنا ممکن ہو۔ اسی مصیبت کو نبیانہ نگاہ سے دیکھ کر یسوع کے منہ سے یہ کلمات نکلے۔ اے یروشلیم کی بیٹیو! میرے لئے مت روؤ۔ بلکہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے روؤ۔

علاوہ بریں اُس کے الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے عورتوں اور بچوں کی کس قدر فکر تھی۔ عورتوں کے آنسوؤں سے یہ ظاہر ہوا کہ اُن کے دل میں اُس کی طرف سے محبت و ہمدردی کا مستحق بھی تھا۔ کیونکہ اُس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس طرح وہ عورتوں کے مزاج سے واقف اور اُن کا ہمدرد تھا۔ اور ایسے کامل طور پر کہ اُس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی قوتِ واہمہ کے اور دل کی ہمدردی کی بنا پر اُس نے خوب تحقیق کر لیا کہ کس طرح آنے والے محاصرہ میں مصیبت کا سب سے بھاری بوجھ شہر کی مستورات (عورتوں) کے حصّہ میں آئے گا۔ اور کس طرح عورتیں اپنے بچوں کی تکالیف کے سبب دُکھ اُٹھائیں گی۔ اُس ملک میں جہاں بچے عورت کا تاج اور بزرگی سمجھے جاتے تھے۔ بھوک اور درد کے مارے طبعی جذبات ایسے اُلٹ جائیں گے۔ کہ بانجھ ہونا خوش قسمتی خیال کیا جائے گا۔ اور ایسے ملک میں جہاں عمر کی درازی اعلیٰ سے اعلیٰ برکت سمجھی جاتی تھی وہ اس بات کی آرزو مند ہوں گی۔ کہ کاش ہمیں اچانک اور پیش از وقت موت آ جائے۔

اور ایسا ہی فی الحقیقت واقع ہوا۔ مورّخ (تاریخ دان) کے بیان کے موافق یروشلیم کے محاصرے میں ایک بڑی بات یہ تھی۔ کہ اُس میں عورتوں اور بچوں پر بڑی سخت مصیبتیں نازل ہوئیں۔ جنگ کے دوسرے وسائل کے علاوہ رومیوں نے اُن کو بھوکوں مارنا شروع کیا اور لوگوں کو بھوک کے مارے نہایت سخت تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ لوگ اس سے آخر کار ایسے وحشی ہو گئے۔ کہ دوسروں کو کھانا کھاتے دیکھنا۔ ایک مصیبت ہو گیا اور وہ عورتوں اور بچوں کے منہ سے لقمے چھین چھین کر کھانے لگے۔ اس امر کے متعلق یوسیفس کے کئی ایک قصّوں کے بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر وہ ایسے دردناک اور دہشت انگیز ہیں کہ اُن کا بیان کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

یسوع کی زود فہم ہمدردی نے یہ سب باتیں محسوس کیں۔ اور اُس کے رحم کا چشمہ اُن کے حق میں جن پر یہ سب کچھ وارد ہونے والا تھا۔ اُبل پڑا عورتیں اور بچے! مگر صفحۂ تاریخ پر نظر کرو تو معلوم ہوگا۔ کہ اُن کی کیسی تحقیر و تذلیل ہوتی رہی۔ اور کیسی بے رحمی سے اُن کے ساتھ سلوک ہوتا رہا ہے مگر ہمیشہ نوع انسان کا سب سے بڑا حصّہ رہے ہیں۔ اُسی کی حمد و تعریف ہو جس نے اُن کو اس ذلت اور بدسلوکی کے گڑھے سے اُٹھایا اور اُٹھا رہا ہے۔ اور جس نے اُن کے حق میں عدل و رحم کو کام میں لانے کی تعلیم دی ہے۔ پھر ان الفاظ میں جو اُس نے یروشلیم کی بیٹیوں سے کہے توبہ و استغفار کی ترغیب و

تحریص بھی پائی جاتی ہے۔ جب یسوع نے فرمایا کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے رؤو۔ تو وہ صرف اُن آنے والی مصیبتوں ہی کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اُن کی گنہگاری کا بھی۔ اور یہ بات خاص کر اُس کی تقریر کے باقی الفاظ سے زیادہ تر عیاں (ظاہر) ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہرے درخت کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ تو سوکھے کے ساتھ کیا نہ کیا جائے گا۔

وہ اپنے کو "ہرا درخت" کہہ سکتا تھا۔ وہ نوجوان اور بے گناہ تھا۔ اور اس امر کی اُن عورتوں کے آنسو بھی شہادت دے رہے تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اُس وقت مارا جائے مگر خُدا نے یہ سب کچھ اُس پر واقع ہونے دیا۔ یہودی قوم کو بھی ہرے درخت کی مانند ہونا چاہیے تھا۔ خُدا نے اُسے لگایا تھا۔ اور اُس کی رکھوالی کرتا رہا تھا۔ ہر ایک ضروری چیز اُس کے لئے مہیا کرتا تھا۔ لیکن جب وہ پھل ڈھونڈنے کے لئے آیا تو کچھ نہ پایا وہ کملا رہا تھا۔ نیکی اور راستی کا رس اُس میں بالکل سوکھ گیا تھا۔ اب وہ بالکل خشک اور جلانے کے قابل تھا۔ اور جب دشمن آگ لگانے کو آئے گا۔ تو خُدا کب اُس کو اس بات سے روکے گا؟ اس طور سے یسوع نے پھر ایک دفعہ انہیں توبہ پر آمادہ کرنے کوشش کی۔ اُس نے چاہا کہ یروشلیم کے دل میں گہری باتوں کا خیال پیدا ہو۔ انہوں نے اُس کے لئے آنسو تو بہائے تھے۔ مگر وہ چاہتا تھا۔ کہ اس سے بڑھ کو وہ توبہ کے آنسو بھی بہائیں۔ کیونکہ مذہبی اُمور میں جب تک ضمیر تک اثر نہیں پہنچ جاتا تب تک کسی بہتری کی اُمید کرنا لا حاصل ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا اُن میں سے کسی کے دل پر اُس کے اس قول نے کچھ اثر پیدا کیا یا نہیں۔ شاید اگر ہوا بھی ہو۔ تو چند ایک ہی پر ہوا ہو گا۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ توبہ کرنے سے یہودی سلطنت کی تباہی ضرور رُک جاتی۔ بہر صورت حملہ کی آگ اُن خشک پتوں پر پڑی اور سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ اور اُس زمانہ سے لے کر وہ لوگ جو سزا کا پہاڑ کرنے سے پہلے اپنے گناہوں پر گریہ زاری کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ آج تک برابر روتے چلے آتے ہیں۔ جو لوگ آج کل یروشلیم کی سیر کو جاتے ہیں انہیں ایک مقام دکھایا جاتا ہے۔ جو مقام گریہ وبُکا کہلاتا ہے۔ جہاں ہر جمعہ کو اس قوم کے لوگ اپنے شہر اور ہیکل کی بربادی کے لئے گریہ وزاری کرنے کو آتے ہیں۔ اور یہ بات صدیوں سے چلی آئی ہے۔ اور یہ اُس حیرت کے پیالہ کا جو اُن کے لئے لبالب بھرا گیا محض ایک نشان ہے جس سے صدہا سال سے بنی اسرائیل کے ہونٹ آشنا (واقف) رہے ہیں۔

گناہ کے لئے رونا ضروری ہے۔ جو سزا کے واقع ہونے سے پہلے نہیں روتا۔ اُسے بعد میں رونا پڑتا ہے۔ جو اس دُنیا میں نہیں روتا۔ وہ آئندہ جہان میں روئے گا۔ اور یہ سبق سب کے لئے ہے۔ اور کیا یسوع کے آخری الفاظ اُن لوگوں کو نسبت جن سے وہ کہے گئے تھے۔ زیادہ گہرے معنی نہیں رکھتے کہ جب ہرے درخت کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ تو سُوکھے کے ساتھ کیا نہ کیا جائے گا؟ اگر غم اور جانکنی سے خود ابنِ اللہ بھی نہ چھُوٹا۔ جب وہ دُنیا کے گناہوں کو اُٹھا رہا تھا۔ تو اُن لوگوں کا حصّہ کیا ہو گا۔ جو خود اپنے ہی گناہ اُٹھا رہے ہیں۔

بارھواں باب

کلوری

جو شخص خُداوند کی زندگی پر لکھنے بیٹھتا ہے۔ وہ ضرور بہت جگہ قلم کو اپنے ہاتھ سے رکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ "یہ تو آسمانوں کے برابر بلند ہے میں کیا کر سکتا ہوں؟ پاتال سے زیادہ گہری ہے میں کیا جان سکتا ہوں؟" لیکن ہم اب ایسے نقطہ پر پہنچے ہیں۔ جہاں اس قسم کی نا قابلیت کا خیال بڑے زور کے ساتھ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ آج ہم مسیح کو مصلوب ہوتے دیکھنے کو ہیں۔ مگر کون اس لائق ہے کہ اس نظارے کو دیکھنے کے لئے آنکھ اُٹھائے؟ کس میں

طاقت ہے کہ اُس کا بیان کرے ؟ایسا علم میرے لئے نہایت عجیب ہے۔ یہ تو بلند ہے۔ میں اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔اس مضمون کے سامنے آدمی اپنے کو ایک چھوٹے سے کیڑے کے برابر سمجھنے لگتا ہے۔جو سمندر کی تہ میں پڑا ہو۔اُس کا اُس بھید کے سمجھنے کا دعویٰ دار ہونا ایسا ہے۔جیسا گھونگے کا اپنی سیپی کے ذریعہ سے سمندر کو خالی کر دینے کی کوشش کرنا۔یہ مقام جہاں ہم اب کھڑے ہیں۔سب کا مرکز ہے۔ یہاں ازل وابد کا ملاپ ہے قدیم تاریخ کے نالے یہیں آکر مل جاتے ہیں۔اور زمانۂ حال کی تاریخ کا دریا یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

بزرگوں اور نبیوں کی آنکھیں اسی کلوری کو ڈھونڈتی تھیں۔اور اب تمام قوموں اور تمام نسلوں کی آنکھیں پیچھے پھر کر اُسی پر لگی ہوئی ہیں۔یہی تمام سڑکوں کا انجام ہے۔ سچائی کا طالب جب علم کی تمام مملکتوں کو کھوج چکتا ہے۔تو کلوری کے پاس آتا ہے۔اور معلوم کرتا ہے۔کہ آخر کار وہ مرکز پر پہنچ گیا۔آدمی کا تھکا ہارا دل جس نے محبت اور ہمدردی کی تلاش میں ساری دُنیا چھان ماری۔آخر کار یہیں پہنچ کر آرام پاتا ہے۔خیال تو کرو کہ کس قدر بے شمار روحیں ہر اتوار کو گرجوں اور عبادت خانوں میں جمع ہو کر گلگتا کی یاد کرتی ہیں۔اور بستر بیماری اور مرگ پر سے کس قدر بے شمار آنکھیں اُسی مقام کی طرف اُٹھتی ہیں۔"خُداوند ہم کس کے پاس جائیں؟ابدی زندگی کا کلام تو تیرے ہی پاس ہے"۔

اس لئے اگرچہ یہ مضمون ہماری حیثیت سے بلند وبالا ہے۔تو بھی ہم آگے بڑھنے کی جُرات کرتے ہیں۔وہ عقلِ انسانی سے کہیں اُونچا ہے۔ مگر اور کہیں عقل کو اس قدر علوم اور شرافت نصیب نہیں ہوتی جس قدر اس مضمون پر غور کرتے ہوئے۔کلوری پر شاعروں نے اپنے میٹھے سے میٹھے گیت گائے ہیں۔ مصوروں نے اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ رویا دیکھی ہیں۔ حکماء نے اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ تصورات باندھے ہیں۔گھونگا سمندر کی تہ میں پڑا رہتا ہے۔اور ایک پانی کا عالم اُس کے اوپر سے گذرتا رہتا ہے۔وہ اپنے چھوٹے چھوٹے سیپوں میں اس شفاف لہرانے والی چیز کے کالے کووں کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔تو بھی سمندر کا پانی ہی اُس کی سیپی کو بھی بھرتا ہے۔اور اُس کے چھوٹے سے جسم کو کامل خوشی سے معمور کرتا ہے۔اور اسی طرح اگرچہ ہم بھی اُس نظارہ کے جس کے سامنے ہم کھڑے ہیں۔تمام مطالب و معانی کو نہیں سمجھ سکتے۔تاہم اپنے ذہن اور عقل کو اُس سے لبالب بھر سکتے ہیں۔اور جب اُس کے ذریعے ہمارے اندر الٰہی زندگی کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔تو ہم خوشی سے اقرار کرتے ہیں۔کہ اُس کی چوڑائی اور لمبائی اُونچائی اور گہرائی ہماری فہم سے باہر ہے۔

ا۔

وہ طویل سفر جو اُسے گلیوں میں سے ہو کر قتل گاہ تک کرنا پڑا۔آخر کار اختتام کو پہنچا۔اور اُس کے ساتھ ہی اُس ایذا رسیدہ کے تکلیف دہ سفروں کا بھی خاتمہ ہوا۔سپاہیوں نے اب آخری کام کی تیاریاں شروع کر دیں۔لیکن اسی اثناء میں ایک چھوٹی سی بات وقوع میں آئی۔جس سے مسیح کے چال چلن پر ایک اور روشنی پڑتی ہے۔

یروشلیم کی مالدار خواتین میں ایک رسم تھی کہ جن لوگوں پر صلیب کی خوفناک سزا کا فتویٰ صادر ہوتا تھا۔وہ اُن کے لئے ایک قسم کی شراب جس میں کوئی منشی (نشہ آور) چیز مثل پت یا مرؔ کے ملی ہوتی تھی مہیا کرتی تھیں۔تاکہ اُن کے حواس مخبوط (مدہوش) ہو جانے سے وہ درد کو محسوس نہ کر سکیں۔یہ ایک اچھی رسم تھی۔جس سے اُن کی ہمدردی اور نیک دلی ظاہر ہوتی تھی۔اور یہ پیالہ سب مجرموں کو بلالحاظ اُن کے جرم کے دیا جاتا تھا۔یہ پیالہ عین اُس وقت جب کہ میخیں ٹھوکی جانے کو ہوتی تھیں پلایا جاتا تھا۔جب وہ گلگتا پر پہنچا۔تو یسوع کو بھی یہ پیالہ دیا گیا۔وہ مارے تکان کے بے تاب ہو رہا تھا۔اور پیاس کی شدت سے جل رہا تھا۔وہ اس پیالہ کو لے کر بلا تامل منہ کی طرف لے گیا مگر جونہی اُس نے اُس کا مزا چکھا اور بے ہوش کرنے والی دوائی کی بو سونگھی۔اُس نے اُسے نیچے رکھ دیا۔اور پینے سے انکار کر دیا۔

یہ بات تو معمولی سی تھی۔ مگر اس میں بڑی دلیری پائی جاتی تھی۔ اُسے اُس وقت ایسی سخت پیاس لگ رہی تھی۔ جب کہ آدمی جو کچھ ملتا ہے بے تحاشا چڑھا جاتا ہے۔ اور وہ اب نہایت ایذا و تکلیف سے دوچار ہو رہا تھا۔ اُس کے بعد کے زمانوں میں اُس کے وفادار شہید جب وہ قتل گاہ کی طرف جاتے تھے۔ خوشی سے اس قسم کی اشیاء کا استعمال کر لیتے تھے۔ مگر اُس نے نہ چاہا کہ مرتے وقت اُس کے ذہنی قویٰ (قوت کی جمع) پر بادل چھا جائے اُس کی اطاعت و فرمانبرداری ابھی تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ اُس کی تجاویز ابھی پورے طور پر سرانجام نہیں ہوئی تھیں۔ وہ موت کا ذائقہ اچھی طرح چکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک عورت کا ذکر سُنا ہے جو ایک نہایت دردناک مرض سے مرنے کو تھی۔ کہ جب اُس کے دُکھ اور تکلیف کو دیکھ کر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "نہیں میں ہوش میں مرنا چاہتی ہوں"۔ میرے نزدیک اس عورت نے مسیح کے مزاج کو پالیا تھا۔

یہ موقع اس امر کی بحث کے لئے کہ آیا قدرت کی اُن پیداواروں کا جن سے نشہ یا بے ہوشی پیدا ہوتی ہے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ کچھ بہت موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اس خاصیت والی جڑیں یا رس ہمیشہ سے دُنیا کی مختلف قوموں کو خواہ وہ وحشی ہوں یا شائستہ معلوم ہیں۔ اور انسانی زندگی کے معاملات میں ان چیزوں کو بہت کچھ دخل رہا ہے۔ ان کی تاریخ نہایت عجیب وغریب ہے۔ جھوٹے مذاہب کی پُر اسرار مجلسوں میں اُن کا استعمال ہوتا تھا۔ اور غیر اقوام کی نبوت اور جادوگری کے ساتھ بھی اُن کا بہت کچھ تعلق پایا جاتا ہے۔ حواس کے ذریعہ سے وہ ذہن پر ایسا اثر کرتی ہیں کہ اُس عالم اسرار کے دروازہ کھل جاتے ہیں۔ جن کی دہشت وہیبت سے انسان معمولی حالت میں بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ طبیب بھی اُن کا بہت استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور زمانہ حال میں بھی افیون اور دیگر منشی اشیاء کی صورت میں ان کے سبب سے بہت سے سخت اخلاقی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جن کا حل کرنا ضروریات سے سمجھا جاتا ہے۔

اس سوال پر کہ آیا اس قسم کی اشیاء کو تفریح وتازگی کے لئے استعمال کرنا چاہتے۔ یا نہیں۔ ہم اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتے۔ اس وقت صرف اس امر پر غور کریں گے۔ کہ آیا ہوش وآگاہی کو کم کرنے کے لئے اُن کا استعمال مناسب ہے یا نہیں۔ ہمارے ہی زمانہ میں ایک انگریز نے کلورافارم کی خاصیت کو دریافت کرکے بنی انسان پر ایک نہایت ہی بڑا احسان کیا ہے۔ جب کہ اس طور پر بے ہوشی پیدا کرکے سرجن ایک عمل جراحی کو کر سکتا ہے۔ جو دوسری صورت میں ناممکن ہوتا۔ یا جب بخار کی آخری نوبت پر خواب آور دوائی کے ذریعہ بیمار کے تھکے ہارے جسم کو بیماری کے مقابلہ کے لئے مدد مل جاتی ہے۔ اور اس طور اُس کی جان بچ جاتی ہے۔ تو ہم خُدا کا شکر کرتے ہیں۔ کہ آج کل کے علم وفن کو اس قسم کے مفید سامان حاصل ہو گئے ہیں۔

برخلاف اس کے ان فوائد کے ساتھ کئی ایک سخت نقصانات بھی ملے ہوئے ہیں۔ لاکھوں مرد وعورت ان اشیاء کو استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ تاکہ اپنی نسوں کی حس کو کمزور کر دیں۔ اور درد وغم کی حالت میں جو خُدا نے اس لئے بھیجے ہیں کہ ہوش وحواس بجا ہونے کی حالت میں دلیری کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ جیسا کہ یسوع نے صلیب پر کیا۔ وہ اپنے دماغی قواء (قوت) کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ طبابت (ڈاکٹری) پیشہ لوگوں پر اس امر کی ذمہ داری کا مدار ہے کہ وہ اُس سامان کو جو خُدا نے اُن کے ہاتھوں میں ایک اچھی غرض کے لئے رکھا ہے۔ زندگی کے اُن سنجیدہ اور دردناک موقعوں کے ضائع کرنے میں استعمال نہ کریں۔ یہ بات ایک ابدی سچائی ہے کہ درد ورنج رُوح کی تربیت کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی حالتوں میں سے نشہ سے بدمست ہو کر گذر جانا۔ روحانی واخلاقی نشوونما کے نہایت عمدہ موقعوں کو کھو دینا ہے۔ مرد وعورت دُکھ وتکلیف کے وسیلہ سے کامل کئے جاتے ہیں۔ لیکن دُکھ جب ہی اپنا کام کرے گا۔ جب اُسے محسوس کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو گی کہ خُدا کی ضربوں اور صدموں کو سہنے کے لئے آسانی ڈھونڈی جائے۔ مثلاً خُدا ہمارے کسی عزیز کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ تاکہ اس ذریعہ سے ہمارے گھر کو پاک کرے مگر ممکن ہے کہ خُدا کا یہ مقصد پورا نہ ہو۔ صرف اس وجہ سے کہ گھر کے لوگ سخت مشغولیت کی حالت میں ہیں۔ یا اس لئے کہ بہت سے لوگ آجا رہے ہیں۔ یا زبانوں کے شور وغوغا سے جو اپنے

نزدیک تسلی اور غم خواری کے کام میں مشغول ہیں۔ خُدا کے پیغامبر باہر نکالے جاتے ہیں۔ یہ تو ایک طبعی بات ہے کہ طبیب اور دوست اقربا(رشتہ دار)ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں۔ کہ کس طرح غم ناک کا غم ہلکا ہو جائے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارہ میں حد سے بڑھ کر کامیابی حاصل کریں۔ اگرچہ یروشلیم کی خواتین کا یہ دستور بہت اچھا تھا۔ مگر اُن کے رحم دل ہاتھوں کا یہ تحفہ ہمارے خُداوند کو آزمائش کا پیالہ معلوم ہوا۔ اور اُس نے اُسے اپنے سے پرے ہٹا دیا۔

۲۔

اب سب کچھ تیار تھا اور سپاہیوں نے اپنا خوفناک کام شروع کیا۔ میں نہیں چاہتا کہ صلیب کے تمام دُکھوں کو تفصیل وار بیان کر کے خواہ مخواہ اپنے ناظرین کے خیالات اور حسات کو صدمہ پہنچاؤں۔ اگر میں چاہتا بھی۔ تو ایسا کرنا بالکل آسان ہوتا۔ کیونکہ صلیبی موت ایک نہایت ہی خوفناک قسم کی موت تھی۔ رومی حکیم (سیرو) جو اس سے خوب واقف تھا۔ لکھتا ہے کہ ''یہ سب سزاؤں سے زیادہ بے رحمانہ اور شرمناک سزا تھی''۔ وہ پھر لکھتا ہے کہ ''یہ سزا ایک رُومی کے جسم پر کبھی نہ دی جائے۔ نہیں بلکہ اُس کے خیالوں یا آنکھوں یا کانوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائے''۔ یہ سزا صرف غلاموں یا باغیوں کو دی جاتی تھی۔ جس سے یہ مقصود ہوتا تھا۔ کہ اُن کی موت لوگوں کے لئے خاص کر عبرت کا باعث ہو۔

صلیب کی غالباً وہی شکل تھی۔ جو عموماً بنائی جاتی ہے۔ ایک سیدھی لکڑی جس کی چوٹی کے قریب ایک اور لکڑی اُس پر آڑی لگی ہوتی ہے۔ اس کے سواد و اور شکلیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک تو انگریزی حرف T کی مانند اور دوسری حرف X کی مانند۔ مگر چونکہ لکھا ہے۔ کہ یسوع کا جرمنامہ اُس کے سر کے اُوپر لگا تھا۔ اس لئے ضرور ہے کہ اُس کے سر کے اُوپر لکڑی کچھ اُبھری ہوئی ہو۔ ہاتھ غالباً دونوں جانب لکڑی سے باندھے گئے ہوں گے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مارے بوجھ کے ہاتھ کے زخم بالکل چر جاتے۔ اسی غرض سے کھڑے ہوئے کھنبے کے نیچے کی طرف بھی لکڑی کا ایک ٹکڑا جسم کو سہارا دینے کے لئے لگا ہو گا۔ پاؤں یا تو اکٹھا میخوں کے ساتھ اس لکڑی پر جڑے گئے تھے۔ یا علیحدہ علیحدہ۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا جسم صلیب کی لکڑی کے کھڑے کئے جانے اور زمین میں گاڑے جانے سے پہلے اُس پر جڑا گیا تھا۔ یا پیچھے۔ سر لکڑی سے بندھا ہوا نہ تھا۔ اور اس لئے لٹکنے والا اُن لوگوں کو جو صلیب کے آس پاس کھڑے تھے دیکھ سکتا اور اُن سے بات چیت کر سکتا تھا۔

آج کل جہاں تک ممکن ہو موت کی دردوں کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ موت فی الفور واقع ہو۔ اور اگر کسی وجہ سے جان کنی کی تکلیف زیادہ دیر تک رہے تو اس سے لوگ بہت ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن صلیب کی موت میں سب سے خوفناک بات یہ تھی۔ کہ جان بوجھ کر اس جان کنی کی حالت کو طول دیا جاتا تھا۔ آدمی عموماً دن بھر جیتا لٹکا رہتا تھا۔ اور بعض وقت دو تین تین دن تک اُس کے ہوش و حواس بجا رہتے تھے۔ اور اس اثنا میں ہاتھوں اور پاؤں کے زخموں کی جلن لٹکتے جسم کی بے چینی و بے قراری نسوں کا پھول جانا۔ اور سب سے بڑھ کر ناقابلِ برداشت پیاس کی شدت دم بدم بڑھتی جاتی تھی۔ یسوع نے بہت دیر تک تکلیف نہ اُٹھائی۔ تاہم چار پانچ گھنٹہ لٹکے رہ کر جان دی۔

مگر اب میں اس دردناک اور ہیبت ناک نظارہ کے متعلق اور تفصیلیں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کس حد تک یہ تمام تکلیفیں اُس کی ایذا کے پیالہ کا ضروری حصّہ تھیں کیا یہ امر غیر لازمی تھا۔ کہ وہ کس موت سے مرے؟ کیا اگر وہ پھانسی دیا جاتا یا اس کا سر قلم کیا جاتا تو یہ بھی ایسا ہی کام دے جاتا۔ ہم اس بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فقط اُس وقت جب ہم کو یہ راز معلوم ہو کہ اُس کی رُوح کو کیا تکلیف ہوئی۔ اُس وقت ہم کہہ سکیں گے۔ کہ اُس کی جسمانی موت کے لئے ایسی شرمناک اور دردانگیز قسم کی موت کہاں تک مناسبت رکھتی تھی۔

مگر مسیح کی حقیقی تکالیف جسمانی نہیں بلکہ باطنی تھیں۔ اُس کی صورت پر نظر کرنے سے ہمیں کسی اور غم کا سایہ نظر آتا ہے۔ جو ظاہری جلتے ہوئے زخموں اور نہ بجھنے والی پیاس اور تڑپتے ہوئے جسم سے کہیں گہرا تھا۔ یہ اُس ردشدہ محبت کا رنج تھا۔ یہ اُس دل کی نااُمیدی تھی۔ جو محبت و رفاقت کی تلاش میں تھا۔ مگر اُس کے عوض اُسے تحقیر و نفرت سے سابقہ پڑتا تھا۔ یہ اُن بدیوں اور بے عزتیوں کا رنج و غم تھا۔ ہاں یہ وہ ناقابل بیان رنج تھا۔ جو وہ اُن لوگوں کے لئے کھینچ رہا تھا۔ جنہیں وہ بچانا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہیں مانتے تھے۔ مگر یہی سب سے گہرا سایہ نہیں تھا۔ اُس وقت نجات دہندہ کے دل میں ایک ایسا گہرا رنج و غم تھا۔ جس کے بیان کرنے کے لئے انسانی زبان میں لفظ نہیں تھا۔ وہ عالم کے گناہوں کے لئے جان دے رہا تھا۔ اُس نے بنی آدم کا گناہ اپنے اُوپر اُٹھالیا تھا۔ اور اب وہ اُس آخری جدوجہد میں مشغول تھا۔ تاکہ اُسے دور کرکے نابود کردے۔ اُس وقت صلیب پر صرف انسان یسوع مسیح کا جسم و خون ہی نہیں لٹک رہا تھا۔ بلکہ اُس کا جسم خفی بھی۔ یعنی وہ جسم جس کا وہ خود سر ہے اور اُس کے لوگ اُس کے اعضاء ہیں۔ اُس جسم میں بھی میخیں گاڑی گئی تھیں۔ اور اُس پر بھی موت نے اپنا انتقام لیا۔ اُس کے لوگ بھی اُس کے ساتھ جسم کی نسبت مرگئے۔ تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں۔

یہ ایک راز ہے۔ مگر یہی بات اُس نظارہ کی عظمت بھی ظاہر کرتی ہے جب تک کہ وہ اُس پر نہیں لٹکا تھا۔ صلیب غلامی اور شرارت کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ مگر اُس نے اُسے بہادری۔ خود انکاری اور نجات کے نشان میں بدلہ ڈالا۔ یہ محض لکڑی کی خون آلودہ بلیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ جسے چھُونا بھی شرم کی بات سمجھی جاتی تھی۔ مگر اُس وقت سے ایک دُنیا اُس پر فخر کرتی رہی ہے۔ وہ ہر طرح کی خوب صورتی کے ساتھ ہر بیش قیمت چیز پر کھودی جاتی ہے۔ وہ قوموں کے جھنڈوں پر نظر آتی ہے۔ اور بادشاہوں کے تاجوں اور عصائے سلطنت پر منقش دیکھی جاتی ہے۔ جو صلیب گلگتا پر نصب کی گئی تھی۔ وہ تو ایک معمولی خشک لکڑی تھی۔ مگر دیکھو وہ عصائے ہارون کی طرح پھوٹ نکلی ہے۔ اُس نے اپنی جڑیں دُنیا کے دل کے اندر گہر جمادی ہیں۔ اور اپنی ٹہنیاں اُوپر آسمان کی طرف پھیلادی ہیں۔ یہاں تک کہ آج سارے تختہ زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور قومیں اُس کے سایہ میں آرام کرتی اور اُس کے پُر مزہ میووں کو کھاتی ہیں۔

۳۔

آخر کار یہ خوفناک تیاریاں ختم ہوگئیں۔ اور نجات دہندہ کو یہودیوں کی نفرت بھری آنکھوں کے سامنے جو شکاری کتوں کی طرح اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ بلند کردیا گیا۔ لیکن جب کاہنوں۔ فریسیوں اور عوام الناس نے اپنی کامیابی سے بھری ہوئی نظروں کے ساتھ اُس پر نظر کی۔ تو اُن کے دل سرنگوں (جھک) ہوگئے۔ کیونکہ اُس مظلوم کے عین سرپر اُن کو کچھ نظر آیا۔ جس سے اُن کے دل پاش پاش ہوگئے۔

آلہ قتل کے ساتھ مجرم کے جرائم کا حال لکھ کر چسپاں کرنے کا اکثر ملکوں میں آج کل بھی رواج پایا جاتا ہے۔ پادری گلمور صاحب کی سوانح عمری میں جو عرصہ تک منگولیا میں مشنری رہے تھے۔ چین میں کسی مجرم کو سزائے قتل دیئے جانے کا ذکر درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ اُس گاڑی پر جس میں اُس کو قتل گاہ کی طرف لے گئے ایک تختی لگی تھی۔ جس پر اُس کی ساری بداعمالیوں کا ذکر درج تھا۔ رومیوں میں یہ رسم تھی۔ اور عموماً ایک افسر آگے آگے جایا کرتا تھا اور مجرم کے جرائم کا اعلان کرتا جاتا تھا۔ اناجیل میں اس قسم کے کسی افسر کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اور نہ وہ کتبہ بھی پیشتر اس کے کہ صلیب پر نصب کیا ہوا دکھائی دیا کسی نے دیکھا تھا۔ یہ صلیب کی سیدھی لکڑی کی چوٹی پر لگا تھا۔ اور پیلاطس نے اس طور سے یہودیوں سے اُس سارے دُکھ و رنج کا انتقام لیا تھا۔ جو اُن کے ہاتھوں سے اُسے پہنچا تھا۔ وہ غصہ کی حالت میں ان سے جُدا ہوا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اُسے خوب ذلیل کیا تھا۔ مگر اُس نے اُن کے پیچھے پیچھے ایک ایسی چیز بھیجی۔ جس نے اس کامیابی کے گھڑی میں بھی اُن کے خوشی کے پیالے میں زہر کے قطروں کا کام دیا۔ جب کہ وہ اُس کی کرسی عدالت کے سامنے

کھڑے تھے۔ تواُس کی آخری چوٹ جواُس نے اُن پر کی یہ تھی۔ کہ اُس نے دکھاوئے کے طور پر یہ ظاہر کیا کہ وہ در حقیقت یسوع کواُن کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ اسی ضرب کواب اُس نے اور بھی زور سے لگایااور کتبہ پر یہ الفاظ لکھ دیئے۔ یہ یسوع یہودیوں کا بادشاہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ جتانا مقصود ہے کہ " جو یہودیوں کا بادشاہ ہواُس کا یہ حال ہوگا۔ رُومی اُس کے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ اس قوم کا بادشاہ ایک غلام اور مصلوب مجرم ہے۔ اور جب کہ بادشاہ کا یہ حال ہے تو جس قوم کا وہ بادشاہ ہے اُس کا کیا حال ہوگا"؟

یہ دیکھ کر یہودیوں کو ایسا غصّہ آیا کہ انہوں نے فی الفور گورنر کے پاس کچھ لوگوں کو بھیج کر اُس کی منت کی کہ ان الفاظ کو بدل دے۔

بلاشبہ وہ انہیں دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا ہوگا۔ کیونکہ اُن کے آنے سے اُس پر ثابت ہوگیا۔ کہ اُس کے الفاظ نے کیسا گہرا زخم لگایا ہے۔ مگر اُن کی عرض کو سُن کر اُس نے فقط ہنس دیا۔ اور بڑی تمکنت اور اقتدار کے لہجہ میں جو رومی حاکموں ہی کا حصّہ تھا۔ یہ کہہ کر اُنہیں ہنکادیا کہ "جو کچھ میں لکھ چکا سو لکھ چکا"۔

اس وقت تواُس کا یہ رویہ آزادی اور خصلت (عادت) کی مضبوطی کا اظہار معلوم ہوتا تھا۔ مگر دراصل یہ اُس کی کمزوری کے چھپانے کے لئے بطور ایک پردہ کے تھا۔ اُس نے کتبہ کی بابت تواپنی مرضی کو پورا کرلیا جو ایک ادنی سی بات تھی۔ مگر وہ اُس کے ہاتھوں صلیب کا حکم لکھوانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ وہ انہیں چڑانے یا کھجانے میں تو مضبوط تھا مگر اُس میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ اُن کی مرضی کو رد کرسکتا۔

لیکن اگرچہ پیلاطس کے ذہن میں یہ کتبہ محض ایک تمسخر تھا۔ جواُس نے یہودیوں سے انتقام لینے کے لئے لکھا تھا۔ مگر اس سے بھی الٰہی منشا (خُدا کی مرضی) پورا ہورہا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھ دیا سو لکھ دیا۔ لیکن اگر وہ اصل حقیقت سے واقف ہوتا تووہ یوں کہتا کہ "جو کچھ میں نے لکھا ہے سو خُدا نے لکھا ہے"۔ بعض اوقات میں اور بعض مقامات میں ساری ہوا الٰہی حضوری کی کہربائی قوت سے ایسی بھر جاتی ہے۔ کہ وہاں کی ہر ایک چیز مصدر و مورد الہام و وحی ٹھہر جاتی ہے۔ اور یہ بات اس صلیب کے موقع پر بوجہ اولیٰ صادق (سچی) آتی ہے۔ پیلاطس پہلے ہی انجانے نبیوں کی سی باتیں کرچکا تھا۔ جب اُس نے یسوع کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا۔ کہ "اس آدمی کو دیکھو"۔ اور یہ ایسے الفاظ تھے۔ جو برابر صدیوں میں گونجتے چلے آئے ہیں۔ اوراب زبانی نبوت کرنے کے علاوہ اُس نے گویا تحریری نبوت بھی کی۔ کیونکہ کوئی بالائی قدرت وطاقت اُس کے قلم سے یہ الفاظ لکھوارہی تھی۔ کہ "یہ یسوع یہودیوں کا بادشاہ ہے"۔

یہ امر اس کتبہ کو اور بھی پُر معنی بنادیتا ہے۔ کہ یہ تین زبانوں یعنی عبرانی۔ یونانی اور لاطینی میں لکھا تھا۔ پیلاطس کے ایسا کرنے سے یہ غرض تھی۔ کہ اپنے طنزیہ الفاظ میں زور پیدا کردے۔ اُس کی یہ خواہش تھی۔ کہ تمام اجنبی لوگ جواُس وقت یروشلیم میں عید کے موقع پر آئے تھے۔ اُس کتبہ کو پڑھ سکیں۔ کیونکہ اُن میں سے سب کے سب جو پڑھنے کے قابل تھے۔ ان تینوں زبانوں میں سے ایک نہ ایک سے ضرور واقف ہوں گے۔ مگر تقدیر کا منشا اس بات سے کا منشا کچھ اور ہی تھا۔ قدیمی دُنیا کی یہی تین بڑی زبانیں تھیں۔ جنہیں گویا ساری زبانوں کا قائم مقام سمجھنا چاہیے۔ عبرانی وحی و مذہب کی زبان ہے۔ یونانی تہذیب و شائستگی کی۔ لاطینی قانون اور حکومت کی۔ اور مسیح کو ان تینوں زبانوں میں بادشاہ مشہور کیا گیا۔ اُس کے سر پر بہت سے تاج ہیں۔ وہ دین و مذہب کا بادشاہ ہے کیونکہ وہ نجات۔ تقدس اور محبت کا شاہزادہ ہے۔ وہ تہذیب و شائستگی کا بھی بادشاہ ہے۔ اور فنون شریفہ۔ موسیقی۔ علم ادب و فلسفہ کے خزانے سب اُسی کی ملکیت ہیں۔ اور سب ایک نہ ایک دن اُسی کے قدموں پر رکھے جائیں گے۔ وہ سیاستی دُنیا کا بھی حاکم ہے۔ کیونکہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ اور خُداوندوں کا خُداوند ہے۔ اور بدنی تعلقات۔ تجارت و حرفت غرضیکہ انسان کے تمام کاروبار پر حکمران ہے۔ ہم نے الحقیقت اس وقت سب چیزوں کواُس کی تحت میں نہیں دیکھتے۔ مگر ہم روز بروز دیکھتے رہتے ہیں۔ کہ وہ رفتہ رفتہ اُس کے پاؤں کے نیچے آتی چلی جاتی ہیں۔ یسوع کا نام ہر

جگہ صفحہ زمین پر پھیلتا جاتا ہے۔ہزاروں آدمی اُس نام کو لینا سیکھتے جاتے ہیں۔لاکھوں اُس نام کے لئے جان دینے کو تیار ہیں۔اور یہی پیلاطس کی انجانی نبوت ہے۔جو برابر پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔

تیرھواں باب

صلیب کے گردا گرد کے مجمعے

گذشتہ باب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ابنِ آدم کو اس لعنتی درخت کے ساتھ میخوں سے جڑ دیا گیا۔یہاں وہ گھنٹوں تک اس بے چارگی اور درماندگی (لاچاری۔تکلیف) کی حالت میں سب کی نظروں کے سامنے برابر لٹکا رہا۔وہ سارے وقت برابر ہوش میں تھا۔اور آخری دم تک برابر اُن لوگوں کی صورتوں کو جو وہاں جمع تھے۔دیکھ سکتا تھا۔ہمارے ملک میں بھی جب لوگ عام طور پر پھانسی پر چڑھائے جاتے تھے۔اس تماشے کو دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔اس وقت یروشلیم میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔جب یسوع صلیب دیا گیا تو وہ عیدِ فسح کا موقع تھا۔اور شہر میں بے شمار لوگوں کا جو دور دراز مقامات سے آئے ہوئے تھے۔بڑا مجمع تھا۔عوام الناس کے لئے اس قسم کے موقع بہت غنیمت ہوا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ یسوع کے مقدمہ نے نہ صرف دارالسطنت بلکہ سارے ملک کو ہلا دیا تھا۔

جو گروہ اُس وقت اس نظارہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئی تھی۔اب ہم جانتے ہیں۔اتنی بڑی شاید اسی قسم کے موقع پر دُنیا بھر میں کبھی اکٹھی نہ ہوئی ہوگی۔فرشتے اور مقرب فرشتے اس میں محو ہو رہے تھے۔کروڑہا مرد و عورت اس وقت بلکہ ہر روز اُس پر نظر کر رہے ہیں۔لیکن ان لوگوں کے دل پر جنہوں نے اُس روز اُسے ملاحظہ کیا کیا تاثیر ہوئی تھی؟اس امر کو معلوم کرنے کے لئے آؤ ہم تین مختلف جماعتوں پر جو صلیب کے قریب کھڑی تھیں۔نظر کریں۔جس کے خیالات میں اُن کے ارد گرد کے بہت سے لوگ شریک تھے۔

ا۔

پہلے اُس جماعت پر نظر کرو۔جو صلیب کے بہت ہی قریب کھڑی ہے یہ رومی سپاہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رومی فوج میں یہ قاعدہ تھا کہ جب سپاہی کسی کو سزائے موت دیتے تھے۔تو مجرم کے کپڑے اور مملوکات (مجرم کی چیزیں) ان سپاہیوں کے حصّہ میں آتے تھے۔اگرچہ وہاں بہت سے سپاہی موجود تھے۔مگر کھنبوں کا کھڑا کرنا۔ہتھوڑے اور میخوں کا استعمال۔صلیب کو کھڑا کرنا وغیرہ صرف چار آدمیوں کے ہاتھ سے سرانجام ہوا ہوگا۔اس لئے اُس کے اسباب کے صرف یہی چار سپاہی حق دار تھے۔اور اب وہ فی الفور اپنے مال غنیمت کو تقسیم کرنے کی فکر میں لگے۔کیونکہ صلیب دیئے جانے کے وقت مجرم کے سب کپڑے اُتار لئے جاتے تھے۔جو ایک بڑی شرمناک بات تھی۔ایک لمبا چوڑا جبہ جو سب سے اُوپر پہنا جاتا تھا۔شاید ایک عمامہ ایک کمر بند اور نعلین (جوتے) کا ایک جوڑا۔اور نیز ایک کُرتہ [1] جیسا کہ عموماً گلیل کے دہقان (مزدور) پہنتے تھے۔جو کاٹ کر سیا ہوا نہیں۔بلکہ سراسر ایک ٹکڑا ہوتا تھا۔اور اُس کی ماں نے اپنی محبت بھری انگلیوں سے اُس کے لئے بنا ہوگا۔یہ

[1] ۔ چونکہ بالکل برہنہ کرنا یہودیوں کے نزدیک قابل اعتراض تھا۔اس لئے اور شیم صاحب اس امر پر بحث کرکے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔کہ کوئی نہ کوئی کپڑا افسر ورخُداوند کے جسم پر چھوڑا گیا ہوگا۔اگرچہ وہ بھی اس اُمر کو کامل طور پر پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا سکے۔

سب کپڑے سپاہیوں کے حصّہ میں آئے ہوں گے۔یہی یسوع کی ساری جائیداد تھی۔جو اُس نے پیچھے چھوڑی۔اور یہ چار سپاہی گویا اُس کے وارث تھے۔ لیکن یہ وہ شخص تھا۔جس نے ایسا بڑا ورثہ اپنی وصیت میں چھوڑا۔جس کے برابر آج تک کسی آدمی نے چھوڑا ہوگا۔ہاں ایسا ورثہ جو گویا سارے عالم پر حاوی تھا۔البتہ یہ ایک روحانی وراثت تھی۔یعنی حکمت۔تاثیر اور عمدہ نمونہ کی وراثت۔

سپاہی اپنے خوفناک کام سے فارغ ہو کر صلیب کے نیچے مال غنیمت تقسیم کرنے کو بیٹھ گئے۔اس سے نہ صرف انہیں کچھ ہاتھ لگا بلکہ مفت میں ایک قسم کا شغل بھی مل گیا۔کیونکہ دوسری اشیاء کو جس طرح ہو سکا تقسیم بھی مل گیا۔کیونکہ دوسری اشیاء کو جس طرح ہو سکا تقسیم کر کے اب انہوں نے قمیص پر جسے وہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتے تھے۔چٹھیاں ڈالنی شروع کیں۔اُن میں سے ایک نے اپنی جیب میں سے پانسہ کا ایک دانہ نکالا۔کیونکہ جو اکھیلنا رومی سپاہیوں کا عام مشغلہ تھا۔اور اس طور سے انہوں نے اس مشکل کو حل کیا۔دیکھو۔وہ کیسے ہنسی ٹھٹھا کرتے اور قہقے لگا رہے ہیں۔اور اُن کے پاس ہی مشکل سے ایک گز کے فاصلے پر وہ صورت اُن کی طرف دیکھ رہی ہے۔اور کیسی صورت !ابن اللہ دُنیا کے گناہوں کا کفارہ دے رہا ہے۔اور جب کہ فرشتے اور مقدس ارواح آسمانی شہر کی دیواروں پر سے اس نظارہ کو دیکھ رہے ہیں۔اُس کے پاک جسم سے صرف ایک گز کے فاصلہ پر سپاہی بے پروائی کے ساتھ اُس کے ناچیز کپڑوں کے ٹکڑوں پر جوا کھیل رہے ہیں۔ان لوگوں کو حالانکہ اُس سے اس قدر قریب تھے۔اس عظیم الشان ڈراما کا فقط اسی قدر رُرخ نظر آیا۔کیونکہ گہرا اثر کرنے کے لئے جس قدر ایک بڑے عظیم نظارہ کی ضرورت ہے۔اُسی قدر دیکھنے والی آنکھ کا ہونا بھی ضرور ہے۔ایسے لوگ ہیں۔جن کی نظر میں یہ زمین نہایت مقدس ہے۔صرف اس لئے کہ یسوع نے اپنے قوموں سے اُسے چھوا۔آسمان بھی مقدس ہے۔کیونکہ یہ اُس پر شامیانہ کئے تھا ۔تاریخ مقدس ہے کیونکہ اُس کا نام اُس کے صفحوں پر ثبت تھا۔زندگی کے روزمرہ کے تمام کاروبار مقدس ہیں۔کیونکہ یہ سب اُس کے نام سے کئے جاتے ہیں۔مگر کیا خود مسیحی ممالک میں بھی ایسے اشخاص نہیں پائے جاتے جو اس طور سے زندگی بسر کرتے ہیں۔گویا اُن کے نزدیک مسیح کبھی اس دُنیا میں نہیں آیا۔اور جن کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس امر سے کہ یسوع اس دُنیا میں جس میں ہم بودوباش رکھتے ہیں۔آکر رہا ہمارے لئے کیا کچھ فرق واقع ہو گیا ہے ؟

۲۔

اب دوسری جماعت پر نظر کرو۔جو مذکورہ بالا جماعت سے کہیں زیادہ ہے۔اور جس میں صدر مجلس کے ممبر شریک ہیں۔

اپنی عدالت میں اُس پر فتویٰ لگا کر وہ اُسے گورنر کی عدالت میں لے گئے۔اور اُس کی تحقیقات کے ہر درجہ پر اُس کے ہمراہ رہے۔اور آخر کار پیلاطس سے اُس کے قتل کا فتویٰ لینے میں کامیاب ہوئے۔جب آخر کار وہ جلادوں کے حوالہ کیا گیا۔تو یہ خیال ہو سکتا تھا۔کہ اب وہ اس تمام لمبی چوڑی کارروائی عدالت سے ماندہ ہو کر خوشی خوشی اپنے گھر کا راستہ لیں گے۔مگر اُن کا جوش وغضب اب بھی بھڑک رہا تھا۔اور اُن کے انتقام کی پیاس ایسی سخت تھی۔کہ وہ سپاہیوں کو اپنا کام کرنے کے لئے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔بلکہ اپنی عزت ومرتبہ کو بھول کر وہ عوام الناس کے ہمراہ قتل گاہ میں جا موجود ہوئے۔اور مظلوم کے دردودُکھ کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہے۔جب وہ اوُپر صلیب پر بلند کر دیا گیا تھا۔تب بھی اُن کی زبانوں کو آرام نہ آیا۔اور مرتے دم تک اُسے تنہا نہ چھوڑا۔بلکہ انسانیت اور مناسبت سب کچھ بالائے طاق رکھ کر انہوں نے منہ بنانا اور آوازے کسنا شروع کیا۔عوام الناس نے بھی طبعی طور پر اُن کی نقل کرنی شروع کی۔یہاں تک کہ نہ صرف سپاہی بلکہ چور بھی جو اُس کے ساتھ صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔اس میں شریک ہو گئے۔اس لئے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا۔کہ گویا یہ ساری جماعت لعنت ملامت کا سمندر ہے جس کی غضب ناک لہریں صلیب کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔

وہ اب سب بڑے بڑے نام جو اُس نے اپنی طرف منسوب کئے تھے۔ یا جن سے لوگ اُسے پکارتے تھے اُسے یاد دلاتے تھے۔ اور اُس کی موجودہ حالت سے اُس کا مقابلہ کرتے تھے۔ "خُدا کا بیٹا"۔ "خُدا کا برگزیدہ" "اسرائیل کا بادشاہ"۔ "مسیح"۔ "یہودیوں کا بادشاہ"۔ "تو جو ہیکل کو ڈھانے اور تین دن میں بنانے والا ہے"۔ ان ناموں سے پکار پکار کر وہ اُس کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ وہ اُسے للکارتے تھے۔ کہ اب صلیب پر سے اُتر آتو ہم تجھ پر ایمان لائیں گے۔ اس بات کو وہ بار بار دُہراتے تھے۔ کہ اُس نے دوسروں کو بچایا مگر اپنے کو نہیں بچا سکتا۔ وہ ہمیشہ سے یہ کہتے تھے کہ وہ شیطان کی قدرت سے اپنے معجزے کرتا تھا۔ مگر ان بدروحوں سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہایت خوفناک بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے کسی کو اپنی قوت مستعار (ادھار) دیں۔ لیکن آخر وہ اُس سے اپنی منہ مانگی قیمت طلب کرتے ہیں۔ اور نازک وقت میں وہ اپنے پیروؤں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک یسوع کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب آخری دم اُس کا جادو کا عصا ٹوٹ گیا۔ اور اُس کی ساری جادوگری کی طاقت زائل (ختم) ہو گئی۔

جب وہ اس طرح سے اپنے دل کا زہر اُگل رہے تھے۔ جو مدت سے اُن کے دلوں میں جمع ہو رہا تھا۔ تو اُن کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ درحقیقت وہی الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ جو زبور ۲۲ میں کسی مظلوم کے مخالف اُس کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ "اُس نے خدا پر بھروسہ کیا۔ وہ اب اُسے چھڑائے۔ اگر وہ اُسے پسند کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا تھا۔ کہ میں خُدا کا بیٹا ہوں۔ سرد مزاج مورخوں (تاریخ دان) نے اس امر میں شک ظاہر کیا ہے کہ آیا ممکن تھا کہ وہ اس قسم کے الفاظ کہتے اور اُن کا مطلب نہیں سمجھتے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ زمانہ حال ہی میں ایک بات واقع ہوئی ہے۔ جو بالکل اُسی کے مطابق ہے جب سوئٹرزلینڈ کے مصلحینِ دین (دین کی اصلاح کرنے والے) میں سے ایک شخص پوپ کی عدالت کے سامنے جواب دہی کر رہا تھا۔ تو صدرِ عدالت نے ٹھیک انہیں الفاظ میں جو قائفا نے صدر مجلس کے ممبروں کو کہے تھے۔ اُسے ٹوکا۔ "اُس نے کفر بکا۔ ہمیں اور گواہوں کی کیا ضرورت ہے تمہارا کیا خیال ہے؟"۔ اور اُن سب نے جواب دیا کہ "وہ قتل کے لائق ہے"۔ اور جب تک خود اُس شخص نے اُسے یاد دلایا اُن کو ہرگز معلوم نہ ہوا کہ وہ انجیل کے فقرات کو نقل کر رہے ہیں۔

یسوع اگر چاہتا تو اپنے دشمنوں کی ان باتوں کا جواب دے سکتا تھا۔ کیونکہ صلیب پر لٹکنے والے کے لئے نہ صرف سُننا اور دیکھنا بلکہ گفتگو کرنا بھی ممکن تھا۔ مگر وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ وہ گالی کھا کر گالی نہ دیتا تھا۔ جیسے بھیڑ اپنے بال کترنے والوں کے آگے بے زبان ہے۔ اُسی طرح اس نے اپنا منہ نہ کھولا۔ مگر اُس کی یہ وجہ نہ تھی۔ کہ وہ ان باتوں کو محسوس نہ کرتا تھا۔ اُن میخوں کی نسبت جو اُس کے جسم میں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ عداوت کے تیر زیادہ تیزی کے ساتھ اُس کے دل میں چبھتے تھے۔ دلِ انسان نے اپنی نہایت کمینہ اور تاریک گہرائیاں اُس کی آنکھوں کے عین سامنے کھول کر رکھ دیں۔ اور اُس کی تمام گندگی اُس پر پھینکی گئی۔

یہ دیکھ کر تعجب (حیرانگی) ہوتا ہے۔ کہ جب ہر طرف سے اُسے یہ کہا جاتا تھا۔ کہ صلیب پر سے اُتر آتو کیا یہ بھی اُس کے لئے ایک قسم کی آزمائش تھی؟ یہ کچھ کچھ اُسی قسم کی آزمائش تھی جو اُس کی رسالت کے شروع ہی میں اُسے پیش آئی تھی۔ جب کہ شیطان نے اُسے ہیکل کے کنگرے پر لے جا کر کہا تھا کہ یہاں سے اپنے کو نیچے گرادے۔ یہی آزمائش مختلف صورتوں میں عمر بھر اُس کے پیچھے لگی رہی۔ اور اب اُس کی عمر کے آخر وقتوں میں پھر اُس پر حملہ کرتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے تھے۔ کہ اُس کا صبر کمزوری کی علامت ہے۔ اور اُس کی خاموشی سے ثابت ہے کہ وہ اب ہار مان گیا ہے۔ وہ کیوں اُس وقت اپنا جلال سارے آب وتاب سے ظاہر کر کے اُن کا منہ بند نہیں کر دیتا؟ ایسا کرنا اُس کے لئے کیسا آسان تھا! لیکن نہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہ کر سکتا تھا۔ جب انہوں نے یہ کلمات استعمال کئے۔ تو بالکل سچ کہتے تھے۔ کہ "اُس نے اوروں کو بچایا۔ مگر اپنے کو نہیں بچا سکتا"۔ اگر وہ اپنے کو بچا لیتا تو نجات دہندہ کب ہوتا؟ لیکن وہ قدرت جس نے اُسے صلیب پر قائم اور اُس سے جو صلیب پر سے اُتر آنے کے لئے ضروری ہوتی کہیں قوی (مضبوط) تر تھی۔ اُسے وہ میخیں جو اُس

کے ہاتھوں یاپاؤں میں جڑی تھیں۔ وہاں پکڑے ہوئے نہ تھیں۔اور نہ وہ رسیاں جن سے اُس کے بازو بندھے تھے۔نہ وہ سپاہی جونیچے کھڑے پہرادے رہے تھے۔ ہر گز نہیں۔ بلکہ وہ غیر مرئی پیٹیوں (نظر نہ آنے والی)۔ہاں نجات دینے والی محبت اور الٰہی مشیت (خُدا کی مرضی) کی رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔

مگر اس بات کو اُس کے دشمن کب سمجھ سکتے تھے۔ وہ اُسے ایک نہایت ادنیٰ مقیاس (پیمانہ) سے تول رہے تھے۔اُن کے ذہن میں قدرت کا جو خیال جا گزین (بسا ہوا) تھا۔ وہ محض مادی چیزوں کے متعلق تھا۔اور جلال اور شان وشوکت اُن کے نزدیک خود غرضی کا نام تھا۔اُن کے ذہن میں جو نجات دہندہ کا خیال تھا۔ کہ وہ انہیں غیر قوم کی حکومت سے آزاد کرے گا۔ نہ یہ کہ وہ گناہ سے رہائی بخشے گا۔اور آج کے دن بھی مسیح کئی اطراف سے یہی پکا رسنتا ہے۔ کہ ''صلیب پر سے اُتر آ۔اور ہم تجھ پر ایمان لائیں گے''۔وہ لوگ جو رُوحانی باتوں میں بہت کم سمجھ رکھتے ہیں۔اور اپنی نالائقی اور قدوس خُدا کی عظمت اور حقوق سے ناواقف ہیں۔اس قسم کی باتیں کہہ اُٹھتے ہیں۔وہ گناہ اور سزا۔ کفارہ اور نجات کے معنوں کو نہیں سمجھتے۔اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُس کی موت کے گہرے معنوں کو مسیحی مذہب میں سے خارج کر دیا جائے۔تب وہ اُس پر ایمان لا سکیں گے۔وہ لوگ بھی جو اخلاقی لحاظ سے بزدل اور دُنیا پرست ہیں اسی قسم کی باتیں کہتے ہیں۔اور وہ بھی ایسے دین کے خواہاں ہیں جس میں صلیب کا نام ونشان نہ ہو۔اگر مسیحی دین فقط ایک عقائد نامہ ہوتا جسے مان چھوڑتے۔ یا ایک طریق عبادت ہوتا جس کے ادا کرنے میں انسان کی نزاکت و لطافت پسند قواء (نرم وملائم طبعیت) کو حظ (لطف) حاصل ہوتا۔ یا کوئی ایسی پوشیدہ راہ ہوتی۔ جس سے آدمی کسی کے دیکھے بوجھے بغیر چپ چاپ آسمان تک جا پہنچتا۔ تو وہ خوشی سے ایسے دین کو قبول کر لیتے۔ لیکن چونکہ اس میں مسیح کا اقرار کرنا اور اُس کے لئے ملامت کو سہنا۔اُس کے حقیر وذلیل لوگوں سے ملنا جلنا اور اُس کے مقصد کے پھیلانے میں امداد کرنا بھی شامل ہیں۔اس لئے وہ اُس سے کچھ غرض وواسطہ رکھنا نہیں چاہتے۔ کوئی شخص جس نے گناہ کی ذلت کو محسوس کر کے خاکساری اور فروتنی کے بھید کو معلوم نہیں کر لیا۔ مسیح کی صلیب کی کبھی عزت وتوقیر نہیں کر سکتا۔

۳۔

اب ہم ایک تیسری جماعت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ جماعت بھی بالکل مختصر سی ہے۔

جب مسیح کی آنکھ اُن صورتوں کے سمندر پر۔ جو اُس کی طرف اُٹھی ہوئی تھی اور جن پر ہر طرح کی تحقیر وعداوت کے آثار نظر آتے تھے۔ادھر اُدھر پڑتی رہی۔ تو کیا اُسے اُن کے درمیان کوئی بھی ایسا نقطہ نظر نہ آیا۔ جس سے اُس کی کچھ تسکین ہوتی؟ ہاں ان تمام کانٹوں میں بھی ایک سوسن تھی۔اس جماعت سے الگ باہر کی طرف اُس کے جان پہچانوں اور اُن عورتوں کی۔ جو اُس کے پیچھے پیچھے گلیل سے چلی آئی تھیں۔اور اُس کی خدمت کرتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی جماعت کھڑی تھی جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے۔اُن کے قابل عزت اسما(نام) یہ ہیں۔ مریم مگدلینی۔ مریم یعقوب اور یوسیس کی ماں۔اور زبدی کے بیٹوں کی ماں۔

اُن کے فاصلہ پر کھڑے ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ خوف کی حالت میں تھیں۔اپنے کو ایسے شخص کا رفیق (دوست) ظاہر کرنا جس کے خلاف حُکام کو اس قدر نفرت اور کینہ ہو۔ایسے موقع پر خطرہ سے خالی نہ تھا۔اور ایسے وقت میں اُن کا الگ تھلگ کھڑے رہنا مناسب بھی تھا۔ جو کچھ ان کو دشمنوں کی طرف سے خوف تھا سو تو تھا۔اُس کے علاوہ خود اُن کے اپنے دل سخت غم واندوہ (دکھ۔ فکر) سے بھر رہے تھے۔ ابھی تک وہ پاک نوشتوں کو نہیں سمجھتی تھیں۔ کہ ضرور ہے کہ وہ مردوں میں سے جی اُٹھے۔اور سارے معاملہ کو اس طور پر ضائع ہوتے دیکھ کر جس میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس

جہان اور اُس جہان کے لئے دے ڈالا تھا۔ اُن کی حالت دگرگوں (اُلٹ پُلٹ) ہو رہی تھی۔ انہیں یہ اعتماد تھا کہ یہ وہی ہے۔ جو اسرائیل کو رہائی بخشے گا۔ اور وہ اس رہائی یافتہ قوم پر ہمیشہ کے لئے سلطنت کرے گا۔ اور وہی شخص یہاں اُن کی آنکھوں کے سامنے اس شرم و بے عزتی کی حالت میں مر رہا تھا۔ اس صورت میں بھلا اُن کے اس یقین واعتماد کا کیا ٹھکانا تھا۔ یا یوں کہو کہ جو کچھ اب باقی رہ گیا تھا۔ وہ فقط اُلفت و محبت تھی۔ جو اُن کو اُس کی ذات سے تھی۔ اگر چہ اُن کے خیالات بالکل مضطرب (بے چین) اور پریشان ہو رہے۔ مگر اُن کے دل میں اُس کو اب بھی وہی جگہ حاصل تھی۔ وہ اُس کی دلدادہ (عاشق) تھیں۔ اُس کے دُکھ سے انہیں دُکھ تھا۔ اور اگر ممکن ہوتا تو وہ اُس کے لئے اپنی جان تک دینے میں دریغ نہ کرتیں۔

تو کیا ایسا یقین کرنا خلاف عقل ہے کہ یسوع کی آنکھیں جب تک اُن میں بینائی باقی تھی اُن وحشی سپاہیوں کی طرف سے جو صلیب کے نیچے بیٹھے تھے۔ اور اُن بگڑی ہوئی صورتوں کے سمندر کی طرف سے ہٹ کر بار بار اُسی جماعت کی طرف پھرتی ہوں گی۔ ایک طرح سے تو اُن پر نظر کرنا دشمنوں کے نفرت انگیز چہروں کی نسبت اُس کے لئے زیادہ درد کا باعث ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ ہمدردی ایسے شخص کے دل کو جو مخالفوں کے سامنے پتھر بنا رہتا ہے۔ پاش پاش (ٹکڑے ٹکڑے) کر دیا کرتی ہے۔ مگر تو بھی یہ ہمسایانہ ہمدردی اور زنانہ محبت اُس کے لئے نہایت گہری تسلی اور دلدہی کا باعث ثابت ہوتی ہوگی۔ اس دُکھ درد کی حالت میں اُسے اس خیال سے بہت کچھ تسکین ملتی ہوگی۔ کہ اُن تکلیفوں سے کس قدر بے شمار لوگ فائدہ حاصل کریں گے۔ مگر یہاں اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے اس انعام کا بیعانہ (پہلی قسط) موجود تھا۔ جس میں اُس نے اپنی جان کے دُکھ کا نتیجہ دیکھا اور سیر ہوا۔

۴۔

ان تین جماعتوں میں ہمیں مختلف قسم کی ذہنی حالتیں نظر آتی ہیں سپاہیوں میں نادردی۔ صدر مجلس والوں میں بیدردی۔ اور گلیل والوں میں ہمدردی۔ کیا آپ کے دل میں بھی کبھی اس قسم کا سوال پیدا ہوا ہے۔ کہ اگر تم وہاں ہوتے تو ان تینوں میں سے کس گروہ میں شامل ہوتے؟ یہ ایک بڑا نازک سوال ہے۔ البتہ اس وقت تو یہ بتا دینا بالکل آسان ہے۔ کہ اُن میں سے کون حق پر تھا۔ اور کون ناحق پر۔ گذشتہ زمانہ کے اُولوالعزم (ثابت قدم) لوگوں کو اور جو معاملات انہیں پیش آئے۔ تعریف و تحسین کی نظر سے دیکھنا آسان ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ہم ان باتوں کو تو پسند کریں۔ مگر خود ہمارے زمانہ میں جو اُسی قسم کے اُمور واقع ہو رہے ہیں۔ اُن کی طرف سے بالکل بے پروا یا اُن کے مخالف ہوں۔ وہ رومی سپاہی بھی جو صلیب کے نیچے بیٹھے تھے۔ ضرور رومُلس (بانی روم) یا بروٹس قاتل جولیس قیصر کے از حد ثناخواں (تعریف کرنا) ہوں گے۔ لیکن اُس شخص کے لئے جو بالکل اُن کے پاس تھا۔ اور ان سب سے بڑا تھا۔ اُن کے دل میں کچھ بھی کشش نہ تھی۔ یہودی جو مسیح کی ہنسی اُڑا رہے تھے۔ موسیٰ اور سموئیل اور یسعیاہ کے بڑے مداح (پسند کرنے والے) تھے۔ مسیح اب بھی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے دُنیا کی گلی کوچوں میں سے گذر رہا ہے۔ اور لوگوں کی نظروں کے سامنے لٹکا ہوا اُن کی حقارت اور بدسلوکی برداشت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ ممکن ہے۔ کہ ہم بائبل کے مسیح کے تو مداح و ثناخواں ہوں۔ لیکن اپنی صدی کے مسیح کے مخالف اور دُکھ دینے والے ہوں۔ اس صدی کے مسیح سے مراد ہے مسیح کی سچائی۔ اُس کے اُصول اور اُس کا معاملہ اور وہ مرد و عورت جن میں یہ باتیں مجسم ہو رہی ہیں۔ ہم یا تو ان تحریکوں کی جن پر مسیح کا دل لگا ہوا تھا۔ مدد کر رہے ہیں۔ یا انہیں روک رہے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اس امر کو جاننے کے بغیر ایک ایک جانب اپنے لئے چن لیتے ہیں۔ اور وہ برابر تجاویز کو عمل میں لاتے یا گفتگو کرتے یا اُن پر عمل کرتے ہیں جو یا تو مسیح کی طرفداری میں ہوتی ہیں۔ یا اُس کی مخالفت میں۔ یہی ہمارے زمانہ میں مسیح کا دُکھ اُٹھانا ہے۔ اور یہی ہمارے شہر کا گلگتا ہے۔

مگر وہ اس سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ زندہ مسیح بذات خاص اس وقت بھی اس دُنیا میں ہے۔ وہ ہر ایک دروازہ پر آتا ہے۔ اُس کی رُوح ہر ایک آدمی کی رُوح کے ساتھ کشمکش کرتی ہے۔ اور اب بھی اُس کے ساتھ انہیں تین اقسام کا سلوک ہوتا ہے۔ یعنی نادردی۔ بے دردی یا ہمدردی کا۔ جیسے کہ مقناطیس۔ جب ایک ڈھیر پر سے گذرتا ہے۔ تو اُن اشیاء کو جو اُس کی کشش کو قبول کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ نجات بخش محبت جو مسیح میں ظاہر ہوئی ہے۔ ہر صدی میں بنی آدم کی سطح پر سے گذرتی رہتی ہے۔ اور انسانی دلوں کو اُن کی تہوں تک حرکت دینے اور اُن کی اندر خُدا کی حمد اور نیکی کی خواہش پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اور وہ خود بخود اُس کی طرف کھنچے جا کر اُس سے پیوستہ (جُڑنا) ہو جاتے ہیں۔ اس کھنچے جانے کا نام ایمان یا محبت یا روحانیت یا جو چاہو رکھ لو۔ لیکن یہی ابدیت کا مقیاس (پیمانہ) اور کسوٹی (ناپنے کا آلہ) ہے کیونکہ یہی مرد و عورت کو دوسروں میں سے چُن لیتا۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے خُدا کی حیات اور محبت کے ساتھ متحد (اکٹھا) کرتا جاتا ہے۔

چودھواں باب

مسیح کا پہلا کلمہ صلیب پر سے[1]

گذشتہ باب میں ہم اس امر پر غور کر چکے ہیں کہ مختلف جماعتوں پر جو صلیب کے پاس کھڑی تھیں۔ مسیح کے مصلوب ہونے سے کیا اثر پیدا ہوا۔ اُن سپاہیوں پر جنہوں نے اُسے صلیب پر کھنچا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اُس نظارہ کی عظمت اور شان کی طرف سے جس میں وہ خود حصّہ لے رہے تھے۔ بالکل اندھے تھے۔ صدر مجلس کے شرکا اور اُن کے دیگر رفیقوں پر ایک عجیب وغریب قسم کا اُلٹا اثر ہوا۔ نیکی اور روحانی حسن وخوب صورتی کے کامل مکاشفہ نے اُلٹا ان کے دل میں غضب وغصہ اور مخالفت کی تحریک پیدا کی۔ بلکہ یسوع کے دوستوں کی جماعت نے بھی جو فاصلہ پر کھڑی تھی۔ اُس نظارہ کی حقیقت کو جو اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بہت ہی تھوڑا سمجھا۔ اُن کے آقا کا گناہ اور موت اور دُنیا پر اس طور پر فتح حاصل کرنا اُن کی نظر میں ایک افسوس ناک شکست سے بڑھ کر نہ تھا۔ اس لئے جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ یہ بالکل سچ ہے۔ کہ جب کوئی عظیم الشان واقع ظہور میں آرہا ہو۔ تو اُس کے لئے دیکھنے والی آنکھ کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ آئینے میں جو عکس پڑتا ہے۔ اُس کی عمدگی کے لئے نہ صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔ جس کا عکس پڑے۔ بلکہ ساتھ ہی آئینہ کی جِلا (چمک) اور صفائی کا ہونا بھی ایک لازمی امر ہے۔

مگر ہم چاہتے ہیں۔ کہ اُس نظارہ کو جو کلوری پر واقع ہوا۔ اُس اصلی صورت میں ملاحظ کریں۔ مگر یہ کہاں دکھائی دے گی؟ وہاں ایک دل تھا۔ جس میں اُس کا عکس نہایت صفائی سے پڑ رہا تھا۔ اگر ہم صلیب کے عکس کو خود یسوع مسیح کے دل میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ تو اُس کے حقیقی معنی سمجھنے ممکن ہیں۔

لیکن ہم اس امر کو کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ جب وہ صلیب پر لٹک رہا تھا۔ تو یہ نظارہ اُسے کس طرح دکھائی دیتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اُن الفاظ وفقرات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو اُس نے لٹکتے ہوئے اپنے مرنے سے پہلے فرمائے۔ یہ بطور کھڑکیوں کے ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم دیکھ

[1] ۔اے باپ انہیں معاف کردے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں۔

سکتے ہیں۔ کہ اُس کے خانہ دل میں اُس وقت کیا گذر رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ یہ محض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ مگر وہ نہایت گہرے معانی سے معمور ہیں۔ الفاظ ہمیشہ عکسی تصویروں کا کام دیتے ہیں۔ جو کم و بیش صفائی کے ساتھ اُس شخص کے دل کی حالت کو جس سے وہ نکلتے ہیں۔ ظاہر کرتے ہیں۔ اُس کے الفاظ نہایت سچے اور راست تھے۔ اور اُن پر ان کے بولنے والے کی تصویر ثبت تھی۔

یہ کلمات سات ہیں۔ اور اس لئے اگر ہم اُن پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کریں تو ہمارے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ بستر مرگ پر جو الفاظ کہے جاتے ہیں۔ وہ سننے والوں کے لئے ہمیشہ قیمتی اور پُر تاثیر ہوتے ہیں۔ ہمارے والد یا کسی خاص رفیق نے بسترِ مرگ پر جو الفاظ ہم سے کہے ہوں۔ ہم انہیں کبھی نہیں بھولتے۔ اور مشہور و معروف کے آخری الفاظ بڑی کوشش سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ پاک نوشتوں میں ہم یعقوب۔ یوسف موسیٰ اور دیگر بزرگان کی نسبت پڑھتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے بسترِ مرگ پر اپنی معمولی حالت سے بھی بڑھ کر عالی خیالات ظاہر کئے اور ان کے الفاظ ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ گویا عالم بالا سے آرہے ہیں۔ اور قوموں میں مرتے دم کے الفاظ کو ایک قسم کی نبوت سمجھا جاتا ہے۔ اب جو مسیح کے مرتے دم کے کلمات ہیں۔ اور جیسے کہ اُس کا تمام کلام اوروں کے مقابلہ میں سونا اور چاندی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے ہی یہ کلمات اُس کے دوسرے کلمات کے مقابلے میں لعل و جواہر کا رتبہ رکھتے ہیں۔

پہلے کلمے میں یہ تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل خطاب۔ دُوم درخواست۔ سوئم دلیل۔

ا۔

مصلوب آدمی کے لئے صلیب پر سے گفتگو کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مگر اُن کے الفاظ میں عموماً تو درد و تکلیف کا اظہار ہوتا تھا۔ یا رہائی کے لئے بے فائدہ التجا و درخواست ہوتی تھی۔ یا وہ خُدا پر اور اُن لوگوں پر جنہوں نے اُنہیں اس مصیبت میں ڈالا لعنتیں بھیجتے تھے۔ مگر جو نہی یسوع کو اُس بے ہوش کر دینے والے صدمے سے جو اُس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھوکنے سے اُسے ہوا تھا۔ کچھ افاقہ ہوا اُس کے پہلے الفاظ ایک دُعا کی صورت میں تھے۔ اور پہلا لفظ جو اُس کی زبان سے نکلا۔ یہ تھا "اے باپ"۔

کیا یہی لفظ اُن لوگوں کے ناواجب سلوک پر جنہوں نے اُسے وہاں لٹکایا تھا۔ ایک قسم کا فتویٰ نہیں تھا انہوں نے یہ ساری کارروائی مذہب اور خُدا کے نام سے کی تھی۔۔ مگر اُن میں سے کون ایسا تھا۔ جس پر مذہب نے ایسی گہری تاثیر کی ہو؟ اُن میں سے کون تھا جو دعویٰ کرسکے کہ اُسے خُدا کے ساتھ گہری اور دائمی رفاقت حاصل ہے؟ اس سے ظاہر ہے کہ دُعا مانگنا یسوع کے لئے ایسا طبعی امر ہو گیا تھا۔ کہ عادتاً اُس وقت بھی اُس کی زبان سے وہی الفاظ خود بخود نکل پڑے۔ جب کبھی کسی مقدمہ میں۔ خاص کر مذہبی مقدموں میں۔ اگر سزا یافتہ آدمی اپنے ججوں کی نسبت بہتر قسم کا آدمی ہو تو اُس مقدمہ کی کارروائی میں خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔

لفظ "باپ" سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا۔ کہ اس کے ایمان و اعتقاد میں اُن سب باتوں کے سبب جن میں سے وہ گذر رہا تھا۔ اور اُن تمام تکالیف کے باوجود وہ اس وقت بھگت رہا تھا۔ ہرگز جنبش نہ ہوئی تھی۔ جب راستی و صداقت پاؤں کے نیچے کچلی جاتی ہے۔ اور شرارت و ظلم کی فتح ہوتی ہے۔ تو ایماندار کے دل میں خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سچ مچ کوئی پُر محبت اور دانا خُدا ہے جو اس عالم کے تختِ حکومت پر بیٹھا ہے۔ یا برخلاف اس کے کیا یہ سب عالم محض اتفاق و حوادث (حادثہ کی جمع) کے زیر حکومت ہے؟ جب آسودگی و دفعتاً بدبختی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور زندگی کی تمام اُمیدیں اور تدبیریں چور چور ہو کر زمین پر گر جاتی ہیں۔ تو خُدا کا فرزند بھی خواہ مخواہ الٰہی تقدیر کے خلاف لاتیں مارنا شروع کرتا ہے۔ بڑے بڑے اولیاء اللہ درد اور

مایوسی کی حالت میں خُدا کی صداقت پر ایسے ایسے الفاظ میں گلہ شکوہ کرنے لگے ہیں۔ جن کا دُہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جب یسوع کی حالت نہایت ہی خراب ہورہی تھی۔ جب گرگ نما(بھیڑیا) آدمی اُس کا تعاقب (پیچھا) کررہے تھے۔ جب وہ درد وہلاکت کے اتھاہ سمندر (گہرا سمندر) میں غرق(ڈوبنا) ہورہا تھا۔ تو اُس وقت بھی اُس کی زبان سے یہی نکلا کہ "اے باپ"۔

یہ ایمان کا گویا اعلیٰ عروج(بلندی) تھا۔ اور ہمیشہ کے لئے ایک مثال ونمونہ ٹھہرے گا۔ کیونکہ اس وقت ایمان کا بڑی عظمت کے ساتھ بول بالا ہوا اگر کبھی ظاہراً ایسا معلوم ہوا کہ گویا خالق نے کشتی عالم کے پتوار پر سے اپنا ہاتھ اُٹھالیا ہے۔ اور انسانی کاروبار گھبراہٹ وپریشانی کی طرف بسرعت (تیزی سے) جارہے ہیں۔ تو ایسا خیال کرنا اس وقت برمحل(مناسب) تھا۔ جب کہ وہ شخص جو اخلاقی حُسن وخوبی کا مجسم نمونہ تھا۔ ایک چور اور بدکردار کی شرمناک موت رہا تھا۔ کیا نیکی ظلم وشرارت کے ایسے گہرے گڑھے سے کبھی نکل سکتی ہے؟ مگر ساری دُنیا کی نجات اس میں سے نکلی وہاں صفحۂ تاریخ پر جو بات سب سے زیادہ شریف ونجیب (بزرگ) سمجھی جاتی ہے۔ وہ اسی گڑھے میں سے برآمد ہوئی۔ خدا کے فرزندوں کے لئے ایک نہایت عمدہ سبق ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو۔ انہیں ہرگز مایوس نہیں چاہیے۔ ہر طرف تاریکی کیوں نہ چھاجائے۔ سب معاملہ تباہ برباد ہوتا ہوا کیوں نہ نظر آئے۔ خُدا کے تخت پر بدی کا تسلط(قبضہ) کیوں نہ معلوم ہو۔ تو بھی یقین جانو کہ خُدا موجود ہے۔ وہ زمانہ حال کے فساد وغوغا سے بلند وبالا تخت نشین ہے۔ اور تاریکی کے پیٹ میں سے جانفزا(تازگی دینے والی) صبح صادق کو ضرور طلوع کرے گا۔

۲۔

دُعا جو اس خطاب کے بعد نکلی وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ اس دُعا میں وہ اپنے دشمنوں کے لئے معافی کا خواستگار ہوا۔

گذشتہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ وہ اپنی گرفتاری کے وقت سے لے کر اُن کے ہاتھوں کس کس ایذا وبدسلوکی کا موردبنارہا۔ کس طرح شاگرد پیشہ لوگوں نے اُسے مارا اور اُس کی بے عزتی کی۔ کس طرح سردار کاہنوں نے اُس کے پھنسانے کے لئے قانون کو توڑا مروڑا۔ کس طرح ہیرودیس نے اُس کی بے حرمتی کی۔ کس طرح پیلاطس اُس کے معاملہ میں پس وپیش کرتا رہا۔ کس طرح عوام الناس اُس پر آوازے کستے رہے۔ جب یکے بعد دیگرے ہم ایک کمینگی وبداطواری کے نیچے دُوسری ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمارے دل غصّہ سے بھر جاتے ہیں۔ اور ہم بڑی مشکل سے اُن س اُن کے حق میں سخت زبانی استعمال کرنے سے اپنی طبیعت کو روکتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں پر یسوع کے منہ سے جو کلمہ نکلا وہ یہی تھا کہ "اے باپ انہیں معاف کر "۔

البتہ وہ اس سے بہت عرصہ پہلے لوگوں کو یہ تعلیم دے چکا تھا کہ "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں اُن کا بھلا کرو جو تم پر لعنت کریں اُن کے لئے برکت چاہو۔ جو تمہاری بے عزتی کریں۔ اور تمہیں ستائیں اُن کے لئے دُعا مانگو۔ مگر یہ اخلاقی تعلیم جو اُس نے اپنے پہاڑی وعظ میں دی۔ اُس وقت اہلِ دُنیا کے نزدیک ایک دل پسند خواب وخیال سے بڑھ کر رتبہ نہیں رکھتی تھی۔ اور اب بھی لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے معلم گذرے ہیں۔ جو اسی قسم کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ مگر تعلیم دینے اور اُس پر عمل کرنے میں کس قدر بڑا فرق ہے! جب تمہیں کسی مصنف کے خیالات بہت ہی عمدہ اور شیریں معلوم ہوں۔ تو اکثر صورتوں میں بہتر ہوگا۔ کہ تم کو اُس شخص کی نسبت اور زیادہ حالات معلوم نہ ہوں۔ کیونکہ اگر تم اُس کی زندگی کے حالات سے واقف ہوگے۔ تو تمہیں نہایت افسوس ہوگا۔ کیا خود ہمارے زمانہ حال کے علم وادب کے مطالعہ کرنے والے ہمارے انشا پردازوں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے خائف(پریشان) نہیں ہیں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو خوب صورت اور دلفریب خیالات کے سلسلے اُن کی

تحریروں میں سے چُن چُن کر جمع کئے گئے ہیں۔ خود اُن کی زندگی کی خرابیوں کے مطالعہ سے بے مزہ نہ معلوم ہونے لگیں؟ مگر یسوع جو تعلیم دیتا تھا۔ اُس کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ سارے بنی آدمی میں وہی ایک ایسا معلم ہے۔ جس کے خیال اور فعل میں کامل اتفاق ہے۔ اُس کی تعلیم نہایت ہی عالی اور بلند پایہ ہے۔ ایسی کہ بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ اس دُنیا کے لوگوں کے لئے حد سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن جب ہم اُس کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ تو وہ تعلیم کیسی عملی معلوم ہوتی ہے۔ جب اُس نے صلیب پر سے یہ دُعا مانگی کہ ''اے باپ۔ انہیں معاف کردے''۔ تو اُس نے ثابت کر دیا کہ اُس کا عمل درآمد اس زمین پر بالکل احاطہ امکان (جس پر عمل کرنا ممکن ہو) میں ہے۔

شاید ہم میں سے چند ہی لوگ اس امر سے واقف ہوں گے۔ کہ معاف کرنا کیا ہے۔ ہمارے ساتھ بہت کم کوئی شخص ایسی سخت بدسلوکی کرتا ہے۔ غالباً ہم میں سے کئی ایسے ہوں گے۔ جن کا دنیا بھر میں ایک بھی دشمن نہ ہو۔ مگر جن کے دشمن ہیں۔ وہی خوب جانتے ہیں۔ کہ اُن کو معاف کرنا کیسا سخت مشکل ہے۔ شاید اُن کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی چیز مشکل نہ ہوگی۔ طبعی طور پر دلِ انسان کو انتقام لینا نہایت میٹھا معلوم ہوتا ہے۔ قدیم دُنیا کا کم سے کم عمل کے لحاظ سے یہ قانون تھا کہ ''اپنے ہمسائے سے محبت رکھو۔ اور اپنے دشمن سے عداوت''۔ عہدِ عتیق کے مقدس لوگوں کی بابت ہم یہی پڑھتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں پر جنہوں نے انہیں ایذا (تکلیف) پہنچائی۔ نہایت سخت الفاظ میں لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر یسوع بھی انہیں لوگوں کے نمونہ پر چلتا۔ اور صلیب پر جب اُس کی زبان میں گویائی کی طاقت آئی۔ تو اپنے آسمانی باپ سے ایسے طور پر گلہ کرتا۔ جس میں اپنے دشمنوں کا ایسے الفاظ میں جن کے وہ مستحق تھے ذکر کرتا۔ تو کون اُس کی اس بات میں نقص نکالنے کا حوصلہ کرتا؟ یہ بھی خُدا کے مکاشفہ کے مطابق ٹھہرتا۔ کیونکہ الہٰی ذات میں گناہ کے خلاف غضب کی آگ برابر بھڑک رہی ہے۔ مگر یہ مکاشفہ اُس مکاشفہ کے مقابلہ میں جو اُس نے اب ہمیں دیا ہے۔ کیسا ادنیٰ اور ناچیز ہوتا۔ وہ اپنی زندگی بھر خُدا کا مکاشفہ ہمیں دیتا رہا۔ لیکن اب اس کا وقت تنگ تھا۔ اور اب وہ اُسے جو خُدا کا اعلیٰ سے اعلیٰ مکاشفہ تھا۔ ہم پر ظاہر کرنے کو تھا۔

اس کلمہ میں مسیح نے اپنے آپ کو بھی ظاہر کر دیا۔ مگر ساتھ ہی اُس نے اپنے باپ کو بھی ظاہر کیا۔ اُس کی ساری زندگی بھر باپ اُس میں تھا۔ مگر صلیب پر الہٰی زندگی اور خصلت (فطرت۔ عادت) اُس کی انسانی فطرت میں سے ایسی درخشاں (روشن) ہوئی جیسے آگ جلتی ہوئی جھاڑی میں نمایاں ہوئی تھی۔ اُس نے ان الفاظ میں کہ ''اے باپ انہیں معاف کر''۔ اپنے کو ظاہر کر دیا۔ مگر اس قول کے کیا معنی تھے؟ یہی کہ خُدا محبت ہے۔

۳۔

مرتے ہوئے منجی نے اپنی دُعا و مناجات کے ساتھ اپنے دشمنوں کی معافی کے لئے ایک سبب یا وجہ بھی بیان کی۔ ''کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں''۔

اس فقرہ سے ہم کو الہٰی محبت کی گہرائیاں اور بھی زیادہ صفائی سے نظر آتی ہیں۔ مظلوم و ایذا رسیدہ لوگ مقدمہ کے ایک ہی پہلو کو دیکھا کرتے ہیں۔ جو اُن کے حسبِ مطلب ہوتا ہے۔ اور وہ فقط انہیں واقعات پر نظر کرتے ہیں۔ جن سے اُن کے ایذا دینے والوں کا چال چلن نہایت قابل نفرین (لعنت) معلوم ہو۔ مگر برخلاف اُن کے یسوع ٹھیک اُس وقت جب کہ اُس کا دُکھ درد نہایت زوروں پر تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کی بداطواری کے لئے معذرت کر رہا تھا۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس حد تک یہ معذرت اُن لوگوں کے حق میں صادق آتی تھی۔ کیا اُن سب کے حق میں یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ کیا یہوداہ نہیں جانتا تھا؟ کیا سردار کاہن نہیں جانتے تھے؟ کیا ہیرودیس نہیں جانتا تھا؟ ظاہراً ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ اُن سپاہیوں کے حق میں جنہوں نے اُسے صلیب پر کھنیچا۔ یسوع کے یہ الفاظ کہے گئے تھے۔ کیونکہ یہ اُن کے اس کام کے سرانجام کرنے کے موقعہ پر جیسا کہ مقدس لُوقا کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہے گئے تھے۔ وہ جاہل اور نیم وحشی سپاہی جو محض سرکاری حکم کی تعمیل کررہے تھے۔ یسوع کے سارے حملہ آوروں میں سے کم گنہگار تھے۔ شاید ان سے دوسرے درجہ پر پیلاطس تھا۔ اور اس کے بعد ہیرودیس اور صدر مجلس سے لے کر یہوداہ کی کمینہ کارروائی تک گناہ کے مختلف مدارج تھے۔ مگر مقدس پطرس نے اپنی تقریر میں جو اعمال کی کتاب کے شروع میں درج ہے۔ اس جہالت وناواقفی کے عذر میں صدر مجلس والوں تک کو شامل کرلیا۔ اور اے بھائیو! میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ کام نادانی سے کیا۔ اور ایسا ہی تمہارے سرداروں نے بھی۔ اور کون اس بات کو مانے گا۔ کہ نجات دہندہ کا دل اپنے شاگرد کی نسبت کم وسعت (گہرائی) رکھتا تھا؟

ہمیں نہیں چاہیے کہ الٰہی رحمت کے لئے حدیں مقرر کردیں۔ ہر ایک گنہگار کے حق میں کسی حد تک یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ کیا کرتا ہے۔ اور سچے تائب کے لئے جب وہ تختِ رحمت کے قریب آتا ہے۔ اس امر کا یقین بڑی تسلی کا باعث ہوتا ہے۔ کہ اُس کا یہ عذر قبول کیا جائے گا۔ تائب پولوس کو اس سے بڑی تسلی حاصل ہوئی۔ کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ "مجھ پر رحم ہوا۔ اس لئے کہ میں نے بے ایمانی کی حالت میں نادانی سے یہ کام کئے تھے"۔ خُدا ہماری ساری کمزوریوں اور اندھے پن سے واقف ہے۔ آدمی تو ان باتوں سے قطع نظر نہیں کریں گے اور نہ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ مگر وہ ان سب باتوں کو سمجھ لے گا۔ اگر ہم گناہ کے بعد اپنا سر اُس کی گود میں جا چھپائیں گے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ اس مبارک سچائی کو ایک ناتائب (توبہ نہ کرنے والا) شخص اس قدر اُلٹا دے کہ اُسے اپنے لئے نقصان کا باعث ٹھہرائے۔ یہ فرانسیسی کہاوت بالکل غلطی پر مبنی ہے۔ جو کہتی ہے کہ "سب باتوں کو سمجھ لینا سب باتوں کو معاف کردینا ہے"۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بیرونی حالات کے پنجہ میں گرفتار ہے اور وہ اپنے افعال کے لئے ذمہ دار نہیں۔ مگر ہمارے خُداوند کے ذہن سے اس قسم کے خیالات کوسوں دُور تھے۔ جیسا کہ اُس کے اس قول سے ظاہر ہے کہ "انہیں معاف کردے"۔ وہ جانتا تھا کہ وہ عفو (معافی) کے حاجت مند ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے مجرم تھے۔ فی الحقیقت یہ اُن کی خطرناک حالت کا علم تھا۔ جس میں وہ بہ سبب اپنے جرم کے گرفتار تھے۔ جس کے سبب وہ اُس وقت اپنے تمام درد و تکلیف کو بھول گیا۔ اور اپنے کو اُن کے اور اُن کی سزا کے درمیان ڈال دیا۔

یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "کیا یہ دُعا قبول ہوئی"۔ کیا اُس کے صلیب دینے والے معاف کئے گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت (معافی) کی دُعا کی قبولیت کے لئے اُن لوگوں کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ جن کے حق میں وہ دُعا کی جائے اگر وہ سچی توجہ کرکے اپنے گناہوں کے لئے خود معافی کے خواستگار نہ ہوں۔ تو خُدا کس طرح انہیں عفو (معاف) کرسکتا ہے؟ اس لئے یسوع کی دُعا کا یہ مطلب تھا۔ کہ انہیں توبہ کی مہلت دی جائے۔ اور تقدیر الٰہی اور وعظ و نصیحت اُن پر اپنا کام کرکے اُن کی ضمیروں کو جگا دے۔ ایسے بڑے خوف ناک جرم کی سزا دینے کے لئے جیسا کہ ابن اللہ کو مصلوب کرنا ہے۔ خُدا اگر چاہتا تو اُسی وقت زمین کو حکم دیتا کہ اپنا منہ کھول کر اُنہیں نگل لے۔ مگر اس قسم کی کوئی بات واقع نہ ہوئی۔ جیسا کہ یسوع نے پیشن گوئی کی تھی۔ یروشلیم باحال خستہ و خراب برباد ہوگئی۔ مگر یہ بات بھی اُس کی وفات کے چالیس سال پیچھے واقع ہوئی۔ اور اس اثناء میں پنتیکوست کے موقع پر روح القدس کا نزول ہوا۔ رسولوں نے آسمانی بادشاہت کے قائم ہونے کی منادی یروشلیم میں کرکے بڑے اصرار سے قوم کو توبہ کی ترغیب و تحریص دی۔ اور اُن کی محنت بھی بے فائدہ نہ گئی۔۔ کیونکہ ہزاروں لوگ ایمان لائے۔ بلکہ پیشتر اس کے کہ صلیب کا واقع ختم ہوا۔ دونوں چوروں میں سے جو مسیح کے ساتھ مصلب ہوئے تھے۔ ایک چور جو پہلے مسیح کو گولیاں دینے میں شریک تھا ایمان لے آیا۔ اور صوبہ دار نے جو صلیب دینے پر متعین (مقرر) تھا۔ اس

امر کا اقرار کیا کہ وہ در حقیقت ابنِ اللہ ہے۔ جب سب کچھ ختم ہو چکا۔ تو لوگ جو تماشہ دیکھنے کو آئے تھے۔ چھاتی پیٹتے ہوئے اپنے گھر کو واپس گئے۔ اس لئے ہمارے پاس اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان معنوں میں بھی اس کی دُعا در حقیقت پایۂ قبول کو پہنچی۔

مگر یہ اس قسم کی دُعا تھی جس کی قبولیت دوسرے طور پر ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس امر کے کہ دُعا کے ذریعہ خاص خاص حاجتیں جن کے لئے دُعا کی جاتی ہے۔ پوری ہوں۔ وہ دُعا کرنے والے کی اپنی روح پر بھی ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ یعنی اُسے تسلی و تسکین بخشتی اور روحانی قوت عطا کرتی ہے۔ اگرچہ بعض غلطی سے یہ خیال کر بیٹھتے ہیں کہ دُعا سے فقط اسی قدر نفع حاصل ہوتا ہے۔ اور اس طور سے اس امر کے منکر (انکار کرنے والے) ہیں کہ خُدا ہماری درخواستوں پر بھی لحاظ کرتا ہے۔ تاہم ہمیں جو یہ یقین کرتے ہیں کہ دُعا سے بہت کچھ کام نکلتا ہے۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دُعا مانگنے سے کہ اس کے دشمن معاف کئے جائیں۔ یسوع نے غصہ ؔاور انتقام کی روح کو اپنے سے دُور ہٹا دیا۔ جو اُس وقت اس کے دل میں گھسی چلی آتی ہو گی۔ اور اپنے روح کے اطمینان وچین کو برقرار رکھا۔ خُدا سے اُن کی معافی کے لئے دُعا کرنا گویا اپنے دل سے انہیں معاف کر دینے کی کوششوں کی تکمیل تھی۔ جو شخص دوسروں کو معاف کرتا ہے اپنے دل میں ایک قسم کی رہائی اور اطمینان کو محسوس کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس دُعا کی مقبولیت کسی قدر اس امر سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ کہ زمانا بعد زمانا مظلوم اور ستم رسیدہ آدمی اسی دُعا کو دُہراتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے مقدس ستفنس نے جب وہ مرنے کے قریب تھا۔ تو اپنے اُستاد کی مانند یہ الفاظ کہے کہ "خُداوند! یہ گناہ اُن کے حساب میں نہ لکھنا" اور اُس کے بعد اور سینکڑوں آدمیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اور دن بدن یہی دُعا اس دُنیا میں اُس تلخی کی مقدار کو گھٹاتی جاتی ہے۔ اور اُس کی جگہ محبت کی مقدار کو ترقی دیتی جاتی ہے۔

پندرھواں باب

دُوسرا کلمہ صلیب پر سے[1]

یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کس کا انتظام تھا کہ یسوع کو دو چوروں کے درمیان صلیب پر لٹکایا گیا۔ ممکن ہے کہ یہ پیلاطس کا حکم تھا۔ جو اس طور سے اُس تضحیک و تحقیر کو بڑھانا چاہتا تھا۔ جو کتبہ کی طرزِ تحریر سے جو صلیب پر لکھا گیا تھا۔ اُس کا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید اس امر کے ذمہ دار یہودی حُکام تھے۔ جو گلگتا تک برابر ہمراہ چلے آئے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کو کہہ کہا کر اُسے زیادہ ذلیل کرنے کی غرض سے اس طور پر صلیب دینے کی ترغیب دی ہو گی۔ یا سپاہیوں نے خود بخود ایسا کر دیا ہو۔ صرف اس خیال سے کہ وہ تینوں قیدیوں میں سے زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوتا تھا۔ اغلب (یقینی) یہ ہے کہ اس میں کسی نہ کسی کی شرارت ضرور تھی۔ مگر انسان کے غضب کے عقب (پیچھے) میں ایک الٰہی مقصد تھا۔ خُداوند کی زمینی زندگی کی ان آخری گھڑیوں میں بار بار یہ امر سامنے آتا ہے کہ کس طرح ہر ایک لفظ یا کام جو یسوع کو ایذا دینے یا بے عزت کرنے کے لئے کہا یا کیا گیا۔ بجائے اس کے ہماری نظروں میں جب ہم پیچھے لوٹ کر دیکھتے ہیں۔ بالکل عزت و خوبی میں بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس پر ایک ستارے کی مانند چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جیسے کہ آگ کوئلے کے ایک بد نما ڈھیلے کو یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو جو اس میں پھینکا جاتا ہے لے کر ایک بقعہ نور (وہ مکان جس میں بہت زیادہ روشنی ہو) میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسی طرح اس وقت مسیح کے اندر کوئی ایسی بات تھی۔ جس سے ہر ایک گالی یا طعنہ جو اُس کی بے عزتی کے لئے دیا جاتا تھا۔ اُس کے لئے عزت کا باعث

---

[1] ۔ تو آج میرے ساتھ فردوس میں ہو گا۔

بن جاتا تھا۔ بلکہ اس بات نے اُس کے صلیب دیئے جانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی گہرے معنوں سے بھر دیا۔ کانٹوں کا تاج۔ ارغوانی لباس۔ پیلاطس کا یہ کہنا کہ "دیکھو اس آدمی کو"۔ کتبہ کا مضمون جو صلیب پر لگا یا گیا۔ تماشائیوں کے آوازے۔ اور دوسرے اسی قسم کے واقعات جو اُس وقت شرارت وبدی سے پُر نظر آتے تھے۔ اب یہ سب اُس کے عاشقوں کے حافظہ میں قیمتی جواہرات کی طرح محفوظ ہیں۔

پس اُس کا چوروں کے درمیان لٹکا یا جانا۔ آدمی اور خُدا دونوں کی طرف سے ٹھہرایا ہوا تھا۔ اور یہی اُس کا صحیح مقام تھا۔ لوگ اس سے بہت عرصہ پہلے اُسے "محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا دوست" پکارا کرتے تھے۔ اور اب اُسے دو چوروں کے درمیان صلیب دے کر انہوں نے اسی خیال کو عملی صورت میں دکھا دیا۔ لیکن جیسے کہ یہ نام جو تمسخر کے طور پر اُس کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ اُس کے لئے ابدی عزت کا باعث ٹھہرا ہے۔ اسی طرح یہ کام بھی۔ یسوع اس دُنیا میں آیا تاکہ اپنے کو گنہگاروں کے ساتھ ایک کردے۔ اُن کا مقدمہ اُس کا مقدمہ تھا۔ اور اُس نے اُن کی قسمت کو اپنا بنالیا۔ اُس نے اُن کے درمیان زندگی بسر کی۔ اور اب یہ مناسب تھا کہ وہ انہیں کے درمیان جان بھی دے۔ آج کے دن تک وہ انہیں کے درمیان ہے۔ اور اُن دونوں چوروں کا جن کے درمیان وہ لٹکا ہوا تھا۔ عجیب سلوک اس امر کا نشان دیتا ہے۔ کہ اُس سے لے کر آج تک ہر روز کیا ہوتا ہے۔ بعض گنہگار اُس پر ایمان لاکر نجات پا گئے۔ مگر اور ہیں جو اُس پر ایمان نہیں لاتے۔ ایک کے لئے اُس کی انجیل جینے کے لئے زندگی کی بو ہے۔ دوسرے کے واسطے مرنے کے لئے موت کی بو ہے۔ اور آخر تک یہی حال رہے گا۔ اور اُس عظیم الشان روز کو جب کہ اس دُنیا کی ساری تاریخ کا آخری ورق اُلٹا جائے گا۔ وہ اُس وقت بھی ہمارے درمیان میں ہوگا۔ اور توبہ کرنے والا اُس کی ایک جانب ہوگا۔ اور نہ توبہ کرنے والا اُس کی دوسری جانب۔

لیکن یہ صرف اسی طور پر نہیں تھا۔ کہ الٰہی حکمت نے ان پُر از توہین واقعات کو کہ یسوع خطاکاروں میں شمار کیا گیا۔ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اس سے اُسے یہ موقع ملا کہ اس آخری وقت میں بھی وہ اپنے دل کی فیاض حوصلگی اور اپنی رسالت کے اصلی مُدعا (مقصد) کو ظاہر کرسکے۔ اور ایک ایسے وقت میں جب کہ وہ اس کا بہت ہی حاجت مند (ضرورت مند) تھا۔ اُس کے لئے ایک ایسا پیالہ مہیا کردیا۔ جو زندگی بھر اُس کے لئے نہایت ہی فرحت بخش تھا۔ اور یہ پیالہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کی خوشی کا پیالہ تھا۔ جیسے کہ مسرف بیٹے کی تمثیل مسیح کے سارے وعظ و تعلیم کا لب لباب ہے۔ اسی طرح صلیب پر ایک چور کو نجات بخشنا مسیح کی ساری زندگی کا خلاصہ ہے۔

۲۔

معلوم ہوتا ہے کہ صدر مجلس والوں کے نمونہ کی پیروی کر کے دونوں چوروں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تھا۔ مگر اس امر میں کئی اشخاص کو شبہ واقع ہوا ہے۔ بلکہ بہتوں نے تو اس مشکل کی بنا پر اس امر سے انکار کردیا ہے۔ کہ کس طرح ممکن ہے کہ دفعتاً (اچانک) اس قدر انقلاب واقع ہو۔ اور ایسے چور کا دل ایسے تھوڑے سے وقت میں تبدیل ہوجائے۔ دو انجیل نویسوں نے لکھا ہے۔ کہ وہ جو اُس کے ساتھ صلیب پر کھینچے گئے تھے۔ اُسے بُرا بھلا کہتے تھے۔ لیکن صرف نحو (گرامر) کے قاعدہ (اُصول) کے موافق اس کی اس طور پر تشریح کرنا بھی جائزہ ہے۔ کہ اس سے صرف ایک ہی شخص مراد ہو۔ کیونکہ بعض اوقات ایک کام ساری جماعت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُس سے مراد اُس جماعت کا صرف ایک شخص ہوتا ہے۔ تاہم ظاہری الفاظ سے صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ دونوں نے ایسا کیا۔ اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے جو تائب نہ ہوا۔ اس بات کو چھیڑا ہوگا۔ اور دُوسرا بھی اس میں اُس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ محض اپنی خواہش سے نہیں۔ بلکہ فقط اپنے بدطینت رفیق (بُری فطرت والا ساتھی) کے بُرے نمونہ کے سبب۔ غالباً یہ

پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ اس طور سے گناہ کرنے پر راغب ہوا۔ شاید اُس کا رفیق ہی اُس کا بگاڑنے والا تھا۔ جس نے اُسے تباہ برباد کر کے اس نوبت کو پہنچایا تھا۔

مگر اس سے بڑھ کر شرارت اور بدمعاشی کی حد کیا ہو گی کہ ایک آدمی مرتے وقت بھی اپنی آخری گھڑیوں کو اپنے ہمراہی مرنے والے کے حق میں بُری بھلی باتیں کہنے میں صرف کرے۔ البتہ یہ تو ظاہر ہے کہ درد کی سختی نے ان مصلوبوں کو اس امر سے بالکل بے پروا بنا دیا۔ کہ وہ منہ سے کیا بکتے ہیں۔ اور اس طور سے کسی کام میں۔ خاص کر جب وہ اس قسم کا درشتی آمیز (بے رحمی) کام ہو۔ اپنے کو مشغول کرنا گویا کسی حد تک اُس جان کنی کے عذاب سے خلاصی پانا تھا۔ کچھ پروا نہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جس پر حملہ کیا جائے۔ کیونکہ اُن کی حالت حیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ جو سخت درد کی حالت میں جو کچھ سامنے آئے۔ اُسے کاٹ بیٹھتے ہیں۔ اس غیر تائب چور کی یہی حالت تھی۔ مگر دوسرا چور خوف زدہ ہو کر اپنے ہمراہی کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اُس کے گناہ کے حد سے بڑھ جانے نے اُسے اُس کی طرف سے متنفر (بدظن) کر دیا۔ اور شاید اپنی ساری عمر میں پہلی دفعہ اُس نے دیکھ لیا کہ وہ کیسا کمینہ اور کمبخت ہے۔ اور یہ بات یسوع کے تحمل اور اطمینان طبع (فطرت) کو دیکھ کر اور بھی زیادہ اُس پر نمایاں ہو گئی۔ اب تک تو وہ اپنے وحشی دوست کو اپنا نمونہ ٹھہرا تا رہا تھا۔ لیکن اب اُس نے دیکھ لیا کہ اُس کی وحشیانہ دلیری مسیح کے پُر اطمینان تحمل و بُردباری کے مقابلہ میں کیسی ہیچ (کمتر) ہے۔

اس فوری انقلاب و تبدیلی کی معقول وجہ ڈھونڈنے میں لوگوں نے اس امر کے امکان کو فرض کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سے پہلے بھی مسیح اور چور میں کئی ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ مگر یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ کہ ہم اُس چال چلن کا مفصل طور سے ذکر کریں۔ جو صلیب دیئے جانے کے وقت سے جب کہ وہ ایک دوسرے سے ملاقی (ملاقات ہونا) ہوئے۔ اُس چور نے مسیح کے رویّہ میں کیا ملاحظہ کیا ہو گا۔ اُس نے اُسے اپنے دشمنوں کے حق میں دُعا کرتے سنا تھا۔ جب وہ کلوری کی طرف جا رہے تھے۔ تو اُس نے اُن الفاظ کو جو اُس نے یروشلیم کی بیٹیوں سے مخاطب ہو کر فرمائے تھے۔ سنا تھا۔ اُس کے دشمنوں نے صلیب کے پاس کھڑے ہو کر جو باتیں کہیں۔ جب اُن ناموں کو یاد دلا کر جن کا وہ دعویدار تھا۔ یا لوگوں نے اُس کی طرف منسوب کئے تھے۔ وہ اُسے لعنت ملامت کر رہے تھے۔ انہیں باتوں سے اُسے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ یسوع کے دعاوی (دعویٰ کی جمع) کیا تھے۔ شاید پیلاطس کے رُوبرو جو ماجرا گذرا۔ اُس نے وہ سب بھی دیکھا ہو گا۔ مگر جب ان معاملات سے بھی پرے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس امر کے متعلق کوئی معتبر شہادت نہیں ملتی۔ کیا اُس نے کبھی یسوع کی وعظ و نصیحت سنی تھی؟ کیا اُس نے کبھی اُس کے معجزے دیکھے تھے؟ بھلا وہ اُس بادشاہیت کی ماہیت سے جس کا وہ ذکر کیا کرتا تھا۔ کہاں تک واقف تھا؟ ان سوالوں کے جواب میں لوگوں نے بہتیرے خیال کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ مگر اُن کا کوئی بھی ثبوت نہیں ہے۔ مگر میں زیادہ وثوق (یقین) کے ساتھ اس سے بھی پرے جانے پر آمادہ (راضی) ہوں۔ ممکن ہے کہ اُس کے والدین دیندار لوگ تھے۔ اور وہ مسرف بیٹے کی طرف بُری صحبت میں پڑ کر آوارہ ہو گیا تھا۔ شاید یہی آدمی جس کے ساتھ وہ صلیب پر کھینچا ہوا تھا۔ اُس کی خرابی کا ذریعہ تھا۔ جیسے کہ یسوع کی صلیب کے نیچے ایک ماں رو رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس کی صلیب کے نیچے بھی ایک ماں کھڑی ہو جس کی دُعائیں ایسے طور پر پایہ قبولیت کو پہنچیں جن کا اُسے شان و گمان بھی نہ تھا۔

فوری انقلاب یا دل کی تبدیلی کے مسئلے پر دونوں جانب سے ایسے جوش و خروش سے بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے کہ لوگ اصل واقعات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک معنی میں تو ہمارے درمیان اس قسم کی بات کا واقع ہونا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص اسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس امر کو محسوس کرے کہ اُس نے ابھی تک سارے دل و جان سے اپنے کو خُدا کے حوالہ نہیں کر دیا اور دوسرا ورق اُلٹنے سے پہلے اپنے کو خُدا کے حوالہ کر دے۔ تو کیا اسے فوری تبدیلی کہنا جائز ہو گا؟ کیونکر نہیں؟ اس لئے کہ اس قسم کی تبدیلی اُس کے دل میں سالہا سال سے جاری رہی ہے۔ وہ

ساری مذہبی تعلیم جو بچپن سے تمہیں ملتی رہی ہے۔ جو دُعائیں تمہارے حق میں مانگی گئی ہیں۔ جو پند و نصیحت (ہدایتیں) تمہیں کی گئی ہیں۔ اور خُدا کی رُوح جو تمہارے باطن میں جدو جہد کرتی رہی ہے۔ یہ سب باتیں اسی غرض کو حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ اگر تمہاری دلی تبدیلی اسی لمحہ میں واقع ہو۔ تو بھی وہ لمحہ اُس لمبے سلسلہ کا جو سالوں سے تمہارے اندر جاری رہا۔ آخری نقط سمجھا جائے گا۔ لیکن ایک دوسرے معنوں میں اُسے فوری یادفعتاً کہہ سکتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ تمہارے پاس کیا معقول وجہ ہے۔ جس کی بنا پر تم اپنا خُدا کی طرف پھر نا ملتوی کر سکتے ہو؟ مذہب میں دو قم کے تجربات ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے امتیاز (فرق) کرنا چاہیے۔ ایک تو دوسروں کے ذریعہ باہر سے ہمارے دل پر مذہبی باتوں کا اثر ہوتا ہے۔ اور یہ اثر تعلیم۔ نمونہ۔ پند و نصیحت۔ اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دوسرے بات خود ہمارے دل میں مذہبی باتوں کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ ہم ان تمام اثرات کی طرف متوجہ ہو کر انہیں اپنا بنا لیتے ہیں۔ اوّل الذکر تجربہ بہت طویل عرصہ لیتا ہے۔ اور بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ موخرالذکر دفعتاً (اچانک) واقع ہونا ممکن ہے۔ اور بعض اوقات ایک نہایت چھوٹی سی بات سے پیدا ہو جاتا ہے۔

اس تبدیلی کی عظمت کو گھٹانے کے لئے ایک دوسرا طریق لوگوں نے یہ اختیار کیا ہے۔ کہ وہ اُس آدمی کے جرم کی بابت سوال کرتے ہیں۔ جب ہم اُسے چور کے نام سے پکارتے ہیں۔ تو اس سے ہمارے ذہن میں ایک ایسے عام شخص کا تصور گذرتا ہے۔ جو ایک بہت ہی بد چلن مجرم ہو۔ لیکن اُن کے نزدیک اس لفظ کا ترجمہ "ڈاکو" کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ غالباً یہ شخص ابتدا میں صرف ایک پولٹیکل آدمی تھا۔ جو انقلابِ سلطنت کی تحریک کرتا تھا۔ لیکن رومی قانون کی مخالفت کے سبب اُسے سوسائٹی کو چھوڑ کر جنگل میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں اپنے گذارے کے لئے اُس نے مجبوراً رہزنی (لوٹ کار) کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن اُس ملک میں جس پر ایک بیرونی حکومت زور و جبر کے ساتھ حکومت کر رہی تھی۔ ایسے لوگ تھے۔ جنہوں نے علم بغاوت (سرکشی) بلند کیا تھا۔ اور اگرچہ وہ شریف مزاج تھے۔ مگر اپنی حالت سے مجبور ہو کر زبردستی اور لوٹ کھسوٹ کر بیٹھتے تھے۔ اس بات میں کسی قدر سچائی ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ تائب چور اور لوگوں سے بڑھ کر شریر و گنہگار نہ ہو۔ مگر اُس کے اپنے الفاظ جو اُس نے اپنے ہمراہی کو کہے کہ "ہم تو اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں"۔ بالکل دوسرے امر کی تصدیق کرتے ہیں۔ اُس کے حافظہ میں ایسے کاموں کی یاد موجود تھی جس کی وجہ سے وہ اس بات کا مقر (اقرار کرنا) تھا کہ موت اُن کی واجبی سزا ہے۔ قصہ مختصر اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ وہ ایک بڑا گنہگار تھا۔ اور اُس کے دل میں دفعتاً ایسی بڑی تبدیلی واقع ہو گئی۔ اور اس لئے اُس کے مثال ہمیشہ بڑے سے بڑے گنہگار کے لئے جب وہ توبہ کرے حوصلہ افزائی اور تسلی کا باعث ہو گی۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ تائب (توبہ کرنے والے) لوگ خدا کے حضور میں آنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے گناہ ایسے بھاری ہیں کہ اُن کی معافی کی اُمید نہیں۔ مگر وہ جو انہیں اس امر کی تحریک کر رہے ہیں۔ اُن کے سامنے ایسے شخصوں کے نام جیسے کہ متّی اور مریم مگدلینی یا جیسے کہ یہ چور ہے۔ پیش کر سکتے ہیں۔ اور یقین دلا سکتے ہیں۔ کہ وہ الٰہی رحمت جس نے ان کو بخش دیا۔ سب کے لئے کافی و وافی ہے۔ "یسوع مسیح۔ خُدا کے بیٹے کا خون سارے گناہ سے پاک کرتا ہے"۔

جو لوگ اس عجیب و غریب تبدیلی کے زور کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے دل میں یہ خوف ہے کہ مبادا اگر اس بات کو مانا جائے کہ بُرے سے بُرے آدمی میں بھی ایک لمحہ بھر میں جب کہ وہ لب گور (قبر کے منہ پر) ہو اس قسم کی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ تو لوگ اس اُمید پر کہ مرتے وقت توبہ کر لیں گے۔ اپنی نجات کی طرف سے بے پرواہ ہو جائیں گے۔ یہ خوف تو بجا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ بعض اوقات خُدا کے فضل کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے۔ مگر یہ ایک دوسری بات ہے۔ جو لوگ اپنے کو اس قسم کے دلائل سے دھوکا دیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جب چاہیں ایمان اور اُمید کو اپنے دل

میں پیدا کر سکتے ہیں۔اور جب کبھی وہ چاہیں گے تمام مذہبی حسات کو اپنے اندر پیدا کر لیں گے۔ لیکن کیا تجربہ اس امر کی تائید کرتا ہے۔ برخلاف اس کے کیااس قسم کے موقع شاذونادر نہیں دیکھے جاتے جب کہ مذہب ایک لامذہب آدمی پر سچ مچ کچھ اثر پیدا کرتا ہے؟

اور یہ بھی ہر حالت میں نہیں دیکھا جاتا کہ موت کی قربت ہر ایک آدمی میں مذہبی باتوں کی نسبت فکر مندی پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرا چور اس بات کا عمدہ نمونہ ہے۔ اگرچہ اُس وقت موت سے دوچار ہورہا تھا۔اور یسوع کے اس قدر قریب تھا۔ تو بھی اُس کا دل اور بھی زیادہ سخت ہو گیا۔اور اُس شخص کا بھی جو جان بوجھ کر رُوح کو بجھا دیتا ہے۔اس اُمید پر کہ وہ بستر مرگ پر توبہ کرلے گا۔اغلب ہے کہ یہی حال ہو گا۔

مگر اس خیال کے ڈر سے کہ اس سچائی کا ناجائز استعمال ممکن ہے۔ ہم خُدا کے فضل کی شہادت کو جو اس واقعہ میں پائی جاتی ہے۔ ہر گز ہاتھ سے نہ دیں گے۔ کہ ''ہمیں نجات دہندہ کی اس دعوت کو کسی طرح سے محدود نہیں کرنا چاہیے کہ ''وہ جو میرے پاس آتا ہے۔ میں اُسے کسی صورت سے نکال نہ دُوں گا'' گنہگار خواہ کیسی ہی دیر سے کیوں نہ آئے۔اور آتے وقت اُس کے پاس خواہ کتنا ہی تھوڑا وقت کیوں نہ ہو۔ اگر وہ فقط آہی جائے۔ تو یقیناً وہ نکال نہیں دیا جائے گا۔کسی سلسلہ علم الٰہی اور اُس کے معلموں کی تعلیم کی سچائی کی اس سے بڑھ کر اور کوئی کسوٹی (پیمانہ) نہیں کہ وہ ایک لبِ مرگ آدمی کے لئے۔ جس کے گناہ معاف نہیں ہوئے۔ کیا پیغامِ تسلی رکھتے ہیں؟ اگر نجات جو ایک واعظ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ محض اخلاقی ترقی کے بتدریج واقع ہونے کی تعلیم کا نام ہے۔ تو وہ ایسے موقع پر کیا کہے گا؟ ہم کو یقین کرنا چاہیے کہ ہماری انجیل (خوشخبری) اُس شخص کی انجیل نہیں ہے۔ جس نے ایک تائب چور کو بھی تسلی دی۔ جب تک کہ ہم لبِ گور (مرنے کے قریب) گنہگار کو بھی ایسی نجات کی خوشخبری نہیں دے سکتی۔ جو فی الفور حاصل ہو جاتی اور کامل خوشی و خرمی عطا کر سکتی ہے۔

یہ بات کہ اس چور میں کس قدر کامل تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ خود اُس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ مقدس پولوس ایک مقام پر مسیحی دین کو دو باتوں میں بیان کر دیتا ہے۔ خُدا کی حضور تائب ہونا۔اور یسوع مسیح پر ایمان لانا۔اور یہ دونوں باتیں ہمیں اس تائب چور کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ اُس کی توبہ اُن الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔ جو اُس نے اپنے ہمراہی چور سے کہی۔ وہ اُسے کہتا ہے ''کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا''۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ خود بھی خُدا کو بھلا بیٹھا تھا۔اور گذشتہ عمر میں اُس کا خیال ہر گز پاس نہیں آنے دیا تھا۔ لیکن اب اُسے خُدا قریب معلوم ہوتا تھا۔اور اُس کے نور میں اُس نے اپنی گنہگاری کو دیکھ لیا۔اور اُس نے اس کا اقرار کیا۔ فقط اپنے دل میں پوشیدہ طور پر نہیں بلکہ علانیہ طور پر۔ اس طور سے اُس نے اپنے کو گناہ سے بلکہ اپنے ساتھی سے بھی جو اُس کی گمراہی کا باعث تھا۔ علیحدہ کر دیا۔ جب کہ اُس نے اُس کی مانند توبہ کرنے سے انکار کیا۔اور ایسی ہی صفائی کے ساتھ اُس کے الفاظ سے اُس کا یسوع مسیح پر ایمان لانا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بالکل سادہ الفاظ ہیں اور اُن سے عجز وانکسار ٹپکتا ہے۔ اُس نے صرف یہ درخواست کی کہ جب مسیح اپنی بادشاہت میں آئے۔ تو اُسے یاد رکھے۔ مگر ان الفاظ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مسیح کے جلال و بزرگی کا قائل ہے۔اور اُس پر کامل اعتماد رکھتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ قوم کے مذہبی پیشوا یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے مسیح کے دعوؤں پر پانی پھیر دیا۔اور جب کہ خود اُس کے اپنے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اُس وقت یہ بے چارہ لبِ گور گنہگار اُس پر ایمان لے آیا۔ کالون صاحب لکھتے ہیں کہ اُن آنکھوں کی نظر کیسی صاف ہو گی۔ جو موت میں زندگی کو۔ بربادی میں عظمت کو۔ شرم و بے عزتی میں جلال کو شکست میں فتح کو۔اور غلامی میں بادشاہی کو دیکھنے پر قادر تھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آیا دُنیا کے آغاز سے کبھی بھی ایسا ایمان سننے میں آیا ہے۔ لوتھر بھی کچھ کم ثناخواں نہیں ہے اور لکھتا ہے کہ ''مسیح کے لئے یہ بھی اُسی قسم کی تسکین و تسلی تھی جیسے کہ فرشتے نے باغ میں دی ہو گی۔ بھلا خُدا کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ کہ اُس کا بیٹا تابعین (پیروی کرنے والے) سے خالی رہے۔اور اُس وقت اُس کی کلیسیاء

گویااُس آدمی میں زندہ موجود تھی۔ جہاں مقدس پطرس کاایمان زائل ہوگیا۔وہاں ایک چور کاایمان شروع ہوا''۔اورایک اور صاحب[1] پوچھتے ہیں کہ ''کیا کبھی ایساہواہے کہ ایسی نئی پیدائش ایسے عجیب گھوارے (جھولے) میں واقع ہو؟''۔

۳۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یسوع نے اُس شخص کوالفاظ کے ذریعہ مومن نہیں بنایا۔اُس نے ہر گزاُس چور سے ایک لفظ بھی نہیں کہا پیشتر اس کے کہ وہ خوداُس سے ہم کلام ہوا۔اُس کی توبہ وپشیمانی مسیح کے بولنے سے پہلے ہی شروع ہوچکی تھی۔ لیکن یہ بھی خوداُسی کاکام تھا۔ مگر اُس نے یہ کس طرح کیا؟ جیسے کہ مقدس پطرس نے دیندار عورتوں کو نصیحت کی تھی۔کہ وہ اپنے بے دین خاوندوں کے ایمان لانے کاذریعہ بنیں۔اوریوں لکھا تھا کہ '' اے بیویو! تم بھی اپنے اپنے شوہروں کے تابع رہو۔کہ اگر بعض اُن میں سے کلام کو نہ بھی مانتے ہوں۔تو بھی تمہارے پاکیزہ چال چلن اور خوف کو دیکھ کر بغیر کلام کے اپنی اپنی بیویوں کے چال چلن سے خدا کی طرف کھنچ جائیں''۔یہ اُس کے صبر و تحمل اُس کی بے گناہی اُس کے اطمینانِ قلب (دل)اوراُس کی عالی حوصلگی کاذریعہ تھا کہ یسوع اس آدمی کے دل کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا۔اوراس امر میں بھی وہ ہمارے لئے ایک نمونہ چھوڑ گیاہے کہ ہم بھی اُس کے نقش قدم پر چلیں۔

لیکن اُس کے کلام نے بھی جب وہ اُس سے مخاطب ہوااس اثر کواور بھی گہرا کردیا۔اُس کے الفاظ تھوڑے سے تھے۔مگران میں سے ہرایک اُس کے نجات دہندہ ہونے کاثبوت تھا۔

یہ چور توکسی آنے والے دن کامنتظر تھا۔جب کہ مسیح اُس کی سفارش کرے گا۔مگر مسیح فرماتاہے ''آج''۔یہ اس امر کی نبوت بھی تھی۔کہ وہ اُسی روز مر جائے گا۔اور جیسا کہ عموماً مصلوبوں کاحال ہوتا تھا۔بہت دنوں تک وہاں صلیب پر نہیں لٹکارہے گا۔اور یہ بات پوری ہوگئی۔ مگراس کے علاوہ یہ اس امر کاوعدہ بھی تھا۔کہ جیساہے موت اُسے اس دُنیا میں سے لے کر ابدیت میں داخل کردے گی۔ مسیح وہاں اُس کے استقبال کو کھڑا ہوگا۔''آج تومیرے ساتھ ہوگا''آسمان کی ساری خوشی اور شان وشوکت انہیں دولفظوں میں بھری ہے۔ہمارے نزدیک آسمان اور کیاہے۔اور ہم وہاں اور کس چیز کے خواہش مند ہیں سوائے اس کے کہ وہاں ہم ''مسیح کے ساتھ''ہوں گے۔مگراس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی اُس نے کہایعنی ''فردوس میں''بعض کا خیال ہے کہ اس عام لفظ کے استعمال کرنے میں مسیح گویااُس تائب چور کے خیال کالحاظ کررہا تھا۔کیونکہ عام طور پر جب دوسرے جہان میں کسی خوب صورت اور پُرآرام مقام کاذکر کرتے ہیں۔تواُس کاتصّور اسی لفظ سے ادا کرتے ہیں۔کم سے کم اس لفظ کے استعمال سے جس کے اصلی معنی ''باغ یاگلشن'' کے ہیں اور جواُس مقام کی نسبت بولا جاتا تھا۔جہاں ہمارے پہلے والدین یعنی آدم وحوار کھے گئے تھے۔خود بخود لبِ مرگ آدمی کے خیال میں ایک ایسی جگہ کاتصور پیدا کرتاہے جہاں حسن وخوبی۔بے گناہی اورامن کی حکومت ہے اور جہاں وہ گذشتہ غلطیوں اور نقصوں کی غلاظت سے پاک صاف ہوکر ایک نئی مخلوق کی مانند زندگی بسر کرنا شروع کرے گا۔بعض مسیحیوں کا بھی ایساخیال ہے۔کہ ایسی رُوح جیسی کہ چور کی تھی۔کم سے کم شروع شروع میں۔جو کچھ آئندہ جہان میں ملنے کی اُمید کرسکتی ہے۔سوپر گٹنٹوری یعنی عالم اعراف یابرزخ کی آگ ہے۔جس میں یہ خیال کیاجاتاہے۔کہ ارواح گناہوں سے صاف کئے جاتے ہیں۔مگر مسیح کافضل اس سے کسی مختلف چیز کاوعدہ کرتاہے۔اُس کاکام عظیم اور کامل ہے اوراس لئے وہ ہمیں کامل نجات عطا کرتاہے۔

---

[1] ۔ تھولک صاحب جو جرمنی میں ایک نہایت عالم فاضل شخص گزرے ہیں۔

اس دوسرے کلمہ سے جو مسیح نے صلیب سے فرمایا خاص طور پر ہمیں نجات دہندہ کی عظمت کا پتہ ملتا ہے۔اور اگرچہ وہ صاف صاف نہیں بیان ہوا۔ تو بھی اس وجہ سے اور بھی بہت دل نشین معلوم ہوتا ہے چور نے اُس وقت اُسے ایسے طور سے مخاطب کیا گویا کہ وہ بادشاہ ہے۔اور اُس سے اس طور پر دُعا والتجا کی گویا کہ وہ خُدا سے کرتا ہے۔اور اُس نے کس طور پر اُسے جواب دیا؟ کیا اُس نے اُسے یہ کہا کہ "مجھ سے دُعا نہ کر۔ میں تو تیرے ہی جیسا انسان ہوں۔اور میں اُس عالم سے جس میں ہم دونوں داخل ہونے کو ہیں۔ایسا ہی بے خبر ہوں۔ جیسا تو؟ اگر وہ محض انسان ہی ہوتا۔ جیسا کہ بعض لوگ اُسے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُسے یقیناً اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا مناسب تھا۔ مگر اُس نے اپنے فریادی کی اس عقیدت کو قبول کر لیا۔اور دوسرے عالم کا ایسے طور سے ذکر کیا۔ گویا کہ وہ اُس کا اپنا وطن ہے۔اور وہ اُس سے خوب واقف ہے۔اُس نے اُس کو یہ یقین کرنے کا موقعہ دیا کہ اُس عالم میں اُس کو اُسی قدر اختیار وقدرت حاصل ہے۔ جیسے کہ وہ اُس کی طرف منسوب کرتا ہے۔اس بڑے گنہگار نے اپنی جان اور گناہ اور اپنی ابدیت کا بوجھ مسیح پر رکھ دیا۔ اور مسیح نے اُس کے اس بوجھ کو بخوشی قبول کر لیا۔

سولھواں باب

تیسرا کلمہ صلیب پر سے[1]

ہمارے خُداوند کی زندگی شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کا معجون (مرکب) معلوم ہوتی ہے۔ جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنی سی ادنی باتیں باہم ملی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ جب کہ اُس کے الہٰی مرتبہ کی ایک شعاع اپنی چمک دمک سے ہماری آنکھوں کو چوندھیا دیتی ہے۔ تو ہمیشہ اُس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی واقع ہو جاتی ہے۔ جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ وہ ہماری ہڈی میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔اور برعکس اس کے جب وہ کوئی ایسا کام کرتا ہے۔ جس سے اُس کی انسانی ذات کا خیال ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ تو اُس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی واقع ہو جاتی ہے۔ جس سے ہم کو یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ وہ محض ابنِ آدم ہی نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اپنی ولادت کے وقت وہ چرنی میں رکھا گیا۔ لیکن باہر بیت لحم کے چراگاہوں میں فرشتے اُس کی حمد وثنا کا گیت گا رہے تھے۔اس سے بہت عرصہ بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کشتی میں سو رہا تھا۔اور تکان سے ایسا ماندہ ہو رہا تھا کہ ایسے خطرہ کی حالت میں بھی وہ جگانے سے جاگا۔ لیکن جاگتے ہی اُس نے ہوا اور لہروں کو ملامت کی اور فوراً طوفان بالکل تھم گیا۔ جب اُس نے مارتھا۔اور مریم کا رنج وغم دیکھا تو لکھا ہے کہ "یسوع رویا"۔ لیکن اس سے چند ہی منٹ بعد وہ بولا "لعزر باہر نکل آ"۔اور وہ قبر سے باہر نکل آیا۔اور اس کی زندگی کے آخری دم تک ایسا ہی ہوتا رہا۔اُس کے دوسرے کلمہ پر غور کرتے وقت ہم نے دیکھا کہ اُس نے تائب چور کے لئے فردوس بریں کے در کھول دے۔آج ہم تیسرے کلمے پر غور کرتے ہیں۔ جس میں وہ ہم پر ایک عورت کا بیٹا ہونے کی حیثیت میں ظاہر ہو گا۔ جو مرتے دم اپنی ماں کی جسمانی پرورش کے لئے فکر مند ہو۔

---

[1] ۔اے عورت دیکھ تیرا بیٹا۔۔۔۔۔دیکھ تیری ماں۔

ا۔

یسوع کی آنکھ اُس مخلوط (ملے جلے) گروہ پر نظر کرتی ہوئی جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔آخر اپنی ماں پر آکر ٹھہری۔ جو صلیب کے نیچے کھڑی تھی۔زمانہ وسطیٰ کے ایک عظیم الشان اور پُر زور گیت میں جس کے لئے بڑے بڑے صاحب کمال موسیقی دانوں نے راگ تیار کئے ہیں۔اس کی حالت کو نہایت دردناک الفاظ میں بیان کیا ہے۔جب وہ جوانی کے عالم میں اپنے پہلوٹھے کو ہیکل میں لائی تو شمعون نے اُسی وقت پیشن گوئی کی تھی۔کہ تلوار تیری جان میں سے گذر جائے گی۔شاید وہ خوشی و خرمی کے ایام میں اکثر اس بات کو یاد کرکے تعجب کرتی ہوگی۔کہ اس مخفی وپر اسرار (پوشیدہ اور عجیب) پیشن گوئی کا کیا مطلب ہے۔لیکن اب وہ اس کا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔کیونکہ اب تلوار وار پر وار کرکے اُس کے دل کو چھید رہی تھی۔

ماں کے لئے اپنے بیٹے کو مرتے دیکھنا نہایت ہی سخت صدمہ جانکا (جان لیوا) ہوتا ہے۔وہ طبعاً یہ اُمید کرتی ہے کہ اُس کا بیٹا اُس کا سر گور (قبر) میں رکھے گا۔خاص کر اس صورت میں جب کہ وہ اُس کا اکلوتا اور اُس کی قوت کا فرزند تھا۔یسوع کی عمر اس وقت صرف ۳۳ سال کی تھی۔اور اُس کی ماں اُس عمر کو پہنچ گئی تھی۔جب کہ مضبوط اور پُر محبت فرزند اُس کے بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔

مگر جس موت وہ مر رہا تھا۔وہ اور بھی اس بسترِ مرگ کو زیادہ دردناک بنارہی تھی۔ایک مجرم کی موت۔بہت سی ماؤں کو اپنے بیٹوں کی موت کی ظاہری صورت سے سخت صدمہ پہنچا ہوگا۔مثلاً جب کہ سخت درد کی حالت میں یا ایسے ہی کسی اور دردناک طور پر اُن کے پران (جان نکلنا) نکلیں۔مگر مقدس مریم کے مقابلہ میں دوسری ماؤں کی تکلیفیں اور دُکھ کیا حقیقت رکھتے تھے؟ یہاں اُس کا لڑکا سامنے اُس کی آنکھوں کے روبرو لٹک رہا ہے۔مگر وہ اُس کی کچھ بھی مدد نہیں کرسکتی۔اُس کے زخموں سے خون جاری ہے۔مگر وہ انہیں پونچھ نہیں سکتی۔اُس کا منہ سوکھ رہا ہے۔مگر وہ اُسے تر نہیں کرسکتی۔ ان ہاتھوں سے جواب صلیب پھیلے ہوئے ہیں۔وہ اپنی ماں سے بغل گیر (گلے ملنا) ہوا کرتا تھا۔وہ ان ہاتھوں اور پاؤں کو ناز سے چوما کرتی تھی۔ہاں! یہ میخیں۔صرف اُس کے ہاتھوں میں سے ہی نہیں۔بلکہ مریم کے دل میں سے بھی پار ہوگئی ہوں گی۔اُس کے سر کے کانٹوں کا تاج اُس کے دل کو آگ کے شعلوں کی طرح جلاتا ہوگا اور جو طعنے مہنے اُس کو دیئے جاتے تھے۔وہ اُس کے دل میں تیر کی طرح لگتے تھے۔

مگر معاملہ اس سے بھی بدتر تھا۔اس تلوار کا زخم اور بھی گہرا تھا۔کیا فرشتے نے اُس کی ولادت سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ "وہ بزرگ ہوگا۔اور خُدائے تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔اور خُداوند خدا اُس کے باپ داؤد کا تخت اُسے دے گا۔اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کرے گا۔اور اُس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا"؟ یہ عظمت و بزرگی۔یہ تخت و تاج۔یہ بادشاہی۔یہ سب کیا ہوگئیں۔ایک زمانہ میں وہ یقین کرتی تھی۔کہ وہ درحقیقت جیسا کہ فرشتے نے اُسے کہا تھا "تمام عورتوں میں سے مبارک" ہے۔جب کہ وہ اُسے بچپن کے حسن و خوبی کے ساتھ اپنی گود میں لیٹا ہوا دیکھتی تھی۔جب گڈریے اور مجوسی اُس کی پرستش کے لئے آئے۔شمعون اور حنانے اُسے دیکھ کر اس کے مسیح ہونے کا اقرار کیا۔اس کے بعد وہ طویل زمانہ آیا جو اُس نے گمنامی کی حالت میں ناصرت میں بسر کیا۔وہ ایک معمولی گاؤں کا بڑھئی تھا۔مگر وہ ہر گز درماندہ (بیچاری) نہ ہوئی۔کیونکہ وہ اُس کے ساتھ گھر میں رہتا تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ یہ بزرگی اور تاج و تخت مقررہ وقت پر ضرور اُسے مل کے رہے گا۔آخر اُس کی گھڑی آپہنچی۔اور اپنے ہتھیار اور اوزار رکھ کر اور اُسے الوداع کہہ کر وہ اُس چھوٹی سی وادی سے نکل کر جس میں اُس کا گھر واقع تھا۔اس بڑی دُنیا میں چلا گیا۔اس وقت اُس نے اپنے دل میں کہا ہوگا کہ اب یہ سب باتیں پوری ہوں گی۔مخصوصیت ہی کے دنوں میں اُسے خبر ملی کہ وہ کیسی توفیق و قدرت الٰہی سے بھری ہوئی باتیں لوگوں کو سناتا ہے۔اور لوگوں کی جماعتیں اُس کے پیچھے چلی آتی ہیں۔قوم جاگتی جاتی ہے۔اور اندھے اور لُنجے اور بیمار اور ماتم زدہ لوگ اُس کے ہاتھوں اور شفا تسلی پاکر اُسے اور اُس کی ماں کو

مبارک کہتے ہیں۔ یہ سُن کراس نے کہاہو گا کہ اب سب کچھ پوراہو گا۔ لیکن جب اُس کے خلاف خبریں پہنچی ہوں گی کہ لوگ اُسے دق کرتے اورایذادیتے ہیں تواُس کادل ڈوب گیاہو گا۔ یہ سن کروہ اپنے گھر میں آرام نہ کرسکی۔ اور ناصرت سے روانہ ہو کر خوف سے کانپتی ہوئی آئی کہ دیکھوں اب وہ کیساہے۔ اوراب وہ صلیب کے دامن میں کھڑی ہے۔ وہ مر رہاہے۔ اوراس کی عظمت اور جلال اور بادشاہت سب کیاہوئیں؟

اس کے کیا معنی ہیں؟ کیافرشتے نے اُسے دھوکا دیا۔ یاخُدا کا کلام جھوٹ تھا۔ اور جو عجائبات اُس کے بچپن میں نظر آئے تھے۔ سب خواب و خیال تھے۔ ہم اب ان ساری باتوں کا مطلب سمجھتے ہیں۔ یسوع اُس تخت کی نسبت جو مریم کے خیال میں تھا۔ اور بھی زیادہ بلند پایہ تخت پر چڑھنے کو تھا۔ اور یہ صلب فقط اُس کا ایک زینہ (سیڑھی) تھی۔ اس سے چندہی ہفتہ بعد مریم نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا۔ مگراس وقت توہر طرف مصر کے جیسی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اُس کے دل کا غم موت کی جانکنی سے کچھ کم نہ ہو گا۔ تلوار فی الحقیقت اُس کے دل میں سے پار ہو گئی تھی۔

۲۔

مریم کے ساتھ صلیب کے دامن میں اور بھی کئی ایک عورتیں کھڑی تھیں[1]۔ جن میں سے دو کانام بھی مریم تھا۔ جیسا کہ ایک قدیمی مصنف لکھتاہے۔ اس وقت کمزور عورت ذات مردوں سے زیادہ مضبوط بہادر نکلی۔ جب رسول اپنے آقا کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تو بھی یہ عورتیں آخری دم تک وفادار ثابت ہوئیں۔ شاید عورت ذات ہونے کے سبب کسی نے اُن سے تعرض (بات کرنا) نہ کیا۔ عورتیں بعض جگہوں میں بلا تحاشا جاسکتی ہیں۔ جہاں آدمی کو جانے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ اوراس قابلیت کو بہت سی عورتیں نے اپنے مالک کی خدمت کے لئے استعمال کیاہے۔ جسے آدمی کبھی سرانجام نہ کرسکتے۔ مگر وہاں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ جو عورتوں کی طرح محفوظ نہیں تھا۔ اور وہ ضرور اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر وہاں تک گیاہو گا۔

یوحنا بھی معلوم ہوتاہے۔ رسولوں کے اُس زمرہ میں شامل تھا۔ جن کی بابت لکھاتھا۔ کہ سب اپنے آقا کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن اگر یہ بات سچ ہے۔ تواُس کا خوف بہت دیر تک نہیں رہاہو گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تحقیقاتِ مقدمہ میں شروع ہی سے وہاں موجود تھا۔ اور یہاں بھی اس آخری گھڑی میں بارھوں میں سے وہی اکیلا اپنے آقا کے پاس موجود ہے۔ شاید سردار کاہن کی واقفیت جس کی بناپر وہ تحقیقاتِ مقدمہ کے وقت محل میں داخل ہو سکا اس وقت بھی اُس کے کام آئی۔ مگر سب سے بڑھ کر اُس کی اعلیٰ عقیدت اور محبت تھی۔ جو وہ اپنے آقا سے رکھتا تھا۔ جو اُسے کھینچ کر اُس کے پاس لے آئی۔ وہ جو اپنے آقا کے سینے پر لیٹا کرتا تھا۔ بھلاوہ کس طرح اُس سے دُور رہ سکتا تھا۔ اور اُسے اس کا اجر بھی مل گیا۔ وہ یسوع کی جان کنی کی حالت میں اُسکی ایک آخری خدمت بجالا سکا۔ اور اُس سے اُس کی اُلفت و محبت واعتماد کا ایسانشان حاصل کیا جسے اُس کے دل نے ایک اعلیٰ درجہ کی عزت واستحقاق سمجھاہو گا۔

۳۔

مگر سب سے بڑھ کر ہمیں اس امر پر غور کرناچاہتے ہیں کہ اس واقعہ سے خود یسوع پر کیااثر ہوا۔ اُس نے اپنی ماں کی طرف نظر کی۔ مگر ایسی نظر جو اور سب طرف سے ہٹی ہوئی تھی۔ وہ اُس وقت ایسی سخت درد سے بے تاب ہو رہاتھا۔ جو ممکن تھا کہ اُسے اپنے سوااور سب کی طرف سے بے خبر کر دیتی۔ یا اگر اُسے سوچنے کی فرصت یاطاقت بھی ہوتی۔ تو مرتے ہوئے آدمی کے پاس اپنے ہی دل میں اور بہت سی باتیں سوچنے کے لئے ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مسیح کے پاس دُنیا بھر کی باتیں سوچنے کے لئے تھیں۔ کیونکہ وہ اس وقت اُس عقدہ (مشکل کام) کے حل کرنے میں جس پر اس کی ساری

---

[1] ۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ آیایوحنا ۱۹: ۲۵ میں دو عورتوں کاذکر ہے یاچار کا کیادوسری سلومی یوحنا کی ماں تھی؟

زندگی صرف (خرچ) ہوئی۔آخری جدوجہد میں مشغول تھا۔اُس کا اپنے دشمنوں کے حق میں دُعا کرنا ہمیں اس قدر حیرت میں نہیں ڈالتا۔کیونکہ اُس کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے۔کہ یہ اُس کے گنہگاروں کی شفاعت کے کام کا ایک جز تھا۔نہ تائب چور سے ہم کلام ہونا۔کیونکہ یہ بھی اُس کے نجات کے کام سے تعلق رکھتا تھا۔مگر ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے۔کہ ایسی گھڑی میں اُسے معمولی زندگی کے کاروبار سرانجام دینے کی فرصت ملی۔جو لوگ انسانی ہمدردی یا اصلاح ودرستی کی تجاویز میں مشغول ہوتے ہیں۔اکثر دیکھا گیا ہے۔کہ وہ اپنے خانگی (گھریلو) معاملات کی طرف سے غافل (لاپروا) ہو جاتے ہیں۔اور وہ اس بناپر اپنے کو معذور سمجھتے ہیں۔یا دوسرے اُن کی طرف سے معذرت کرتے ہیں۔کہ عوام الناس کی بھلائی کی فکر اُن کے خاندانی تعلقات پر غالب تھی۔کبھی کبھی یسوع کے منہ سے بھی اسی قسم کے کلمات نکلتے تھے۔جن سے معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ بھی اسی خیال پر کاربند تھا۔وہ ہر گز نہیں گوارا کرتا تھا۔کہ اُس کی تدابیر میں اُس کی ماں کسی طرح سے مخل (خلل ڈالنا) ہو۔لیکن اس وقت اُس نے ثابت کردیا کہ اگرچہ وہ اپنی ماں کی ناواجب دست اندازی کو روکنے پر مجبور تھا۔مگر وہ ایک دم کے لئے اُس کے جائز حقوق کو نہیں بھولا تھا۔باوجود اپنی عظمت اور کثرت کاروبار کے وہ اب بھی مریم کا فرزند تھا۔اور اُس سے ویسی ہی لازوال فرزندانہ اُلفت ومحبت رکھتا تھا۔

البتہ اُس کے کلمات تو چند ایک ہی تھے۔مگر اُن الفاظ سے جو کچھ اُس کے لئے کہنا ضروری تھا۔کامل طور پر ادا ہو گیا۔اس حالت میں ہر ایک لفظ جو اُس کے منہ سے نکلتا ہو گا۔اُس سے اُسے سخت تکلیف ہوتی ہو گی۔اس لئے وہ بہت کچھ نہ کہہ سکا۔اس کے علاوہ اُن الفاظ کے چند ایک ہونے سے انہیں ایک طرح کا قانونی رُتبہ حاصل ہو گیا۔جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ گویا اُس کا آخری وصیت نامہ تھا۔اُس نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔"اے عورت۔دیکھو تیرا بیٹا"اور ساتھ ہی اپنی آنکھ سے یوحنا کی طرف اشارہ کیا۔اور اپنے شاگرد سے اُس نے صرف یہی فقرہ کہا۔"دیکھ تیری ماں"۔الفاظ تو سادہ تھے۔مگر اُن سے اُس کا مطلب پورے طور پر ادا ہو گیا۔یہ الفاظ نہ صرف صاف بلکہ قانونی مقررہ الفاظ کی مانند تھے۔لیکن تاہم وہ مریم اور یوحنا دونوں کے لئے محبت سے معمور تھے۔

خیال کیا جاتا ہے۔کہ یوسف مریم کا خاوند خُداوند کی پبلک رسالت کے شروع ہونے کے زمانہ سے پہلے ہی مرچکا تھا۔اور ناصرت میں گھر کا سارا بوجھ یسوع کے کندھوں پر پڑا تھا۔اس میں شک نہیں کہ اپنی تعلیم ووعظ کے زمانہ میں بھی وہ اپنی ماں کی فکر رکھتا تھا۔لیکن اب وہ بھی اُسے چھوڑ چلا۔اور اب یہ بیوہ بے یارومددگار رہ گئی۔اور اس لئے اُس نے اُس کی پرورش کا بندوبست کردیا۔

اُس کے پاس زرومال نہ تھا۔جو اُس کے واسطے چھوڑ جاتا۔اُس کی ساری جائیداد وہ کپڑے تھے۔جو وہ صلیب دیئے جانے کے وقت پہنے ہوئے تھا۔اور یہ سپاہیوں نے بانٹ لئے تھے۔مگر اُن لوگوں کا جو اگرچہ خود بہت ہی غریب وتنگدست ہوتے ہیں۔مگر دوسروں کو بیش قیمت رُوحانی تحفوں سے مالامال کردیتے ہیں۔یہ حق ہوتا ہے۔کہ اُن کو ایسے دوست مل جاتے ہیں۔جو اُن کے یا اُن کے متعلقین کی امداد وخدمت میں اپنا فخر سمجھتے ہیں۔جب اُس نے اپنی ماں کو مقدس یوحنا کے سپرد کیا۔تو یسوع جانتا تھا۔کہ ایسا کرنے میں وہ اپنے شاگرد کو ایک تحفہ عطا کررہا ہے۔نہ کہ اُس پر بوجھ رکھ رہا ہے۔

ہم اس کی وجہ نہیں بتاسکتے کہ وہ اپنے دوسرے بیٹوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں نہ چلی گئی۔وہ اُس وقت مومنین کی جماعت میں شامل نہ تھے۔اگرچہ اس کے بہت جلد بعد وہ بھی اُس پر ایمان لے آئے۔لیکن شاید اور بھی وجوہات ہوں جو ہمیں اس وقت معلوم نہیں ہیں۔

بہر صورت ہم یہ امر بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔کہ مقدس یوحنا کو اس خدمت کے لئے چُننا کیسا بر محل (مناسب) تھا۔اناجیل کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔کہ مقدس یوحنا اوروں سے زیادہ مالدار تھا یا کم سے کم دوسروں کی نسبت زیادہ خوش حال تھا۔اور شاید اس امر کا بھی یسوع نے خیال کیا ہو گا۔وہ اپنی ماں کو ہر گز ایسی جگہ بھیجنا پسند نہ کرتا۔جہاں وہ اُن پر بوجھ ہوتی۔یہ امر اغلب (یقینی) ہے کہ مقدس یوحنا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔مگر اس سے

گہری وجوہات بھی تھیں۔اس شخص کے بازو کے سوا جواُس کے سینہ پر لیٹا کرتا تھا۔دوسرا کوئی بازو نہ تھا۔ جس پر وہ ایسے اعتماد کے ساتھ تکیہ کرتی۔ مقدس پطرس جوایسا گرم مزاج تھا۔اور مچھوؤں کی اکھڑ عادتیں رکھتا تھا۔اس امر کے لئے ایسی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ یوحنا اور مریم دونوں ایک سامزاج رکھتے تھے۔ خاص کر اُس گہری محبت کے لحاظ سے بھی جو دونوں یسوع کی نسبت رکھتے تھے۔ وہ متحد تھے۔ وہ اُس کی نسبت باہم بات چیت کرنے سے کبھی تنگ نہ آتے۔ اُس نے اُن کو ایک دوسرے کے سپرد کرنے سے دونوں کو ایک دوسرے کی نظر میں عزت بخش دی۔ اگر اُس نے مریم کو یوحنا بطور فرزند کے عطا کرنے سے اُسے ایک بڑی نعمت بخشی۔ تو یوحنا کے لئے بھی مریم کا بطور ماں کے ملنا کچھ کم نعمت نہ تھا۔ کیونکہ مریم کی موجودگی سے اُس کے گھر کی رونق وعزت دوبالا ہوگئی۔ علاوہ بریں کیا اُس نے مقدس یوحنا کو بھی ایک خاص معنوں میں اپنا بھائی نہ بنالیا۔ جب اُسے اپنی جگہ مریم کا فرزند بنادیا۔

انجیل نویس لکھتا ہے۔ کہ اُسی گھڑی یوحنا اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اکثر اس فقرے کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ وہ ملائمت کے ساتھ اُسے اُس جگہ سے لے گیا۔ تاکہ اپنے بیٹے کی جانکنی کی تکالیف کو دیکھ کر اُسے اور صدمہ نہ پہنچے۔ اگرچہ وہ آپ پھر کلوری کو واپس چلا آیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دونوں بارہ سال تک یکجا یروشلیم میں رہے۔ اور جب تک مریم زندہ رہی۔ اُس نے انجیل کی منادی کی غرض سے بھی شہر نہ چھوڑا۔ اور افسس اور اُس کے گردونواح میں کام کرتا رہا۔ اور اسی مقام کے ساتھ اُس کے بعد کی زندگی وابستہ رہی۔

۴۔

اس پُرتاثیر نظارہ کے رُوحانی سبقوں کو معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ اس وقت اپنی صلیب کے منبر (پُلپٹ) پر سے یسوع نے تمام زمانوں کے لئے پانچویں حکم پر ایک وعظ سنایا۔

یسوع کی ماں کا دل اس کی تکالیف کو دیکھ کر گویا تلوار سے چھد گیا تھا۔ یہ بڑا تیز آلہ تھا۔ مگر مریم کے پاس ایک چیز تھی۔ جس پر وہ اپنی رُوح کو سہارا دے سکتی تھی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ بالکل بے گناہ معصوم ہے۔ اور اس بات نے اُس کے غم کی سخت وتاریک گھڑیوں میں بھی اُسے تسلی دی ہوگی۔ وہ ہمیشہ سے پاک دل۔ شریف مزاج اور نیک طینت (عادت) لڑکا تھا۔ اور وہ اُس کے صلیب دیئے جانے کے وقت بھی اس امر پر فخر کرسکتی تھی۔ بہت سی ماؤں کا دل اپنے فرزندوں کی بیماری یا بدقسمتی یا پیش از وقت موت سے زخمی ہوتا ہے۔ مگر وہ اسے برداشت کرسکتی ہیں۔ بشر طیکہ یہ زخم زہر آلود تلوار سے نہ لگا ہو۔ مگر وہ تلوار کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اُسے اپنے بیٹے کی خاطر شرمسار ہونا پڑے جب کہ اُس کا بیٹا اپنی ہی بدکرداریوں کے ہاتھوں اس درجہ کو پہنچے۔ تو یہ غم موت سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

کسی ماں کو اپنے بیٹے کی کامیابی اور نیک نامی کو بطور زیور کے پہنے ہوئے دیکھنا کیسا خوشنما نظارہ ہے۔ اے پڑھنے والے! اگر اس وقت تیری ماں اور باپ زندہ ہیں۔ تو چاہیے کہ یہ بات تیرے لئے مہمیز (گھوڑے کو ایڑ لگا کر چلانا) کا کام دے۔ اور آزمائش کے وقت تیری سپر ہو۔ بعضوں کو یہ اچھا موقع بھی ملتا ہے۔ کہ بڑھاپے کے وقت اپنے والدین کی پرورش کریں۔ اور یقیناً عمر بھر میں دُنیا میں اس سے بہتر کون سی اچھی یاد ہوگی۔ رسول لکھتا ہے کہ "اگر بیوہ کے بیٹے یا پوتے ہوں تو وہ پہلے اپنے ہی گھرانے کے ساتھ دینداری کا برتاؤ کرنا سیکھیں۔ اور ماں باپ کا حق ادا کریں کیونکہ یہ خُدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔۔۔۔ اگر کوئی اپنوں اور خاص کر اپنے گھرانے کی خبر گیری نہ کرے۔ تو دین کا منکر اور بے ایمان سے بدتر ہے"۔ ۱یمتھیس ۵: ۸،۴۔

مگر یہ وعظ جو صلیب کے منبر پر سے دیا گیا اور بھی وسیع مطلب رکھتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ یسوع کو نہ صرف ہمارے ابدی یا روحانی بلکہ عارضی یا دُنیاوی امور سے بھی علاقہ (تعلق) ہے۔ خود صلیب پر سے بھی جہاں وہ ایک عالم کے گناہوں کا کفارہ دے رہا تھا۔ اُسے اپنی بیوہ ماں کے آرام و

آسائش کی بھی فکر تھی۔ محتاج اور متروک (ترک کیے ہوئے) اشخاص اس سے سبق و تسلی حاصل کریں۔ اور اپنی تمام فکر کو اُسی پر ڈال دیں۔ کیونکہ اُسے ہماری فکر ہے۔ یہ دیکھ کر اکثر حیرت ہوتی ہے۔ کہ کس طرح بیوہ عورتیں اپنا نبھاؤ کرتی ہیں۔ جب وہ اکیلی یا شاید کئی ایک بچوں کے ہمراہ چھوڑی جاتی ہیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح اپنا گزارہ کرتی ہیں۔ لیکن بہت دفعہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ اُن کا خاندان۔ اوروں کے نسبت جہاں باپ زندہ ہو۔ بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ بچے پہلے ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ ہمیں ماں کی اس ذمہ داری میں حصّہ لینا چاہیے۔ اس لئے وہ اس بات کو سوچ کر بچے نہیں رہتے۔ بلکہ پورے مرد اور عورت بن جاتے ہیں۔ لیکن بلاشبہ بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں وہ خُداوند فراموش نہیں کرتا۔ جس نے کہ اپنی جانکنی کی حالت میں بھی مریم کو یاد رکھا۔

سترھواں باب

چوتھا کلمہ صلیب پر سے[1]

سات کلمے جو خُداوند یسوع مسیح نے صلیب پر سے فرمائے۔ دو حصّوں پر تقسیم ہو سکتے ہیں۔ پہلے تین کلمات میں۔ یعنی صلیب دینے والوں کے حق میں دُعائے خیر۔ تائب چور سے خطاب اور اپنی ماں کے متعلق ہدایات۔ خُداوند نے دوسرے اشخاص کے متعلقہ معاملات کا ذکر کیا۔ لیکن آخری چار کلمے جن کا اب ہم ذکر کریں گے۔ اُن میں وہ فقط اُن اُمور کا ذکر کرتا ہے۔ جو خود اُسکی ذات سے متعلق تھے۔ یہ تقسیم بالکل طبعی معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے قریب المرگ آدمی جب وہ اپنے دُنیاوی معاملات کا انتظام کر چکتے۔ اور اپنے دوست رشتہ داروں کو الوداع کہہ چکتے ہیں۔ تو اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیتے ہیں۔ تاکہ تنہا موت سے دوچار ہوں۔ اور اکیلے خُدا کے ساتھ ہوں۔ اس لئے یہ بالکل یسوع کی شان کے مطابق تھا کہ وہ پہلے دوسروں کے معاملات کا فیصلہ کرلے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہو۔

ان کلمات کے دونوں حصّوں کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ کہ کچھ وقفہ واقع ہوا ہوگا۔ چھ گھنٹے سے نویں گھنٹہ تک یسوع خاموش رہا۔ اور اس اثناء میں تاریکی تمام ملک پر چھاگئی۔ اس تاریکی کا کیا باعث تھا؟ اس وقت تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن تینوں انجیل نویس جو اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ظاہراً یہ خیال کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ یہ ایک طرح سے اُس ہمدردی کا اظہار تھا۔ جو نیچر کو خُداوند سے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آفتاب نے ایسے شرمناک واقعہ سے منہ چھپالیا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ اس قسم کے خوفناک ظہور فطرت کے سبب جو شور و غوغا صلیب کے ارد گرد ہو رہا تھا کم ہوگیا ہوگا۔ آخر کار خود مسیح نے اس خاموشی کی مہر توڑی۔ اور بڑی بلند آواز سے چوتھا کلمہ فرمایا۔ یہ کلمہ حیرت اور جانکنی سے پُر تھا۔ مگر ساتھ ہی اس کے اُس سے فتح مندی بھی نمایاں تھی۔

ا۔

بھلا اس تین گھنٹے کی خاموشی میں خُداوند کے دل میں کسی قسم کے خیال گزرتے رہے ہوں گے؟ کیا وہ اس عرصہ میں اپنے آسمانی باپ کے ساتھ ایک مجذوبانہ (خُدا کی محبت میں غرق) رفاقت میں مشغول رہا؟ اولیاء اللہ کے ساتھ اکثر موت کے وقت ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اور اسکے ذریعے وہ اکثر جسمانی

---

[1] ۔اے میرے خُدا۔اے میرے خُدا۔ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔

تکالیف پر قادر ہوتے ہیں۔ شہیدوں کی حالت بعض اوقات ایسی بلند و مرتفع (اونچا) ہوگئی ہے۔ کہ وہ آگ کے شعلوں کے درمیان بھی خُدا کی حمد کی گیت گاتے سنے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یسوع کے دل کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ تو ہم پر ایک قسم کی ہیبت اور حیرت چھا جاتی ہے۔ جو الفاظ کہ اس خاموشی کے بعد اُس کے منہ سے نکلے اُن سے یہ اندازہ لگانا ممکن ہے کہ اس سے پہلے گھنٹوں میں اُس کے دل میں کیا گزر رہا تھا۔ اور اس آواز سے نہایت ہی گہری مایوسی آشکارا ہوتی ہے۔ فی الحقیقت ایسی دردناک آواز مشکل سے کبھی زمین پر سننے میں آئی ہوگی۔

اگرچہ ہم ان الفاظ سے بالکل مایوس ہوگئے ہیں۔ مگر اب بھی جب کبھی کوئی سریع الحس (نرم دل) آدمی اُسے پہلی دفعہ سنتا ہے۔ تو مارے خوف کے کانپ اُٹھتا ہے ساری بائبل میں شاید ہی کوئی اور فقرہ ہوگا۔ جس کی تفسیر و تشریح ایسی مشکل ہے۔ واعظ جب اس فقرہ پر پہنچتا ہے۔ تو سب سے پہلے اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عذر (بہانہ) کرکے اس پر سے عبور (آگے چلا جائے) کر جائے۔ اور جب وہ اُسے بیان کرنے بھی لگتا ہے۔ تو جب سب کچھ کہہ چکتا ہے۔ تو آخر میں اقرار کرتا ہے۔ کہ اُس کا اصلی مطلب بیان کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن جو شخص ایسے مشکل فقروں کے حل کرنے میں جدوجہد کرے گا۔ وہ اپنا انعام حاصل کئے بغیر نہ رہے گا۔ کیونکہ کوئی سچائی ہم پر ایسا گہرا اثر نہیں کرتی۔ جیسے کہ اُس وقت جب کہ ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جہاں تک ہم اُس کی تہ کو پہنچنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ قدرت صرف ہمیں اُس کے ساحل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور سچائی کا ناپیدا کنار سمندر تو اُس سے بھی پرے پھیلا ہوا ہے۔

خود مسیح کے دل میں ان فقرات کے منہ سے نکالتے وقت جو خیال سب سے اُوپر سطح پر تھا۔ وہ حیرت و تعجب کا خیال تھا۔ گتسمنی کی حالت کے بیان میں لکھا ہے کہ "وہ نہایت حیران ہونے لگا"۔ اور اس قول کا ڈھنگ بھی ظاہر اً وہی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ایسا خیال گزرتا ہے کہ اس قول میں لفظ "تو" پر زور دیا گیا ہے۔ یسوع کا اپنی زندگی بھر یہی تجربہ رہا کہ لوگ اُسے چھوڑ جاتے تھے۔ اور وہ اُس کا بالکل عادی ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے خود اُس کے اپنے گھر کے لوگوں نے اُسے رد کر دیا۔ اور ایسا ہی اُس کے ہم شہریوں ناصرت کے باشندوں نے۔ اور آخر کار ساری قوم نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ گروہیں جو ایک وقت جہاں کہیں وہ جاتا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے جاتی تھیں۔ آخر کار کسی نہ کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے چھوڑ جاتی تھیں۔ آخر کار جب اُس کی زندگی کا آخری وقت آپہنچا۔ تو اُس کے سب سے قریبی شاگردوں میں سے ایک نے اُسے گرفتار کرا دیا۔ اور باقی اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر ان مایوسیوں کے درمیان۔ اگرچہ یہ بھی اُس کے دل میں گہرے زخم کرتی تھیں۔ اُس کو ایک بات ہمیشہ تسلی دیتی رہتی تھی۔ اور جب لوگ اُسے چھوڑ جاتے تھے۔ تو وہ ہمیشہ اُن کی طرف سے منہ پھیر کر اعتماد کے ساتھ اپنے کو خُدا کے سینہ پر ڈال دیا کرتا تھا۔ جس قدر انسانی اُلفت میں اُسے مایوسی ہوتی تھی۔ اُسی قدر زیادہ وہ الٰہی محبت کے پیالے زیادہ شوق سے پیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس امر سے واقف تھا۔ کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ یا جو کچھ اُس پر بیت رہا ہے۔ وہ سب کچھ رضائے الٰہی کے موافق ہے۔ اُس کی حِسات (حِسّ کی جمع) ہمیشہ خُدا کے دل کی حرکتوں کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ خُدا کے خیال اُس کے خیال تھے۔ اور وہ صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ کہ کس طرح الٰہی مشیت و ارادہ (خُدا کی مرضی اور ارادہ) اُس کی زندگی کے تمام مختلف واقعات میں ایک اعلیٰ قسم کا نتیجہ پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ آخری عشاء کے وقت بھی۔ جب اُس نے بارہ شاگردوں کے تھوڑے عرصہ میں اُسے چھوڑ کر بھاگ جانے کا ذکر کیا۔ کہہ سکتا تھا "دیکھو وہ گھڑی آتی ہے۔ بلکہ آپہنچی ہے کہ تم سب پراگندہ ہو کر اپنے اپنے گھر کی راہ لوگے۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گے تو بھی میں اکیلا نہیں رہوں گا کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے"۔ لیکن اب وقت آپہنچا تھا کیا یہ اُمید پوری ہوئی؟ وہ پراگندہ ہوگئے۔ جیسا کہ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ اور وہ اب بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ لیکن کیا وہ اکیلا نہیں تھا؟ کیا اب بھی باپ اُس کے ساتھ تھا؟ اُس کے اپنے ہی کلام سے اس بات کا جواب ملتا ہے۔ "اے میرے خُدا۔ اے میرے خُدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔

۲۔

اگرچہ اس موقع ہمارے خُداوند کی دلی حالت اُس حالت سے جو ہم جانتے ہیں کہ اُس کے لئے ایک معمولی عادت ہو رہی تھی۔ بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔تاہم اُس کی زندگی کی تاریخ میں ایسا موقع ایک ہی پیش نہیں آیا۔ ہم کم سے کم دو اور تجربات سے واقف ہیں جو کچھ کچھ اُسی کی مانند تھے۔ اوراُن سے شاید ہم کواس کے سمجھنے میں مدد ملے۔ پہلا موقع وہ تھا۔ جب کہ اس کی زندگی کے آخر ہفتہ کے شروع میں چند یونانی لوگ اُس سے ملنے کوآئے ۔وہ اُس کی ملاقات کے خواہاں تھے۔اور جب اندریاس اور فیلیبوس نے انہیں اُس کی خدمت میں حاضر کیا۔تو بجائے اس کے کہ یسوع خوش ہو جیسا کہ اُمید کی جاتی تھی۔ وہ اُلٹادرد وغم میں پڑ گیااورایک آہ بھر کر کہنے لگا۔آواب میری جان گھبراتی ہے۔پس میں کیا کہوں ؟اے باپ ! مجھے اس گھڑی سے بچا۔ ان ملاقاتیوں کودیکھ کراُسے یادآگیا کہ غیر اقوام کے لئے ایک عالمگیر مشن قائم کرنا کیسا عظیم الشان اوراُس کے لئے نہایت دلپسند کام ہوتا۔ایسا مشن جو وہ بڑی خوشی سے قائم کرتا۔ بشرطیکہ اُس کی زندگی اُسے موقع دیتی۔ لیکن یہ بات اس وقت ناممکن تھی۔ کیونکہ عینِ عالم شباب میں اُس کے لئے مرنا ضروری تھا۔دوسراموقع گتسمنی کی جانکنی کاموقع تھا۔اگرہم اس واقعہ پر بڑے ادب وتوجہ سے غور کریں گے۔تو معلوم ہوگا۔کہ اس موقع پر کس طرح مسیح کی مرضی بتدریج ترقی کرکے اپنے باپ کی مرضی کے ساتھ کامل طورپر متحد ہوگئی۔انسانی فطرت میں یہ امر داخل ہے کہ وہ درجہ بدرجہ ومنزل بمنزل۔

اٹھارھواں باب

پانچواں کلمہ صلیب پر سے[1]

چوتھا کلمہ جو مسیح نے صلیب پر سے فرمایا۔ایسا معلوم ہوتاہے۔کہ گویا وہ اُس کشمکش کے جو خاموشی اورتاریکی کے تین گھنٹوں کے اثناء میں (جو اُس کے بولے جانے سے پہلے گزرے)نہ صرف آخری حملہ کا۔بلکہ اُس کشمکش سے اُس کے دل کے خلاصی پانے کااظہار بھی کرتاہے۔اس خیال کی مقدس یوحنا کے طریق بیان سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔جواس پانچویں کلمہ کااس طورپرذکر کرتاہے۔کہ ''جب یسوع نے جان لیاکہ اب سب باتیں تمام ہوئیں تاکہ نوشتہ پوراہو توکہاکہ میں پیاساہوں''[2]۔

یہ فقرہ''تاکہ نوشتہ پوراہو''عموماًالفاظ ''میں پیاساہوں'' کے ساتھ ملحق(جوڑا) کیاجاتاہے۔گویاکہ اُس کایہ مطلب تھاکہ یہ الفاظ کہ ''میں پیاساہوں'' اُس نے کسی اس مضمون کی پیشن گوئی کے پوراہونے کے لئے کہے تھے۔اوراس غرض کے لئے لوگوں نے ساراعہدِ عتیق چھان ماراہے۔

مگران الفاظ کاجن کی طرف یہاں اشارہ پایاجاتاہے۔کچھ پتہ نہیں چلا۔مگر میرے نزدیک اس فقرہ کواس سے پہلی عبارت آئینۂ ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔اُن کی صورت بگڑ جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ خُداکی صورت بھی ایسے آئینہ میں عکس انگن ہوکر جسمانی درد کے غباروں کی وجہ سے بالکل خوفناک نظرآنے لگ جائے۔

---

[1] ۔میں پیاساہوں۔

[2] ۔اصل یونانی میں یہ وہی لفظ ہے۔جو خُداوند نے بعدازاں استعمال کیاکہ ''پوراہوا''۔جو ممکن ہے کہ چوتھاکلمہ ہوا۔

یسوع کے لئے اس مہلک درد کی دہشت شاید اوروں کی نسبت زیادہ سخت ہوگی۔ کیونکہ اُس کا مادی جسم بھی زیادہ نازک اور سریع الحس (نرم) تھا۔ اُس کا جسم گناہ کی وجہ سے کبھی کثیف (گاڑھا۔ گندہ) ہونے نہ پایا تھا۔ اور اس لئے موت اُس کے لئے ایک اجنبی اور ناآشنا چیز تھی۔ طبعی زندگی کا روجو خُدا کی ایک بیش قیمت بخشش ہے۔ اُس کے جسم میں افراط و پاکیزگی کے ساتھ بہتا رہا تھا۔ لیکن اب وہ کھینچا جا رہا تھا۔ اور اُلٹا بہنے لگا تھا۔ ایک کامل فطرت کی یگانگت میں سخت خلل برپا ہو رہا تھا۔ اور وہ محسوس کرنے لگا کہ اب وہ اس زندہ دُنیا سے۔ جو اُس کی نظروں میں خُدا کی حضوری اور نیکی سے معمور تھی۔ دُور ہٹتا جاتا ہے۔ اور فنا کی سرد وزرد مملکت کے قریب ہوتا جاتا ہے[1] وہ موت کی ملکیت نہ تھا۔ مگر اس وقت موت کے پنجہ میں گرفتار ہو رہا تھا۔ کوئی فرشتہ اُسے چھڑانے کے لئے نہ آیا۔ اور وہ اپنی حالت پر چھوڑا گیا تھا۔

مگر یہ بآسانی نظر آسکتا ہے کہ اس جانکنی میں جس سے ایسی ہیبت ناک چیخ نکلی۔ جسمانی درد سے بھی بڑھ کر کوئی بات تھی۔ اگر گتسمنی میں ہم یسوع کی قوتِ ارادی کی جدوجہد کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح بتدریج اُس نے باپ کی مرضی کے ساتھ کامل اتحاد حاصل کیا۔ تو اس جگہ ہم اُس کے عقلی قواء کی جدوجہد کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ کہ کس طرح صلیب کی گھبراہٹ اور مخالفت کے درمیان وہ آخر کار حکمتِ الٰہی کے ساتھ بالکل متحد ہو گئیں۔ اُس کی درد ناک آواز میں جو عقلی عنصر شامل تھا۔ وہ لفظ "کیوں" سے بخوبی آشکارا ہوتا ہے۔ اب کبھی اپنے خالق سے لفظ "کیوں" کہہ کر خطاب کرنا پڑتا ہے۔ تو یہ نہایت درد ناک موقع ہوتا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں۔ کہ وہ اس دُنیا کا شاہنشاہ اور ہماری قسمت کا مالک ہے۔ اور وہ ساری دُنیا کا انتظام اپنی لامحدود حکمت اور محبت کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ لیکن اگرچہ عقل انسانی کے لئے اس قسم کا اعتقاد رکھنا ایک مناسب اور صحیح حالت کا نشان دیتا ہے۔ خاص کر اُن لوگوں میں جو سچے پابند مذہب ہیں۔ مگر جب عالم صغیر اور عالم کبیر دونوں کو کبھی کبھی ایسے نازک وقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب کہ ایمان جواب دے جاتا ہے۔ دُنیا بے ترتیب ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کا سارا انتظام بگڑ رہا ہے۔ خُدا کے ہاتھ سے باگیں چھوٹ گئی ہیں۔ اور نظامِ عالم کی گاڑی بے بس ہوئی جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کی رفتار کسی عقل و حکمت کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ اندھی اور بے شعور یا بے رحم قسمت کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے وقت میں بے چارہ انسانی ذہن چلا اُٹھتا ہے کہ "کیوں"؟ ایوب کی ساری کتاب اسی سوال و پکار سے بھری ہے۔ یرمیاہ نبی نے بھی نہایت حیرت بخش دلیری کے ساتھ خُدا کو بھی "کیوں" کہہ کر پکارا۔ مہلک درد اور جانکاہ مایوسی اور ایسی جدائیوں میں جب کہ دُنیا اور رُوح بالکل خالی اور تاریک نظر آنے لگتی ہیں لاکھوں آدمی ہر زمانہ میں یہی "کیوں" کہہ کر فریاد کرتے رہے ہیں۔ اس لفظ سے ظاہراً بالکل بے دینی ٹپکتی ہے۔ جب یرمیاہ نبی پکار اُٹھتا ہے۔ کہ "تو نے مجھے فریب دیا۔ اور میں نے فریب کھایا" یا ایوب یہ سوال کرتا ہے کہ "میں ماں کے رحم میں ہی کیوں نہ مر گیا؟ جب میں پیٹ سے نکلا تو اُسی وقت میری جان کیوں نہ نکل گئی؟ تو یہ کسی کفر بکنے والے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ گرم جوشی اور لطیف مزاج رُوحیں ہی ہیں۔ جن میں اس قسم کی مایوسی کو گھسنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ جاہل اور اوچھے۔ اور ابنِ الوقت (وقت کے بیٹے) اس قسم کی حالت سے بالکل محفوظ ہیں۔ کیونکہ وہ دُنیا کے معمولی رویہ اور حالت سے بالکل مانوس اور اُس کے دلدادہ ہیں۔ سخت دل والے بغیر کسی قسم کی تحقیق و تفتیش کے دُنیا کی حالت پر قانع (قناعت کرنا) رہتے ہیں۔ مگر جس قدر سچی دینداری زیادہ ہو۔ اُسی قدر آدمی خدا کے جلال اور عدل کے لئے زیادہ غیر تمند ہوتا جاتا ہے۔ اگر دُنیا کی حکومت و انتظام میں کوئی امر خلاف عقل و حکمت نظر آئے۔ تو اُسے شاق (مشکل) گزرتا ہے۔ دُنیا کے انتظام میں خُدا کی رحمت و حفاظت کے نشانِ قدم دیکھنے اُس کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ اور اس لئے جب اس قسم کی شہادتیں پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ تو اُسے سخت دُکھ ہوتا ہے۔ اب عالم کی تمام بے اعتدالیاں اور اختلافات

---

[1] ۔ بعض بندگان مصنف کا خیال تھا کہ اس وقت گویا الٰہی اور انسانی فطرت میں جدائی ہونے لگی تھی۔

گلگتا میں متجمع (اکھٹے) ہورہے تھے۔بے انصافی کی فتح تھی۔بے گناہی سے عداوت تھی۔اور وہ پامال ہورہی تھی۔ہر ایک چیز جو کچھ کہ اُسے ہونا مناسب تھا۔ بالکل اُس کے اُلٹ نظر آتی تھی۔اور ''کہا''کیوں''جو ستم رسیدہ دلوں سے۔جو خُدا کی عزت کے لئے غیر تمند مگر اُس کی تقدیر کے بھیدوں سے نا واقف تھے۔نکلتے رہے ہیں۔وہ سب مسیح کے اس ''کیوں''میں جمع ہورہے تھے۔

مسیح ہم سے کس قدر قریب تر ہے۔شاید اپنی زندگی بھر وہ کبھی اپنے بے چارے انسانی بھائیوں سے اس قدر قریب اور متحد نہ تھا۔جیسا کہ اس وقت جب کہ ہم درد یا مصیبت۔جدائی یا موت سے رُودرو ہوتے ہیں۔بلکہ جب ایسا دُکھ اُٹھارہے ہوں۔جو سب دُکھوں سے پرے ہے۔اور ایسا ہیبت ناک ہے۔کہ اُس کی موجودگی میں دماغ چکرا جاتا ہے۔اور ایمان واُمید جو زندگی کی آنکھیں ہیں۔اندھی ہو جاتی ہیں۔ہاں وہ ہیبت ناک موقع جب کہ عالم خُدا سے خالی نظر آتا ہے۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔کہ گویا وہ ایک ڈراؤنا اور برباد ہونے والا اور مادہ کا ایک بے ترتیب ڈھیلا ہے۔جس کی نہ تو کوئی عقل رہنمائی کرتی ہے۔اور نہ کوئی محبت اُسے سہارا دینے والی ہے۔

کیا ہم اس رازلی تاریکی میں ایک اور قدم آگے اُٹھا سکتے ہیں؟سب سے گہرا سوال یہ ہے کہ آیا مسیح کا اس طور سے چھوڑا جانا ظاہری تھا یا باطنی یا یوں کہو کہ کیا محض جسمانی کمزوری اور چشم بصیرت کے عارضی طور پر دھندلا جانے کی وجہ سے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا وہ چھوڑا گیا ہے۔یا کیا ان الفاظ کے حقیقی معنوں میں خُدا نے سچ مچ اُسے چھوڑ گیا ہے۔البتہ ہم اس امر سے خوب واقف ہیں کہ خُدا اُس سے از حد راضی وخوش تھا۔اور شاید ایسا کبھی نہیں ہوگا۔جیسا اس وقت جب کہ وہ اپنے کو دوسروں کے لئے قربان کررہا تھا۔لیکن کیا اُس کے ساتھ ہی الٰہی ذات کے دوسرے پہلو نے بھی اُسے چمکارا دکھادیا۔یا یوں کہو کہ الٰہی غضب کی بجلی اُس پر چمکی۔کلوری پر دلِ انسانی کا ایک نہایت خوفناک اظہار ہوا۔جس کی عداوت نے خُدا کی محبت کے کامل مکاشفہ کو جیسا کہ مسیح میں ہوا۔اپنا نشانہ بنایا تھا۔وہاں انسان کا گناہ اپنی حد کو پہنچ گیا۔اور جو کچھ بدی اُس سے ہونی ممکن تھی کر گزرا۔جو کچھ اس محل (موقع) پر مسیح کے خلاف اور خُدا کے خلاف جو مسیح میں تھا۔ہوا۔وہ گویا سارے عالم کے گناہ کا مجموعہ اور اُس کا لب لباب (خُلاصہ) تھا۔اور بلاشبہ یہ بات تھی۔جو اس وقت یسوع کو دبارہی تھی۔''یہی اُس کی جان کا دُکھ تھا۔وہ اب قریب سے گناہ کی بدصورتی پر نظر کررہا تھا۔اُس کی احساس سے اُسے گھن آتی تھی۔وہ اُس کی وحشت وزبردستی سے پامال۔ہاں موت تک پامال ہورہا تھا۔مگر یہ انسانی فطرت اُس کی اپنی تھی۔وہ اُس کے ساتھ ایک ہوگیا تھا۔وہ اُس کی ہڈی۔اور گوشت میں کا گوشت تھا۔اور جیسے کہ ایک بداطوار خاندان میں سارے خاندان کے قرضوں اور شرمناک کارروائیوں کا بوجھ ایک بہن کے سرپر جو شائستہ اور لطیف خلقت ہو۔پڑتا ہے۔اسی طرح اُس نے بھی اُس قوم کی نالائقی اور نااُمیدی کو محسوس کیا۔گویا کہ یہ اُس کی اپنی ہی تھی۔اور اُس چلاوئے (برّے) کی طرح جن کے سرپر قدیمی شریعت کے مطابق جماعت سے لوگوں کے گناہ رکھے جاتے تھے۔وہ بھی فراموشی کی زمین میں نکل گیا۔

یہاں تک ہم جاسکتے ہیں۔اور محسوس کرتے ہیں۔کہ ہمارے پاؤں کے نیچے کھڑے ہونے کو پختہ زمین ہے۔مگر بہت لوگ اس سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔خود لوتھر اور کولون بھی یہ لکھ گئے ہیں۔کہ اُن گھنٹوں میں جو اس سے پہلے گذرے۔ہمارے خُداوند نے وہ عذاب اور ایذائیں سہیں۔جو راندۂ درگاہ الٰہی (خُدا کی حضوری سے نکالا ہوا) کا حصّہ ہیں۔اور امباخ نامی ایک اور عالم نے جس کے تفکرات بر صعوبات مسیح (تکلیفیں) سینکڑوں برس تک جرمنی کے دینداروں کی خوراک رہی ہیں۔لکھاہے کہ ''خُدا اُس وقت اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کررہا تھا۔جیسا کہ رحیم باپ اپنے بچہ کے ساتھ کرتا ہے۔بلکہ ایسا جیسا کہ ایک ناراض شدہ راستباز قاضی ایک بدکردار کے ساتھ کرتا ہے۔آسمانی باپ اس وقت اپنے بیٹے کو سب سے بڑا گنہگار جو سورج کے نیچے ملنا ممکن ہو سمجھتا ہے۔اور اپنے سارے غضب کو اُس پر اُنڈیل دیتا ہے''۔لیکن اگر ہم اس قسم کے الفاظ کا استعمال کریں۔تو ہم اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔پاک نوشتوں کی اور بنگل صاحب کی سادہ تشریح زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔''اس چوتھے کلمہ میں ہمارا نجات دہندہ نہ صرف یہ فرماتا ہے کہ وہ

آدمیوں کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا گیا بلکہ یہ بھی کہ اُس نے خُدا کے ہاتھوں بھی کوئی ناقابلِ بیان تکلیف اُٹھائی ہے۔ یقیناً یہاں کوئی ایسی بات ہے جو بالکل ناقابل بیان ہے"۔ ہم نے جہاں تک ہماری بساط میں تھا۔ اس راز مخفی (چھپے) کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں۔ کہ ہم ابھی تک اس ناپیدا کنارِ سمندر کے ساحل پر پھر رہے ہیں۔ اور یہ گہرا اور نامعلوم سمندر ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہے۔

۳۔

اس فریاد کو کسی معنوں میں ایک فتح کا نعرہ ٹھہرانا شاید بعض اشخاص کو ایک بناوٹی بات معلوم ہو۔ لیکن اگر جو کچھ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ سچ ہے۔ تو یہ موقع جو سب سے سخت دُکھ اور درد کی گھڑی تھی۔ اس گھڑی میں ایک کار نمایاں بھی سر انجام پا گیا۔ جیسے کہ پھول کو کچل کر اس میں سے عطر نکالتے ہیں اسی طرح وہ بھی دُنیا کے گناہوں کو اپنے دل میں لے کر دُنیا کے لئے نجات خریدنے کا ذریعہ ہوا۔

اور اگر سچ پوچھو تو ساری تاریخ اس امر کی شاہد (گواہ) ہے کہ یہ اسی گھڑی میں تھا کہ مسیح نے بنی آدم کا دل فتح کر لیا۔ اس سے بہت دن پہلے وہ فرما چکا تھا کہ "میں اگر میں زمین سے اُوپر اُٹھایا جاؤں۔ تو سارے آدمیوں کو اپنی طرف کھینچوں گا"۔ اور اس قول کی صداقت صفحۂ تاریخ سے آشکارا (ظاہر) ہے۔ صلیب پر لٹکتا ہوا مسیح اُس گھڑی سے لے کر ہمیشہ انسان کے دل کو اپنا فریفتہ اور گرویدہ (عاشق و دلدادہ) کرتا رہا ہے۔ بنی آدم کے دل و دماغ ہمیشہ اُس کے طرف کھینچے جاتے ہیں۔ اور اس کا مطالعہ کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتے۔ اور اس فریاد کی پکار وہ اعلیٰ نقطہ ہے۔ جس کی طرف تمام سوچنے والے دل خاص کر متوجہ ہوتے ہیں۔ تھیالوجی یعنی علمِ الٰہی کا مرکز بھی صلیب ہی ہے۔ البتہ بعض وقت وہ ذرا اس سے پہلو تہی کرتی رہی ہے۔ اور اسے چھوڑ کر اور اور مضامین میں بھٹکتی پھری ہے۔ مگر جونہی وہ گہری باتوں میں دل لگانے اور عجز و فروتنی کا وطیرہ (طریقہ) اختیار کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ اسی مضمون کی طرف لوٹتی ہے۔

ہاں جب وہ عاجز و فروتن ہوتی ہے۔ تائب (توبہ کرنے والی) روحیں صلیب کی طرف کھینچی جاتی ہیں۔ اور جس قدر اُن کی توبہ زیادہ گہری ہو اُسی قدر اُن کا دل اُس میں زیادہ لگتا ہے۔ وہ مرتے ہوئے نجات دہندہ کے پاس آکر کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ مصائب سب ہم پر واقع ہونے چاہیے تھے۔ ہماری زندگی پر ہمارے جرائم کے سبب موت کا فتویٰ لگ چکا تھا۔ اس طور پر ہمارا خون بہنا چاہیے تھا۔ اور اگر ہم ہمیشہ کے لئے اس جلاوطنی کے دشت (صحرا) میں ڈالے جاتے تو عین انصاف ہوتا۔ لیکن جب وہ اس طور پر اقرار کرتے ہیں۔ تو اُن کی وارفتہ زندگی انہیں مسیح کی خاطر سے واپس مل جاتی ہے۔ اور خُدا کا اطمینان اُن کے دلوں پر نازل ہوتا ہے۔ اور محبت اور خدمت کی نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ سب سے اعلیٰ مسیحی رسم بھی ہمیں اسی مقام پر لاتی اور عین اُسی موقع کی یاد دلاتی ہے۔ "یہ میرا نئے عہد کا خون ہے۔ جو بہتوں کے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا گیا"۔

مگر صرف انہیں گہرے معنوں کے لحاظ سے ہی مسیح کا چوتھا کلمہ فتح و نصرت (جیت) کا نعرہ نہ تھا۔ بلکہ ان معنوں میں بھی کہ اُس کے ذریعہ سے اُسے دل کے غم و غصہ اور بوجھ سے نجات مل گئی۔

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب یونانیوں سے ملاقات کے وقت اُس نے آہ بھر کر کہا کہ "باپ مجھے اس گھڑی سے بچا"۔ تو اُس نے فی الفور اپنے کو روک لیا۔ اور فرمایا "باپ اپنے نام کو جلال بخش"۔ اسی طرح گتسمنی میں جب اُس نے دُعا کی کہ "اگر یہ ممکن ہو۔ تو یہ پیالہ مجھ سے دُور ہو جائے"۔ تو فی الفور یہ فرمایا کہ "تو بھی میری مرضی نہیں۔ بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ مگر اس موقع پر اس مایوسی کی فریاد کے ساتھ اُس نے کوئی لفظ نہ فرمایا۔ جس سے توکل و تسلیم ظاہر ہو۔ لیکن یہ سمجھنا سخت غلطی ہے۔ خود اس آوازہ سے ہے۔ اگرچہ وہ مایوسی کی فریاد معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے ایمان کی مضبوطی عیاں

(ظاہر) ہے۔ دیکھو وہ کس طرح اپنے دونوں ہاتھوں سے ابدیت کا دامن پکڑتا ہے۔"اے میرے خُدا۔اے میرے خُدا" یہ ایک دُعا ہے۔ تحقیقات و آزمائش کے دنوں میں اُس نے ہزار ہا دفعہ اس تسلی و قوت کے وسیلہ کو ستعمال کیا ہو گا۔اور وہ اس دکھ کی سخت گھڑی میں ایسا ہی کرتا ہے۔ایسا کرنے سے مایوسی جاتی رہتی ہے۔جو شخص یہ کہہ کر دُعا مانگ سکتا ہے۔کہ "اے میرے خُدا" وہ کبھی نہیں چھوڑا جاتا۔ جیسے کہ ایک آدمی گہرے پانی میں ہو۔اور تہ میں اُس کے پاؤں نہ لگیں۔ تو وہ مایوسی کی حالت میں آگے کو ایک چھلانگ لگاتا ہے۔اور زمین پر جا پہنچتا ہے۔اسی طرح مسیح نے اس مایوسی کی فریاد کرتے ہوئے اُس پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ محسوس کر کے خُدا نے اُسے ترک کر دیا ہے۔وہ خُدا ہی کی گود کی طرف دوڑا۔اور خُدا کے ہاتھوں نے پدرانہ محبت کے ساتھ اُسے اپنی گود میں چھپا لیا۔ چنانچہ جب وہ تاریکی جو زمین پر چھا گئی تھی۔ نویں گھنٹہ کے قریب دُور ہو گئی۔اُسی وقت اُس کا ذہن بھی اس تاریکی سے جس نے اُسے دُھندلا دیا تھا۔صاف ہو گیا۔اور اُس کے آخری کلمات معمولی اطمینان اور سلامتی کی حالت میں کہے گئے۔

اٹھارھواں باب

پانچواں کلمہ صلیب پر سے[1]

چوتھا کلمہ جو مسیح نے صلیب پر سے فرمایا۔ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اُس کشمکش کے (جو خاموشی اور تاریکی کے تین گھنٹوں کے اثناء میں جو اُس کے بولے جانے سے پہلے گزرے) نہ صرف آخری حملہ کا بلکہ اُس کشمکش سے اُس کے دل کے خلاصی پانے کا اظہار تھا۔اس خیال کی مقدس یوحنا کے طریقِ بیان سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔جو اس پانچویں کلمے کا اس طور سے ذکر کرتا ہے کہ "جب یسوع نے جان لیا کہ اب سب باتیں تمام[2] ہوئیں تاکہ نوشتہ پورا ہو تو کہا کہ میں پیاسا ہوں" یہ فقرہ "تاکہ نوشتہ پورا ہو" عموماً الفاظ "میں پیاسا ہوں" کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ گویا اس کا یہ مطلب تھا کہ یہ الفاظ کہ "میں پیاسا ہوں" اس نے کسی اُس مضمون کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کے لئے کہے تھے۔اور اس غرض کے لئے لوگوں نے پورے عہدِ عتیق کو چھان مارا ہے۔ مگر ان الفاظ کا جن کی طرف یہاں اشارہ پایا جاتا ہے کچھ پتہ نہیں چلا۔

میرے نزدیک اس فقرہ کو اس سے پہلی عبارت کے ساتھ ملحق (جوڑنا) کرنا بہتر ہو گا کہ "یسوع نے یہ جان کر کہ اب سب باتیں پوری ہوئیں "یعنی جب اُس کا کام جو خُدا نے مقرر کیا تھا۔اور جس کی پاک نوشتوں میں ہدایت تھی اختتام کو پہنچ چکا۔ تو اُسے اپنی جسمانی ضروریات کا خیال آیا۔اور وہ بولا "میں پیاسا ہوں"۔ جب کبھی کوئی آدمی کسی خیال میں غرق ہوتا ہے تو وہ عموماً اپنی جسمانی ضروریات سے غافل ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ کسی دلچسپ کتاب کو پڑھتے ہوئے نیند اور خوراک کا گھنٹوں خیال تک بھی نہیں آتا۔اور جب آدمی اُس محویت کے عالم سے نکلتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کیسا درماندہ (نڈھال) ہو رہا ہے۔ بیابان میں جب مسیح آزمایا گیا۔ تو اُس وقت بھی وہ ایسا محو ہو رہا تھا۔ کہ اُسے جسمانی ضروریات کی کچھ فکر نہ تھی۔ لیکن جب یہ روحانی توغّل (ایک کام میں بہت لگے رہنا) دُور ہو گیا۔ تو "اُس کے بعد اُسے بھوک لگی"۔

موجودہ حالت میں جب وہ اُس روحانی غشی سے برآمد (نکلنا) ہوا۔ تو اُسے پیاس لگی۔ مجھے ایک دفعہ ایک جرمن طالب علم سے جو اُس جنگ میں جو فرانس اور پرشیا کے مابین (درمیان) واقع ہوئی شامل تھا۔ گفتگو کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک لڑائی میں جو پیرس کے قریب واقع ہوئی تھی۔ زخمی ہو گیا۔ اور

---

1 میں پیاسا ہوں

2 اصل یونانی میں وہی لفظ ہے۔ جو خُداوند نے بعد ازاں ستعمال کیا "کہ پورا ہوا" جو ممکن ہے کہ چوتھا کلمہ ہو۔

میدان میں پڑا رہ گیا۔ کیونکہ ہل جُل نہیں سکتا تھا۔ اُسے ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا۔ کہ اُس کا زخم کس قسم کا ہے مگر اُسے یہ خیال گزرا کہ شاید وہ مر رہا ہے۔ درد بشدت ہو رہی تھی۔ اور اُس ارد گرد زخمی اور قریب المرگ آدمی آہ نالہ کر رہے تھے۔ لڑائی ابھی زوروں پر تھی۔ اور گولے ہر طرف گرتے اور زمین کو شق (پھاڑنا) کئے دیئے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک اور قسم کی درد سب دُکھوں پر حاوی ہوگئی۔ اور وہ بہت جلد اپنے زخم اور خوف و دہشت بلکہ اپنے ہمسائیوں کو بھی بھول گیا۔ یہ پیاس کی شدت تھی۔ وہ اُس وقت دُنیا بھر کو ایک قطرہ پانی کے لئے دے ڈالتا۔ صلیب کے وقت بھی سب سے زیادہ تکلیف اسی سے ہوتی تھی۔ اس خوفناک طریق سزا کی ایذائیں نہایت مختلف اور سخت قسم کی ہوئی تھیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ سب اسی ایک مرکز یعنی شدت کی پیاس میں ایسی جمع ہو جاتی تھیں۔ کہ پھر سوائے اس کے اور کسی درد کا خیال تک نہ رہتا تھا۔ اور اسی تکلیف کے باعث خُداوند کا پانچواں کلمہ اُس کے منہ سے نکلا[1]۔

ا۔

جسمانی درد کے متعلق صرف یہی ایک قول تھا۔ جو خُداوند نے صلیب پر سے فرمایا۔ جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مصلوب آدمی کے واسطے یہ ایک معمولی بات ہوا کرتی تھی۔ کہ جب اُسے میخوں سے صلیب پر جڑنے لگتے تھے۔ تو وہ یا تو جلادوں کی بے فائدہ منت سماجت کرنے لگتا تھا۔ کہ اُسے اس مصیبت سے چھڑا دیں۔ یا اُلٹا انہیں گالی گلوچ دینے لگتا تھا۔ مگر اُس وقت یسوع نے ایک کلمہ بھی نہیں کہا۔ اس کے بعد بھی باوجود دیکہ ہر گھڑی اُس کا درد بڑھتا جاتا تھا۔ اُس نے برابر اپنی طبیعت پر قابو رکھا اور اس عرصہ میں وہ یا تو دوسروں کی خبر گیری میں یا خُدا سے دُعا مانگنے میں مشغول رہا۔

یہ صبر و تحمل کی ایک نہایت عظیم الشان مثال ہے۔ اور اس سے ہماری نزاکت پسندی۔ اور درد و تکلیف سے پہلو تہی کرنے کی عادت پر سخت ملامت ہوتی ہے۔ ہم کیسے ذرا ذرا سی بات پر چلانے لگتے ہیں۔ اور اگر ہمیں ذرا سی بھی تکلیف یا ضرر پہنچے۔ تو ہم کیسے چڑ چڑے اور بدمزاج بن جاتے ہیں۔ اور سر ہو یا دردِ دندان (سر یا دانت کا درد)۔ زکام ہو۔ یا کوئی اور شکایت۔ بس مزاج پر قابو چھوڑنے کے لئے کافی بہانہ مل گیا۔ اور سارا گھر بھر ہے کہ آپ کے سبب سے بے چین ہو رہا ہے اسی لئے مصیبت سے جو فائدہ ہمیں پہنچنا چاہیے۔ ہم اُس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سے بعض طبیعتیں تو بالکل ترش اور خود غرض ہو جاتی ہیں۔ اکثر مریض اسی گناہ میں گرفتار ہیں۔ وہ اپنی درد و تکلیف میں ایسے محو ہو جاتے ہیں۔ کہ سارا گھر اُن کے مزاج داری کا غلام بن جاتا ہے۔ مگر بہت ایسے بھی شریف مزاج ہیں کہ وہ اس آزمائش پر غالب آجاتے ہیں۔ اور اس امر میں وہ اپنے نجات دہندہ کے نمونہ پر چلتے ہیں۔ ایسی بیماری کے کمرہ بھی ہیں۔ جہاں جانا انسان کی رُوح کو تقویت بخشتا ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ اس جگہ ایک شخص نہایت شدت کی درد سے جان بلب (مر رہا ہے) ہو رہا ہے۔ مگر جب تکیہ پر نظر کرو۔ تو ایک شیریں اور متحمل صورت نظر آتی ہے۔ اُس کی آواز سے بشاشت (خوشی) اور شکر گزاری ٹپکتی ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے آپ میں محو ہو جائے۔ وہ دوسرے کے لئے فکر مند ہو رہا ہے۔ مجھے اس وقت ایک ایسی ہی بیمار کا حال یاد آتا ہے۔ جس کا ذکر ایک دوست نے

---

[1] ۔اُسے اس وقت چار یا اس سے زیادہ گھنٹے صلیب پر لٹکے ہو چکے تھے۔ وہ آدھی رات کے قریب گرفتار ہوا تھا۔ مذہبی عدالت قریب طلوع آفتاب ختم ہوئی۔ پیلاطس کی عدالت میں وہ چھ سے نو بجے تک یا اس سے زیادہ عرصہ رہا ہو گا۔ وہ دوپہر کے قریب صلیب پر کھینچا گیا۔ اور دوپہر سے تین بجے تک تاریکی چھائی رہی۔ اور اس وقت اور شام کے درمیان موت اور تدفین واقع ہوئیں۔ دیکھو متی ۱:۲۷ مرقس ۱۵:۲۵، ۳۳، ۲۴، ۴۲ مقدس یوحنا کے بیان سے وقت کی بابت ۱۹:۱۴ ایک مشکل پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی اور طریق سے وقت کا شمار کرتا ہے۔ دیکھو اینڈیوز صاحب کی حیات مسیح صفحہ ۵۴۵۔ اسی آیت میں مقدس یوحنا بیان کرتا ہے کہ ''وہ فسح کی تیاری تھی''۔ کیا اس کے معنی ہیں عید کے شروع ہونے سے پہلے کا دن۔ یا فسح کے ہفتہ کے شروع ہونے کا سبت؟ اور بھی ایسے اشارات ہیں۔ جن سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مقدس یوحنا کے نزدیک صلیب فسح کے شروع ہونے کے ماقبل روز میں واقع ہوئی۔ حالانکہ پہلی تین اناجیل اسے اس کے بعد ٹھہراتی ہیں۔ (خاص کر دیکھو یوحنا ۱۸:۲۸ سوال یہ ہے کہ آیا فسح کے معنی فسح کا برّہ ہے یا گلیلر یا عرف جو اُس دعوت کا جو دوسرے دن واقع ہوتی تھی ایک حصّہ تھا اس مسلہ ۔۔۔۔ بہت کچھ کہا گیا ہے۔

مجھے سنایا تھا۔اس کے کمرہ میں ہر طرف بشاشت (خوشی)اور کاروبار کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ سال کے ایک حصّہ میں وہاں سوزن کاری اور اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی جو وہ ہندوستان کے مشن سکولوں کے لئے تیار کیا کرتی تھی۔ایک خاص نمائش گاہ لگا کرتی تھی۔اس دور دراز ملک کے لڑکوں کی ضرورتوں کا خیال کرنے سے یہ مریضہ نہ صرف اپنی تکالیف کا مقابلہ دلیری سے کر سکتی تھی۔ بلکہ خُدا کے کام اور خُدا کے بندوں کے ساتھ ایک دل پسند تعلق قائم رکھتی تھی۔ لیکن اُس کی حالت ایسی تھی کہ اگر وہ چاہتی تو کچھ بھی کام کاج نہ کرتی۔اور اُس کو کوئی بھی قابل الزام نہ سمجھتا۔اور بجائے اس کے وہ اپنے گھر کے لوگوں کو دق کرتی اور اُن کے لئے تکلیف دہ بے آرامی کا باعث ہوتی۔

لیکن مسیح کے اس کلمہ میں برداشت سے بھی بڑھ کر ایک اور بڑا سبق نکلتا ہے۔اُس نے جسمانی تکلیف کے اظہار میں گو صرف ایک ہی کلمہ بولا۔ مگر بولا تو سہی۔اُس کی خودِ ضبطی میں کسی قسم کی بے اعتنائی یا غرور نہ تھا۔تکلیف کے وقت بعض آدمی فقط اپنی تکلیف کو زور سے دبا کر خاموش رہتے ہیں۔

جب کہ اپنی ہمت کو اس امر (کام) پر آمادہ (راضی) کرکے یہ ٹھان لیتے ہیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔کسی کو اُن کے منہ سے اُف سننے کا موقع نہ ملے۔وہ اپنی خاموشی کو برقرار رکھنے میں۔ تو کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر اس میں کچھ لطف نہیں۔اُن کے دل میں تو کوئی محبت یا صبر و تحمل کا خیال نہیں۔ مگر فقط قوت ارادی کا زور دکھائی دیتا ہے۔اس قسم کی آزمائش خاص کر اُس وقت وارد ہوتی ہے۔جب کوئی شخص ہمیں نقصان پہنچائے۔اور ہم نہیں چاہتے کہ اُس پر ظاہر ہو کہ ہم کو اس سے کس قدر دُکھ پہنچا ہے۔تاکہ اُسے ہماری تکالیف دیکھ کر خوش ہونے کا موقع نہ ملے۔یسوع ایسے آدمیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جنہوں نے اُس پر سخت ظلم و ستم کیا تھا۔نہ صرف اُس کو جسمانی تکلیف پہنچائی تھی۔ بلکہ اُس کی تکلیف پر ہنستے اور پھبتیاں (مذاق کرنا) اُڑاتے رہے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو یہ ارادہ کرلیتا۔ کہ اپنی تکالیف کو اُن پر ظاہر نہ کرے۔ یا کم سے کم یہ کہ اُن سے کسی قسم کی مہربانی کا طلب گار نہ ہو۔ بعض اوقات کسی سے مہربانی کا طلب گار ہونا بہ نسبت دوسرے پر مہربانی کرنے کے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے زیادہ تر ایسے مزاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو دوسروں کی تقصیروں (گناہوں) کے معاف کرنے پر آمادہ ہو۔ مگر یسوع نے دوسروں سے مہربانی کی درخواست ہی نہ کی بلکہ اُس کے حاصل ہونے کا بھی اُمیدوار تھا۔ اگرچہ اُن لوگوں نے جن سے وہ اُس کا خواہاں (خواہش مند) ہوا۔اُس کے ساتھ نہایت شرمناک سلوک کیا تھا۔ تو بھی اُسے یقین تھا کہ اُن کے دل کی تہ میں اب بھی شاید کوئی نہ کوئی نیکی کا خیال باقی ہو۔وہ زندگی بھر اس امر کا عادی رہا تھا۔کہ جن لوگوں کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ اُن میں نیکی کا ذرہ بھی باقی نہ ہوگا۔ وہ اُن لوگوں میں کوئی نہ کوئی نیکی دریافت کرلیا کرتا تھا۔اور آخر دم تک وہ اپنے اس یقین پر قائم رہا۔دُنیا کا یہ مقولہ ہے کہ سب آدمیوں کو بدمعاش سمجھو۔جب تک کہ اس کے خلاف ثبوت نہ ملے۔خاص کر جب کسی کا کوئی دشمن ہوتا ہے۔وہ اس کی نسبت بہت ہی بُرا خیال رکھتا ہے۔اور جہاں تک ممکن ہو۔اُس کے چال چلن کی نہایت ہی سیاہ تصویر جس میں سفیدی کو دخل تک نہ ہو کھینچتا ہے۔ جن سے ہم اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کمینگی اور ادنیٰ مقاصد کو اُن کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔اور اگر کوئی اُن کے حق میں کلمہ خیر کہے تو یقین نہیں کرتے۔ مگر مسیح کا یہ طریق نہ تھا۔ وہ یقین کرتا تھا۔ کہ ان سنگدل رُومی سپاہیوں میں بھی انسانی محبت و مہربانی کا کوئی نہ کوئی قطرہ ضرور باقی ہوگا۔اور وہ اس امر میں مایوس نہ ہوا۔

۲۔

اس فریاد کو سن کر جس سے اس قدر بے چارگی اور عجز ظاہر ہوتا ہے۔خواہ مخواہ خُداوند کے دوسرے الفاظ جو اس کے بالمقابل معلوم ہوتے ہیں۔یاد آجاتے ہیں۔کیا ممکن ہے کہ یہ وہی شخص ہے۔جو اس سے تھوڑے ہی روز پہلے یروشلیم میں کھڑا پکار رہا تھا۔کہ "اگر کوئی آدمی پیاسا ہے تو میرے

پاس آئے اور پیئے""؟ کیا یہ وہی ہے۔ جو یعقوب کے کنوئیں پر کھڑا سامری عورت سے اُس چشمہ کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہا تھا۔ "جو کوئی اس پانی میں سے پیئے گا۔ پھر پیاسا ہوگا۔ مگر جو کوئی وہ پانی جو میں دُوں گا پیئے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ پانی جو میں دُوں گا۔ اس کے اندر پانی کا چشمہ بن جائے گا۔ جو ابدی زندگی تک اُبلتا رہے گا""؟ کیا یہ شخص وہی ہے۔ جو اس طور پر ساری دُنیا کی پیاس بجھانے کا دعویدار تھا۔ اور اب سخت درماندگی کی حالت میں پھسپھسا رہا ہے کہ "میں پیاسا ہوں"۔

ہاں یہ وہی ہے۔ اور یہ اختلاف و تقابل خُداوند کی ساری زندگی بھر اُس کی باطنی دولت مندی اور بیرونی افلاس میں برابر نظر آتا ہے۔ وہ ساری دُنیا کو دولت مند بنانے کی قدرت رکھتا تھا۔ مگر خود اُس کی ذاتی ضروریات اُن عورتوں کی امداد سے جو اُس کی پیرو تھیں۔ پوری ہوتی تھیں۔ وہ یہ کہہ سکتا تھا۔ کہ "میں زندگی کی روٹی ہوں" لیکن بعض اوقات وہ روٹی کے نہ ملنے سے فاقہ کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنے ایمانداروں سے تختوں اور بہتیرے محلوں کا وعدہ کرسکتا تھا۔ لیکن وہ اپنی نسبت کہتا تھا۔ کہ "لومڑیوں کی ماندیں ہیں۔ اور ہوا کے پرندوں کے لئے گھونسلے۔ مگر ابن آدم کے پاس اتنی جگہ نہیں۔ جہاں اپنا سر رکھے۔

اس دُنیا پرست زمانہ میں جب کہ آدمی کی حیثیت کا اُس کے مال و دولت سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور جب کہ کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کی فکر ہر دم لوگوں کے سر پر سوار رہتی ہے۔ اس بات کو ہر وقت یاد رکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ بنی انسان کے شریف اصحاب بہت کم ایسے گزرے ہیں۔ جنہیں عیش و عشرت میں بسر کرنے کا موقع ملا ہو۔ اور وہ آدمی جنہوں نے عقلی و ذہنی مال و دولت سے بنی انسان کو دولت مند بنا دیا۔ وہ اکثر ٹکڑے ٹکڑے کے محتاج پھرا کرتے تھے۔ اکثر لوگوں نے ہائنی[1] کا نام سُنا ہوگا۔ جس کا نام علوم قدیمہ کی اشاعت کے ساتھ وابستہ ہو رہا ہے جب یہ صاحب طالب علم تھے۔ بلکہ اُس وقت بھی جب وہ علمائے قدیم کی بیش قیمت تصنیفات کے نئے نئے اڈیشن چھاپ کر ملک جرمنی کے لٹریچر کو مالا مال کر رہے تھے۔ تو وہ بے چارہ بھوکوں مرا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات پھلوں کے چھلکوں۔ یا اور ایسی چیزوں پر جو گلیوں میں سے بٹور لاتا تھا۔ گزارا کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر سموئیل جانسن جس نے پہلے پہل انگریزی زبان کی لغات اور اُس کے علاوہ اور عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ اور جس کی ساری دُنیا مقروض (قرض دار) ہے۔ جب وہ ان اعلیٰ تصانیفات میں مشغول تھا۔ تو اُس کے پاس جوتی تک نہ تھی۔ جسے پہن کر باہر نکلے۔ اور اکثر اوقات یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ شام کا کھانا کیونکر نصیب ہوگا۔ تاریخ اس قسم کے لوگوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ جو اگرچہ خود نہایت مفلس ولاچار تھے۔ مگر اپنی محنتوں سے دُنیا کو مالا مال کر گئے۔

اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیے۔ کہ باطنی دولت کے حصّول کے لئے ظاہراً مفلس و نادار ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ ظاہراً مفلس ہیں۔ وہ ہمیشہ روحانی دولت سے مالا مال نہیں ہوتے۔ بلکہ افسوس سے اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ اُن میں سے لاکھوں ایسے ہیں۔ کہ جیسے جسمانی لحاظ سے مفلس ہیں۔ ویسے ہی بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے بھی نکمے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ بطور قاعدہ کلیہ کے جو لوگ باطنی دولت رکھتے ہیں۔ اس زندگی کی اچھی چیزوں میں سے بھی کچھ نہ کچھ انہیں حاصل ہے۔ کیونکہ دانائی اور سمجھ اور نیک چلنی بازار میں بھی اچھے داموں بکتی ہے۔ اس کے علاوہ روپیہ پیسہ کو بھی رُوح کی اعلیٰ باتوں کے حصول کے لئے استعمال میں لاسکتے ہیں مگر سب سے زیادہ یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ باطنی دولت ہی حقیقی دولت ہے۔ اور ہمیں اُسی کو ڈھونڈنا اور حاصل کرنا چاہیے۔ خواہ اُس کے لئے ہمیں بیرونی اشیاء کو ترک ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی شخص بیرونی دولت پر اندرونی دولت کو ترجیح نہیں دے گا۔ تو یقیناً دُنیا بالکل مفلس اور مادی اشیاء کی غلام ہو جائے گی۔ اور کوئی شخص فنون لطیفہ یا علم ادب یا

[1] ۔ان صاحب کی سوانح عمری ترقی جلد ۲ میں چھپ چکی ہے۔

مذہب کا سچا خادم نہیں بن سکتا۔ اگر وہ ان سب کو دُنیاوی مال ودولت پر ترجیح دینے پر آمادہ (راضی) نہیں ہے۔ ہم دانائی فیاضی اور رُوحانی قوت کے ذریعہ سے ہی انسانیت کے اعلیٰ درجوں کو حاصل کرتے ہیں۔ اور سب سے اعلیٰ صفت جو مسیح کی مانند ہے سو یہ ہے۔ کہ ہم میں اس امر کی خواہش اور ارادہ پیدا ہو کہ ہم ایسے کام کر سکیں اور ایسی تاثیر ڈال سکیں۔ جس سے دوسروں کی زندگیوں میں مٹھاس پیدا ہو اور وہ اعلیٰ باتوں کے لئے زیادہ فکر مند ہونا سیکھیں۔

۳۔

یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت صلیب کے پاس ایسے لوگ بھی کھڑے تھے۔ جو یسوع کی اس درخواست کو رد کرنے پر مائل تھے۔ انہوں نے مسیح کے چوتھے کلمہ کا مطلب صحیح نہیں سمجھا تھا۔ اور یہ خیال کرتے تھے۔ کہ وہ الیاس [1] کو بُلا رہا ہے۔ اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ اُسے پانی کا قطرہ بھی نہ دیں۔ تاکہ دیکھیں کہ الیاس اس کی امداد کو آتا ہے۔ یا نہیں۔ لیکن ایک آدمی میں انسانیت کا غلبہ تھا۔ اور اُس نے یسوع کو جو کچھ اُس نے مانگا تھا دے دیا۔ ہمارے دل میں خواہ مخواہ اس شخص کے لئے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور دل چاہتا ہے۔ کہ کاش! میں اُس کی جگہ ہوتا۔

مگر نجات دہندہ اب بھی پکار رہا ہے۔ کہ میں پیاسا ہوں "کس طرح اور کہاں ؟ سنو" میں پیاسا تھا تم نے مجھے پینے کو دیا"" خُداوند ہم نے تجھے کب پیاسا دیکھا۔ اور تجھے پینے کو دیا"۔ چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ کیا تو میرے ہی ساتھ کیا" جہاں کہیں یسوع کے بہن بھائی دُکھ اُٹھا رہے ہیں۔ اور تنگ وتاریک کوٹھریوں میں بیٹھے اس امر کے منتظر ہیں کہ کوئی انہیں دیکھنے آئے۔ یا بسترِ مرض پر لیٹے اس امر کے حاجت مند ہیں کہ کوئی آکر اُن کی تیمارداری کرے۔ یا اُن کے خشک ہونٹوں کو پانی سے تر کرے۔ تو وہاں خود مسیح ہی یہ کہہ رہا ہے کہ "میں پیاسا ہوں"۔

شاید وہ ایسا کہہ رہا ہے۔ مگر کوئی اُس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ بہت سے ایسے ہیں جو زبان سے مسیحی ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر انہوں نے سال بھر میں ایک دفعہ بھی کسی غریب کی امداد نہیں کی۔ وہ خُدا کے گمنام بندوں کی تلاش میں تنگ وتاریک کوچوں میں جانے یا غلیظ سیڑھیوں پر چڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ انہوں نے ایک غم زدہ گھر کو ایک پھول یا خوش آواز رُوحانی گیت سے ایک وقت کا کھانا دے کر خوشحال کرنے کا ہنر ابھی تک نہیں سیکھا۔ اور نہ انہیں مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی کرنی یا انہیں ذرا ہنس بول کر تسلی دینی آتی ہے۔ اگر وہ اس قسم کی ادنی خدمات کو بجالانا سیکھ لیں۔ تو یقیناً بہتوں کی مسیحیت کچھ کی کچھ بن جائے گی۔ اب اُس میں ایک طرح کی جان پڑ جائے گی۔ اور خود اُن کے اپنے دل ایک قسم کی خوشی اور مسرت سے بھر جائیں گے۔ جو پہلے کبھی اُن کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ مسیح اس امر کا ذمہ دار ہے کہ کوئی شخص جو اُس کی خدمت کرتا ہے۔ اپنا انعام نہ کھوئے۔

میرے ایک دوست نے جو امریکہ کا رہنے والا ہے۔ مجھ سے ایک دفعہ ذکر کیا کہ جب وہ یورپ کی سیر کر رہا تھا۔ تو اُسے ایک جہاز پر اُس کا ایک ہموطن مل گیا۔ وہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوئے۔ اور بہت جلد اُس کو معلوم ہو گیا کہ اُس کا ہم کلام کہاں کا رہنے والا اور کون ہے۔ وہ کئی دن تک اکٹھے سفر کرتے رہے۔ اور میرے دوست پر اُس دوست شخص نے اس قدر عنایت ومہربانی کرنی شروع کی کہ آخر کار وہ اُس سے اس کی وجہ پوچھنے سے باز نہ رہ سکا۔ دوسرے نے جواب دیا کہ "سُنو! جب ہمارے ملک میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ تو میں تمہاری ریاست میں خدمت پر مامور تھا۔ اور ایک دن ہم کوچ کرتے ہوئے اُس شہر میں سے گذرے۔ جو آپ کی جائے ولادت ہے اُس دن ہم نے لمبا کوچ کیا تھا۔ اور گرمی بہت سخت پڑتی رہی تھی۔ میں بالکل ماندہ ہو رہا تھا۔ اور مارے پیاس کے جان بلب (مرنے کے قریب) تھا۔ اُس وقت ایک عورت وہیں ایک گھر سے نکلی۔ اور اُس نے بڑی مہربانی سے مجھے ٹھنڈے پانی کا

[1] ۔یعنی ایلی۔ایلی۔لما شبقتنی۔

ایک پیالہ دیا اور میں اس وقت تمہارے ذریعہ سے جو اُس کے ہم شہری ہو۔اُس کی مہربانی کا کسی قدر بدلہ اُتارنے کی کوشش کر رہا ہوں"۔ کیا اس کہانی سے ہمیں ابنِ اللہ کے وہ عظیم الشان الفاظ یاد نہیں آجاتے۔ کہ "جو کوئی ان چھوٹوں میں سے کسی کو شاگرد کے نام پر صرف ایک پیالہ ٹھنڈا پانی ہی پلائے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ وہ اپنا اجر ہرگز نہیں کھوئے گا""؟

لیکن کیا یہی بس ہے؟ کیا کوئی شخص مسیح سے اس قدر قربت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اُس کے اعضاء (یعنی اہل کلیسیاء) کے ذریعہ سے ہی نہیں ۔بلکہ خود اُس کی لبوں کو ٹھنڈے پانی سے سیراب کرے؟ ہاں یہ بھی ممکن ہے یسوع اب بھی فرماتا ہے۔ کہ "میں پیاسا ہوں"۔ وہ محبت کا پیاسا ہے۔ وہ دُعا کا پیاسا ہے۔ وہ عزت کا پیاسا ہے۔ وہ تقدس کا پیاسا ہے جب کبھی کسی آدمی کا دل سچی توبہ یا محبت یا تقدس کے یہ خیال سے اُس کی طرف پھرتا ہے۔ تو نجات دہندہ اُس میں اپنی جان کے درد کو دیکھتا اور تسلی پاتا ہے۔

اُنیسواں باب

چھٹا کلمہ صلیب پر سے[1]

پانچویں کلمے کی طرح چھٹا کلمہ بھی یونانی زبان میں فقط ایک ہی لفظ ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے۔ کہ یہ اکیلا لفظ ایسے سب اکیلے الفاظ سے جو کبھی کسی کی زبان سے نکلے ہوں عظیم الشان ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ تمام دُنیا کی نجات پر حاوی ہے۔ اور ہزار ہا آدمیوں نے گناہ کی بے قراری کے وقت یا دم مرگ ان الفاظ سے ایسا ہی سہارا پایا ہے۔ جیسے کہ ڈوبتا ہوا ملاح سمندر میں تریری کا سہارا لیتا ہے۔

بعض اوقات اس سے یہ مطلب بھی سمجھا گیا ہے کہ یہ فقط زندگی کے آخری دم نکلنے کا نشان تھا۔ اور اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ سب ہو چکا۔ یہ جان کا درد کمزوری آخر کار ختم ہوئے مگر یسوع کے آخری الفاظ اس لہجہ میں نہیں کہے گئے تھے۔ ہم صاف پڑھتے ہیں۔ کہ پانچواں کلمہ بلند آواز سے کہا گیا تھا۔ اور ایسے ہی ساتواں بھی۔ اور اگرچہ چھٹے کلمہ کی نسبت یہ بات صاف طور پر نہیں لکھی گئی۔ تو بھی ظن غالب (یقینی امکان) یہ ہے۔ کہ اس امر میں بھی وہ دوسرے دونوں کلموں کے موافق ہو گا۔ یہ شکست کی فریاد نہ تھی۔ بلکہ فتح و نصرت (جیت) کی۔

اس وقت ہمارے خُداوند کے دُکھ اور تکلیف اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے کام کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ سمجھنا بالکل طبعی بات ہے۔ کہ اس کلمہ میں دونوں کی طرف اشارہ تھا دُکھ اور کام ہر ایک زندگی کے دو پہلو ہیں۔ مگر بعض میں ایک زیادہ ہوتا ہے۔ بعض میں دوسرا۔ یسوع کے تجربہ میں دونوں زور پر تھے۔ اُس کے پاس ایک بھاری کام کرنے کو تھا۔ اور اُس کے کرنے میں اُس نے سخت درد و دُکھ بھی برداشت کئے۔ لیکن اب دونوں کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچے۔ اور یہی بات ہے جو چھٹے کلمہ سے ظاہر ہوتی ہے اس لئے یہ اوّل تو کام کرنے والے کی کامیابی کا نعرہ ہے۔ اور دوسرے دُکھ اُٹھانے والے کے درد سے فراغت پانے کی ٹھنڈی سانس ہے۔

---

[1] ۔پورا ہوا۔

ا۔

مسیح کے پاس زمین پر ایک بڑا بھاری کام کرنے کو تھا۔ جو آب پورا ہوا۔ یہ دمِ مرگ کا کلام ہمیں اُس کی زندگی کے پہلے کلام کو جو ہم تک پہنچا ہے یاد دلاتا ہے کیا تم کو معلوم نہ تھا۔ کہ مجھے اپنے باپ کا کام کرنا ضرور ہے۔ بارہ برس کی عمر میں بھی اُسے معلوم تھا۔ کہ اس کے آسمانی باپ نے اُسے ایک کام سپرد کیا ہے۔ جس پر اُس کے تمام خیالات لگے رہنے چاہئیں۔ شاید ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت وہ اس کام کا مطلب اُس کے وسیع معنوں کے لحاظ سے پورے طور سمجھے ہوئے تھا۔ جوں جوں وہ عمر میں ترقی کرتا گیا۔ دُوں دُوں وہ اُس کی حقیقت کو زیادہ زیادہ معلوم کرتا گیا۔ جب وہ تن تنہا ناصرت کے کھیتوں اور چراگاہوں میں غور وفکر کے لئے الگ چلا جایا کرتا تھا۔ اُس وقت یہ کام اُس کے دل پر حاوی اور قابض رہتا تھا۔ جب وہ دُعا نماز میں زیادہ زیادہ مشغول ہونے لگا۔ تو اُس کا عزم واستقلال (مضبوط ارادہ) بھی زیادہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے گیا۔ جس قدر وہ انسانی فطرت سے اور اپنے زمانہ کی حالت اور ضروریات سے زیادہ واقف ہوتا گیا۔ اُسی قدر زیادہ صفائی سے اُس کا کام اُس پر ظاہر ہوتا گیا۔ جب وہ عہدِ عتیق کے پاک نوشتوں کو سنتا یا خود اُن کا مطالعہ کرتا تھا۔ تو وہ توریت اور انبیاء کی کتابوں میں رسوم ودستورات اور علامتوں میں اُس کا نشان پاتا تھا۔ وہاں وہ دیکھتا تھا کہ اُس کی زندگی کا پروگرام پہلے ہی سے صاف صاف تحریر ہے۔ اور شاید جب اُس کے زبان سے یہ نکلا کہ "پورا ہوا" تو جو خیال سب سے زیادہ اُس وقت اُس کے دل پر حاوی تھا۔ سو یہ تھا کہ قدیمی پاک نوشتوں میں جو کچھ اُس کے حق میں پیشن گوئی ہوئی تھی۔ وہ سب پوری ہوگئی۔

اور جب اُس کی پبلک زندگی شروع ہوئی تو یہ خیال کہ اُس کو ایک کام سپرد ہوا ہے۔ جو اُسے سرانجام کرنا ہے۔ اُس کی زندگی پر بالکل حاوی ہو رہا تھا۔ یہ اُس کے چہرہ پر بلکہ اُس کی ہر ایک حرکت اور رویہ پر منقش معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے کام سے جو اُسے دُنیا میں سرانجام کرنا ہے۔ خوب واقف ہے۔ اور اس لئے وہ بڑے استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اُسے سرانجام کرنے کو ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ "مجھے ایک بپتسمہ لینا ہے۔ اور جب تک وہ ہو نہ لے میں کیا ہی تنگ رہوں گا۔ ایک عالم محویت میں جب وہ سوخار کے کنوئیں پر سامری عورت سے بات چیت کرچکا تھا۔ اور اُس کے شاگردوں نے کھانا حاضر کیا۔ تو اُس نے یہ کہہ کر اُسے ہٹا دیا کہ "میرے پاس کھانے کے لئے ایسا کھانا ہے جسے تم نہیں جانتے"۔ اور پھر کہنے لگا "میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اُس کا کام پورا کروں"۔ جب وہ آخری بار یروشلیم کو جارہا تھا۔ تو اپنے شاگردوں کے آگے آگے جاتا تھا۔ اور وہ حیران ہوگئے۔ اور جب وہ پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ تو ڈرنے لگے۔ اُس کا مُدعائے زندگی اُس پر حاوی ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے جسم اور جان اور رُوح سمیت اُس میں غرق تھا۔ اُس نے اپنی قوت کا ہر ایک ذرہ اور اپنے وقت کا ہر ایک لمحہ اُس پر خرچ کر ڈالا۔ اب زندگی کے خاتمہ پر جب وہ پیچھے کو نظر دوڑاتا ہے تو اس کے دل میں کسی قسم کا افسوس پیدا نہیں ہوتا کہ ہر ایک قابلیت جو اُسے ملی تھی۔ اُس نے اُس کا بُرا استعمال کیا ہے۔ یا اُسے استعمال کئے بغیر چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب ایک ہی مُدعا کے لئے مرتب کی گئی تھیں۔ اور اُسی ایک ہی کام پر خرچ کردی گئی تھیں۔ مگر مسیح کا یہ کام کیا تھا؟ کن الفاظ میں ہم اُسے بیان کریں؟ بہر صورت وہ کام اُن سب کاموں سے جو کسی ابنِ آدم کے سپرد ہوا ہو بزرگ تر تھا۔ آدمی بہت کچھ کر گزرے ہیں۔ اور بعض نے تو اپنے دل پسند کام کے سرانجام کرنے میں سارا زور اور کوشش خرچ کردی ہے۔ فاتح نے دُنیا کو اپنے زیر نگیں (قبضہ کرنا) کرنے میں اپنے کو مشغول کردیا۔ بہی خواہ قوم نے اپنی قوم کو آزاد کرنے میں۔ فلاسفر نے ملک علم کو وسعت دینے میں۔ موجد اپنی انتھک محنت نیچر کے رازوں کو کھوجنے میں خرچ کر رہا ہے۔ ایک دوسرا آدمی غیر معلوم برّاعظموں کی تحقیقات کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جاتا ہے۔ اور آخرکار اپنی جان اسی کوشش میں گنوا دیتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی کا کام بھی ایسا اہم اور عظیم الشان نہ تھا۔ جسے یسوع کے کام کے مقابل میں رکھ سکیں۔

یہ ایک کام تھا خُدا کے لئے آدمیوں کے ساتھ۔ اور آدمیوں کے لئے خُدا کے ساتھ۔

یہ خیال کہ یہ ایک خُدا کا کام ہے۔ جو خُدا نے اُس کے سپرد کیا ہے۔ اکثر مسیح کے لبوں پر رہتا تھا۔ اور یہ آگاہی اُس کے الہام وہمت کے بڑے بڑے وسائل میں سے تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ مجھے اُس کا کام جس نے مجھے بھیجا ہے۔ دن ہی دن میں کرنا ضرور ہے۔ "یا" اس لئے میرا باپ مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں۔ جو اُسے خوش آتے ہیں" اور اپنی زندگی کے کام کے خاتمہ پر اُس نے اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے۔ "میں نے زمین پر تیرا جلال ظاہر کیا۔ میں نے وہ کام جو تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا۔ پورا کر دیا"۔ یہی اُس کا کام تھا۔ یعنی زمین پر خُدا کا جلال ظاہر کرنا۔ باپ کو بنی آدم پر ظاہر کر دینا۔

مگر ایسا ہی یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اُس کا کام آدمیوں کی طرف سے خُدا کے ساتھ بھی تھا۔ یہ بات اُس کے تمام اقوال اور اُس کی زندگی کے سارے طور وطریق سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ آدمیوں کو خُدا کو پاس واپس لا رہا تھا۔ اور اُسے اُن رُکاوٹوں کو جو سدراہ (رکاوٹ بننا) ہو رہی تھیں دُور کرنا تھا۔ اُسے اُس قبر پر سے جس میں بنی آدم مدفون ہو رہے تھے۔ پتھر اُٹھانا تھا۔ اور مردوں کو پھر زندہ کر کے باہر نکالنا تھا۔ اُسے اپنا سارا زور انسانی جرم کے آہنی دوازہ پر لگا کر اُسے وا (کھولنا) کرنا تھا۔ اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ اور جب کہ اُس نے فرمایا کہ "پورا ہوا" تو وہ اُس وقت سارے بنی آدم سے بھی یوں فرما رہا تھا۔ کہ "دیکھو میں نے تمہارے سامنے ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ اور کوئی شخص اُسے بند نہیں کر سکتا"۔

جس قدر کوئی کام زیادہ طویل اور مشکل ہوتا ہے۔ اُسی قدر اُس کے ختم ہونے پر زیادہ تسکین اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ کسی کام کے ختم کرنے پر جس پر بہت سی محنت خرچ ہوئی اور جس پر بہت وقت لگا۔ کیسا ایک بوجھ سا دل پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اور وہ خود بخود بول اُٹھتا ہے۔ "لو۔ آخر کار یہ بھی نپٹ گیا"۔ انسانی عقل وفراست اور قوت کے اعلیٰ قسم کے کاموں کی انجام دہی سے ایک اس قسم کی تسلی وتسکین حاصل ہوتی ہے۔ کہ اُسے دیکھنے اور سننے والوں میں صدہا سال کے بعد بھی ایک قسم کی ہمدردی اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعر کو اس سے کس قدر لطف حاصل ہوا ہو گا۔ جب کہ زندگی بھر کی محنتوں سے علم کے خزانہ اکٹھے کرتے اور زبان کے استعمال میں کامل مہارت حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنی نظم "دوزخ و بہشت کا حال" یا "نقصان فردوس" پر سالہا سال تک محنت کی ہو گی۔ اور آخر کار بہزار وشواری اور جانکاہی اُسے اختتام کو پہنچا کر اور اپنا قلم کیا کر۔ خاتمہ پر ختم بالخیر لکھ دیا ہو گا؟ کولمبس کو کس قدر مزا آیا ہو گا۔ جب کہ اُس نے پہلے اپنی ساری زندگی لوگوں سے امداد مانگنے میں خرچ کر کے۔ اور آخر کار بہت سی مشکلوں اور صعوبتوں اور اپنے جہاز کے لوگوں کی بغاوتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد اُس کی نظر ڈراین کی چوٹی پر پڑی ہو گی۔ جس سے اُس پر ثابت ہو گیا۔ کہ اُس کوششیں محض خواب وخیال نہ تھیں۔ بلکہ آخر کار تکمیل کو پہنچیں؟ جب ہم پڑھتے ہیں کہ کس طرح ولیم ولبر فورس نے جس کی ساری عمر غلاموں کی آزادی کی کوششوں میں گزری۔ اپنے بستر مرگ پر یہ خبر سُنی کہ آخر انگریزی پارلیمنٹ نے تمام خرچ کی رقم جو اُس امر کی تکمیل کے لئے ضروری تھی۔ جس پر اُس اپنی زندگی قربان کر دی۔ منظور کر لی ہے تو کونسا دل ایسا ہے۔ جو اُس کے ساتھ خوشی وہمدردی میں شریک نہ ہو۔ یہ خیال کر کے کہ کس طرح اُس وقت اُس کے کانوں میں لاکھوں آزاد شدہ غلاموں کے خوشی کے نعرے گونج رہے ہوں گے۔ یہ سب باتیں اس اعلیٰ فتح مندی کے بڑے ہلکے سے نمونے ہیں۔ جو مسیح کو حاصل ہوئی ہوں گی جب اُس نے اپنا زندگی کا سارا کام ختم ہوتا ہوا دیکھا اور نعرہ مارا۔ کہ "پورا ہوا"۔

۲۔

اگر مسیح کے ہاتھوں میں ایک ایسا عظیم الشان کام تھا۔ جسے اُس نے صلیب پر تکمیل کو پہنچتے دیکھا۔ تو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ایسے ہی خاص طور سے دُکھ اُٹھانے والا بھی تھا۔ اس لئے اُس نے اُسے صلیب پر سے اپنے دُکھ درد کی نسبت بھی کہا کہ "پورا ہوا"۔

دُکھ تکلیف کام کا دُوسرا پہلو ہے جیسے کہ آدمی کا سایہ اُس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اسی طرح اس دُکھ تکلیف کو کام کا سایہ کہنا چاہیے۔ یہ اُس کے آلہ کی روک ٹوک ہے۔ جس کے ذریعہ سے اس کارکن کو اپنا کام سرانجام کرنا پڑتا ہے۔

یسوع کی زندگی دُکھ تکلیف سے معمور تھی۔ کیونکہ اُسے اپنا کام ایک ایسے آلے کے ذریعہ سرانجام کرنا تھا۔ جو اُس کا بہت ہی سدراہ (رکاوٹ) تھا۔ اُس کا مُدعا (مقصد) ایسا فیض رساں (فائدہ پہنچانے والا) تھا۔ اور وہ دُنیا کی بہتری کے لئے ایسا سرگرم تھا۔ کہ ظاہراً یہ اُمید ہوتی ہے۔ کہ اُس کو ایسے کام میں ہر طرح کی حوصلہ بڑھانے والی امداد ملنی چاہیے تھی۔ وہ ایسا دیندار تھا۔ کہ چاہیے تھا کہ تمام مذہبی قوتیں اُس کی مددگار ہوتیں۔ اور اُس کام میں اُس کا ہاتھ بٹاتیں۔ وہ ایسا محبِ قوم (قوم سے محبت رکھنے والا) تھا۔ کہ طبعی طور پر یہ اُمید کی جاسکتی تھی۔ کہ لوگ ہاتھ پھیلا کر اُسے قبول کرتے۔ وہ ایسا بہی خواہ انسان تھا۔ کہ چاہیے تھا کہ لوگ اُسے سروں پر اُٹھا لیتے۔ لیکن ہر قدم پر اُس کی مخالفت ہوئی۔ اُس کے ملک اور زمانہ کے سب صاحب ثروت و عزت لوگ اُس کی مخالفت پر ڈٹ گئے۔ اور یہ مخالفت دن بدن بڑھتی گئی حتیٰ کہ کلوری پر وہ اپنی حد کو پہنچ گئی۔ جب کہ زمین اور دوزخ کی تمام قوتیں جمع ہو کر اُسے پامال اور فنا کرنے کے لئے جُٹ گئیں۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئیں۔

لیکن اگر ہم کہیں کہ تکلیف فقط کام کے کرنے والے پر اُلٹ کر آپڑنے کا نام ہے۔ تو ہم نے اس راز کو پورے طور پر حل نہیں کردیا۔ جب کہ کام وہ ہے۔ جو ایک آدمی اپنے سارے ارادہ کی قوت سے کرتا ہے۔ تو تکلیف اُس چیز کا نام ہے۔ جو کارندہ (کام کرنے والا) پر اُس کے ارادہ کے خلاف واقع ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اُس کے مخالفوں اور دشمنوں کے ارادہ سے واقع ہوتی ہے۔ مگر یہی کہہ دُنیا کافی نہیں ہے۔ اس ارادہ سے بھی اُوپر۔ جو ممکن ہے کہ بالکل بد ہو۔ ایک اور ارادہ کام کر رہا ہے۔ جو نیک ہے۔ اور ہماری تکالیف سے ہمارے لئے فقط نیکی ہی چاہتا ہے۔

تکلیف خُدا کے ارادہ سے ہے۔ یہ اُس کا بڑا اوزار ہے۔ جس کے وسیلہ وہ اپنی مقررہ تدبیر کے مطابق اپنی مخلوقات کو ڈھال رہا ہے۔ جب کہ اپنے کام کے ذریعہ سے ہم کو چاہیے کہ جیسا وہ چاہتا ہے ہم دُنیا کو ویسے ہی تراشتے جائیں۔ تکلیف کے ذریعہ سے وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق تراش تراش کر بناتا جاتا ہے۔ وہ تکالیف کے ذریعہ سے ہمارا راستہ کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے بند کردیتا ہے۔ تاکہ ہم اُس راستہ میں جو اُس نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے چلیں۔ وہ ہماری خواہشوں اور ہوسوں کو چھانٹتا ہے۔ وہ ہمیں ذلیل کرتا ہے۔ تاکہ ہم حلیم اور فرمانبردار ہوں۔ اور اپنے کام سے ہم دُنیا کے انتظام و درستی میں مدد دیتے ہیں۔ مگر ہماری تکالیف سے وہ ہمیں درست اور پاک کرتا ہے۔ اور اُس کی نظر میں یہ بات زیادہ عظیم ہے۔

شاید ہماری زندگی کا یہ نصف حصّہ قابو میں رکھنا زیادہ مشکل ہے۔ اگرچہ زندگی کے کام کو تکمیل تک پہنچانا بھی کچھ آسان بات نہیں۔ مگر تکالیف کو برداشت کرنا اور اُن سے فائدہ اُٹھانا اس سے کہیں مشکل تر ہے۔ کیا تم نے کبھی ایسا آدمی دیکھا ہے۔ جسے نیچر نے بڑی بڑی قابلیتیں اور توفیق الٰہی نے بڑی بڑی خوبیاں عطا کی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اس خوبی و قابلیت کا آدمی کیا کچھ نہ کر گذرے گا۔ اور جس کام کو ہاتھ لگائے گا۔ ضرور کامیاب ہوگا۔ اگر وہ مشنری بنے گا تو تاریک براعظموں میں انجیل اور تہذیب و شائستگی کی روشنی پھیلا دے گا۔ اگر پارلیمنٹ میں داخل ہوا۔ تو اپنی فصاحت و بلاغت (خوش بیانی) سے لوگوں کے دل قابو میں کرے گا۔ اور اپنی عقل و حکمت سے قوم کو ترقی کے اعلیٰ زینہ تک پہنچائے گا۔ اور اگر تصنیف

وتالیف پر توجہ کی۔ تو زندگی کے گہرے گہرے عقدے حل کرڈالے گا۔ اور جہاں جائے گا۔ نور کا بیج بوتا جائے گا۔ اور اپنے لئے ایک ایسی یادگار چھوڑ جائے گا۔ جو کبھی زائل (ختم ہونا) نہ ہوگی۔ مگر ہم کیا دیکھتے ہیں۔ کہ یا تو اُسے کوئی ایسی بیماری لگ جاتی ہے۔ جو جان لے کر چھوڑتی ہے۔ یا کوئی حادثہ اُسے کچل ڈالتا ہے۔ جس سے اُس کی ساری تدبیریں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اور اُس کی زندگی کا سارا مقصد اپنی صحت کی خبرداری اور موت سے بچنے کی تجاویز میں جو بہت عرصہ تک اُس کو چھٹی نہ دے گی۔ محدود ہو جاتا ہے۔ اور کیا جب تم اُس پر نظر کرتے ہو۔ تو تمہیں یہ خیال نہیں گزرتا کہ اُس کے لئے اس حالت میں سر تسلیم جھکانا اور راضی برضا ہونا زیادہ مشکل ہے۔ بہ نسبت اُس محنت و تکلیف کے جو اُسے اپنی من بھاتی تجاویز کے سرانجام کرنے میں اُٹھانی پڑتی؟ بیکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اکثر اوقات بڑے بڑے مشکل کام کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور اطاعت میں سر جھکانے کے لئے کوئی کارنمایاں کرگذرنے کی نسبت زیادہ ایمان کی حاجت (ضرورت) ہوتی ہے۔

مسیح کی زندگی بھی ہر طرف سے اسی طرح گھری اور دبی ہوئی تھی۔ ظاہراً تو یہ سب بدکردار آدمیوں کا کام معلوم ہوتا تھا۔ مگر وہ ان سب کے پس پشت مرضی الٰہی کو دیکھتا تھا۔ اُسے جلال کی جگہ ایک شرمناک زندگی اختیار کرنی پڑی۔ ایک وسیع کارِ خیر کی جگہ ایک مختصر اور محدود کام میں مشغول رہنا پڑا۔ اور بجائے۔ عالمگیر اور ابدی سلطنت قائم کرنے کے اُسے پیش از وقت اور ہیبت ناک موت سے مرنا پڑا۔ مگر اُس نے کبھی شکوہ نہ کیا۔ قربانی اگرچہ کئی وجہ سے تلخ معلوم دیتی تھی۔ مگر وہ یہ خیال کرکے کہ میرے باپ کی یہی مرضی ہے۔ اُسے اپنے لئے شربت کا پیالہ سمجھتا تھا۔ اور جب یہ حالت بدتر سے بدترین ہوگئی۔ اور اُس کے منہ سے اس قسم کے کلمات نکلے۔ کہ "اگر یہ ممکن ہو تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹ جائے"۔ توفی الفور اُس نے یہ بھی کہا کہ "تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ اور اس طرح سیڑھی کے ہر ایک زینہ پر اُس کے خیال اُس کے باپ کے خیالوں کے ساتھ۔ اور اُس کا ارادہ اُس کے باپ کے ارادہ کے ساتھ باہم متحد و مطابق تھا۔

اور آخر کار وہ پیالہ جسے وہ بار بار زندگی بھر پیتا رہا تھا۔ آخری بار پر اُس کے ہاتھ میں دیا گیا۔ اس دفعہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ لبالب اور سیاہ اور تلخ تھا۔ مگر اُس نے منہ نہ موڑا۔ اور سب کا سب پی گیا۔ اور جب اُس نے اُسے نوشِ جان (خوشی کے ساتھ پینا) کرلیا۔ تو اُس کے اپنے کمال کے دائرہ کی آخری قوس (کمان) کا ٹکڑا مکمل ہوگیا۔ اور جب اُس نے آخری گھونٹ پی کر پیالہ کو پھینک دیا تو وہ پکارا کہ "پورا ہوا"۔ اور اُس وقت اُن لوگوں کی طرف سے بھی جو حیرت اور عبودیت (اطاعت) کی نگاہوں سے اس خصلت کے کامل دائرہ پر نظر کر رہے تھے۔ گونج کی طرح یہ آواز آئی کہ "پورا ہوا"۔

۴۔

اگرچہ مسیح کی زندگی کے یہ دونوں پہلو خیال میں جُدا جُدا کئے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں ایک ہی زندگی کا ظہور ہیں۔ جو کام وہ سرانجام کرنے کو آیا تھا۔ تکلیف اور دُکھ بھی اُس کا ایک حصّہ تھا۔ اور اُس نے اُسے برداشت کرکے اُسے ایک طرح کا رُتبہ اور سرفرازی بخشی۔ اس کے علاوہ دُکھ اور تکلیف کے ذریعہ کارندہ اپنے کمال کو پہنچا۔ اور اس طرح سے اُس کے کام کو بھی اُس سے عظمت حاصل ہوئی۔ دُنیا کے گناہ کے لئے کفارہ دینے میں جو اُس کا سب سے اعلیٰ کام تھا۔ اُس نے تکلیف زدہ آدمی کی حیثیت میں خُدا کی مرضی کو پورا کیا۔ اور اب دونوں کام پورے ہوگئے اور اُس وقت سے دُنیا کو ایک نئی چیز حاصل ہوگئی۔ اُسے پہلے کئی ایک کمال یافتہ چیزیں حاصل تھیں۔ مگر نہ تو اُس سے پہلے اور نہ اُس کے بعد اُسے ایک کامل زندگی نصیب ہوئی۔

بیسواں باب

ساتواں کلمہ صلیب پر سے [1]

اگرچہ مرنے والوں کی ساری باتیں عزیزوں کے نزدیک خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔تاہم آخری کلمہ کو سب سے زیادہ عظمت دی جاتی ہے۔ خُداوند کا یہ آخری کلمہ ہے۔اوراس وجہ سے اور نیز دیگر وجوہات کے باعث وہ ہماری خاص توجہ کے لائق ہے۔

بیان کیا جاتاہے۔کہ ایک مشہور ومعروف انگریز نے اپنے بسترِ مرگ پر اپنے بھتیجے سے کہا تھا۔کہ "پاس آاور دیکھ کہ کس طرح ایک مسیحی مر سکتاہے"۔ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس کا یہ قول دانائی پر مبنی تھا یا نہیں۔مگر یقیناً یہ معلوم کرلینا کہ مرنا کیسے چاہیے۔ہم فانی آدمیوں کے لئے نہایت ہی ضروری علم ہے۔اوراسے ہم ایسے عمدہ طور سے اور کہیں نہیں سیکھ سکتے۔جیسا کہ مسیح کی موت پر غور وفکر کرنے سے۔یقیناً اس آخری کلمہ سے ہمیں تعلیم ملتی ہے کہ مرنا کس طرح چاہیے۔لیکن ہم اس سے اور بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔بشر طیکہ ہمارے پاس اُس کے سمجھنے کے لئے شعور ہو۔اس سے ہم نہ صرف موت کا ہنر بلکہ زندگی کا ہنر بھی سیکھ سکتے ہیں۔مرتے ہوئے نجات دہندہ کے آخری الفاظ ایک دُعا کی صورت میں تھے۔

صلیب پر سے جو کلمات اُس نے فرمائے وہ سب کے سب دعائیں نہ تھے۔ایک کلمہ اُس نے تائب چور سے فرمایا تھا۔دوسرا اپنی ماں اور پیارے شاگرد سے تیسرا اُن سپاہیوں کے حق میں تھا۔جو اُسے صلیب پر کھینچ رہے تھے۔مگر دُعا اُس کی آخری گھڑیوں کی زبان تھی۔یہ ایک اتفاقی بات نہ تھی۔کہ اُس کے آخری الفاظ دُعائیہ تھے۔کیونکہ اُس کے اندر کے سارے رَو(دھارے)ہمیشہ خُدا کی طرف ہی بہتے رہتے تھے۔

اگرچہ دعا ہر وقت اور ہر حالت کے شایاں ہیں۔لیکن بعض ایسے ایسے موقع ہیں۔جن کے ساتھ وہ خاص مناسبت رکھتی ہے۔دن کے خاتمہ پر جب ہم خواب کے لئے جو موت کی تصویر سمجھنی چاہیے۔تیار ہوتے ہیں۔تو دُعا ہمارے کی دل کی خاص حالت ہونی چاہیے۔جب کوئی سخت خوف واندیشہ دامنگیر ہو۔جیسے کہ تختہ جہاز پر جب کہ دفعتہً(اچانک)موت سامنے آجاتی ہے۔تولوگ خود بخود دُعا کے لئے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔عشاء ربانی کی میز پر جب ایک خاموشی کے عالم میں روٹی اور مے تقسیم ہورہی ہوتی۔ہے۔تو ہر ایک سوچ سمجھ والا آدمی دُعا میں مشغول ہوتاہے۔مگر اور حالتوں کی نسبت بسترِ مرگ پر خاص طور پر وہ بر محل(موقع کے مطابق)ہوتی ہے۔اُس وقت ہم خواہے نخواہے سب دُنیاوی اشیاء سے جُدا ہورہے ہوتے ہیں۔دوست اور رشتہ دار۔مال ودولت۔گھر کی آسائش اور زمین کی صورت۔سب ہم سے رخصت ہوتے ہیں۔ایسی حالت میں اُس کی طرف دل لگانا جو اکیلا ہمارے ساتھ رہے گا۔بالکل طبعی بات ہے۔اور یہ بات دُعا سے حاصل ہوتی ہے۔کیونکہ وہی خُدا کا دامن پکڑتی ہے۔

اُس وقت دُعا مانگنا ایسی طبعی بات ہوتی ہے۔کہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا۔کہ دُعا کو آخری گھڑی کا ایک ضروری جز سمجھنا چاہیے۔مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔بستر مرگ خُدا کے بغیر ایک نہایت خوفناک نظارہ ہے۔مگر ایسا اکثر دیکھنے میں آیاہے کہ دل کے تمام خیالات کا زمین کی طرف ایسا پُر زور میلان (رجحان)ہوتاہے۔کہ اُس وقت بھی انہیں اُدھر سے ہٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ایسے بسترِ مرگ بھی ہیں۔جہاں خدا کا خیال کرنے سے بھی دہشت دامنگیر ہوتی ہے۔اوراس لئے مرنے والا حتیٰ الامکان اُسے اپنے سے دُور رکھنا چاہتاہے۔اور بعض وقت اُس کے دوست بھی اس امر میں اُس کی مدد کرتے ہیں۔اور کسی

---

[1] ۔اے باپ۔میں اپنی رُوح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں۔

آدمی کونہ تو ملنے دیتے ہیں۔اور نہ کوئی ایسا کلمہ زبان سے نکالتے ہیں۔ جس سے خواہ مخواہ اُسے خُدا یاد آجائے۔دُعا اگرچہ طبعی امر ہے۔مگر یہ فقط انہی لوگوں کے لئے جنہیں اس سے پہلے اس کی عادت ہورہی تھی۔یسوع کے واسطے تو یہ اُس کی روزمرہ کی زبان تھی۔وہ ہمیشہ بلاتوقف دُعا مانگتا رہتا تھا۔پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔یالوگوں کے مجمع گاہوں میں۔اکیلا ہو۔یادوسروں کی صحبت میں۔اور دمِ مرگ اگر وہ خُدا کی طرف متوجہ ہوا تو یہ اُس کی زندگی بھر کی عادت اُسے کھینچ رہی تھی۔

اگر ہم بھی چاہتے ہیں۔کہ ہمارے آخری الفاظ دُعا پر مبنی ہوں۔تو ہمیں ابھی سے دُعا کی عادت ڈالنی چاہیے۔اگر ہم چاہتے ہیں۔کہ بستر مرگ پر خدا کا چہرہ ہم پر منور ہو تو ہمیں ابھی اُس کے ساتھ صلح وواقفیت پیدا کرنی چاہیے۔اگر ہم مرتے ہوئے مسیح یا مرتے ہوئے اولیاء اللہ پر نظر کرکے یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں۔کہ "کاش میں بھی راستبازوں کی موت مروں اور میرا انجام بھی ویسا ہی ہو"۔تو ہمیں ابھی سے چاہیے کہ راستبازوں کی زندگی اختیار کریں۔اور انہیں کے نمونہ پر چلیں۔

۲۔

مرتے ہوئے نجات دہندہ کا آخری کلمہ پاک نوشتوں میں سے لیا گیا تھا۔

یہ پہلی مرتبہ نہ تھا کہ ہمارے خُداوند نے صلیب پر نوشتوں کی عبارت نقل کی۔"اے میرے خُدا۔اے میرے خُدا تو نے مجھے کیوں چھوڑدیا"۔کا بڑا نعرہ بھی عہدِ عتیق کے الفاظ میں تھا۔اور اُس کے دوسرے کلمات میں بھی کتبِ مقدسہ کی آیات کا اشارہ پایا جاسکتا ہے۔

اگرچہ دعا دمِ مرگ ایک طبعی امر ہے تو ویسے ہی پاک نوشتہ بھی ہے۔مختلف حالات اور مختلف ضروریات کے لئے مختلف زبانیں اور مختلف قسم کے لٹریچر خاص خاص مناسبت رکھتے ہیں۔مثلاً لاطینی قانون اور علم کی زبان ہے۔جرمن فلسفہ کی۔فرانسیسی گفتگو اور دربار کی۔انگریزی تجارت کی۔مگر زندگی کے نہایت پاک اوقات اور کاروبار کے لئے کوئی زبان بائبل سے بڑھ کر مناسب نہیں۔خاص کر موت کے متعلق ہر امر کے لئے وہ بہت ہی مناسبت رکھتی ہے۔مثلاً لوحِ قبر (قبر کا کتبہ) کے لئے کسی اور جگہ سے فقرے نقل کرنا کیسا بے موقع (غیر مناسب) معلوم ہوتا ہے۔مگر پاک نوشتوں کی آئتیں کیسی برمحل (موقع کے مطابق) ہوتی ہیں۔اور بسترِ مرگ پر بھی اور کوئی ایسے الفاظ نہیں۔جو مرنے والے کی زبان پر ایسے برمحل ہوں۔

یہ بات مفصلہ ذیل استنباط (نتیجہ) سے جو ایک شخص کے پرائیوٹ روزنامچہ (ڈائری) میں سے لئے گئے ہیں۔بخوبی روشن ہوتی ہے۔"مجھے یاد ہے کہ جب میں طالب علم تھا ایک شخص کو بسترِ مرگ تھا دیکھنے گیا وہ یونیورسٹی میں میرا رفیق (ساتھی) تھا۔مگر مجھ سے چند سال آگے تھا۔اور جب وہ کالج کی تعلیم بڑی تعریف کے ساتھ ختم کرچکا۔تو وہ کسی نوآبادی کی یونیورسٹی میں پروفیسر فلسفہ مقرر ہوگیا۔مگر چند ہی سال کے بعد اُس کی صحت بگڑ گئی اور وہ سکاٹ لینڈ کو جہاں اُس کا گھر تھا۔اپنی زندگی کے آخری دن کاٹنے کو چلا گیا۔اور ایسا اتفاق ہوا کہ میں اُسے ہواخوری کے لئے باہر لے گیا۔اگرچہ پہلے اُس کے بھاری جسم کو اُٹھا کر گاڑی میں بٹھانے کے وقت کچھ تکلیف ہوئی۔مگر وہ بڑے آرام کے ساتھ گاڑی میں تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔اور تازہ ہوا کا لطف اُٹھانے لگا۔اُس دن دو اور دوست بھی اُس کے ہمراہ تھے۔اور وہ بھی پُرانے کالج کے رفیق تھے۔جو اُس کی ملاقات کو شہر سے آئے تھے۔راستہ میں واپسی کے وقت وہ ہم سے پیچھے رہ گئے۔اور صرف میں ہی اُس کے ہمراہ تھا۔اُس وقت اُس نے اُن کے دوستانہ سلوک اور مہربانی کا ذکر شروع کردیا۔اور مجھ سے کہنے لگا کہ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ سارا دن کیا کرتے رہے ہیں"؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔وہ بولا وہ مجھے ایک کتاب پڑھ کر سناتے رہے ہیں۔مگر آہ۔میں اس سے بالکل دق آگیا۔تب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف پھیر کر بولا۔یہ ایمان کی بات اور ہر طرح سے ماننے کے لائق ہے۔کہ مسیح یسوع گنہگاروں کو

نجات دینے کے لئے دُنیا میں آیا۔ جن میں سب سے بڑا میں ہوں۔ اور پھر کہنے لگا۔ میرے لئے اب اور کوئی چیز کسی کام کی نہیں۔ میں نے خود اس امر کا تذکرہ نہیں چھیڑا تھا۔ شاید میں ایسے شخص سے جو مجھ پر اس قدر فوق (رتبہ) رکھتا تھا۔ اس قسم کی گفتگو کرنے سے خائف (بے زار) تھا۔ مگر میرے یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ مجھے اس امر سے کیسی خوشی ہوئی کہ مجھے ایسے بزرگ اور نیک دل آدمی کے دل کا بھید معلوم کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ کتاب جس کا اُس نے ذکر کیا ایک نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو اُس پایہ کی ہیں۔ مگر زندگی میں ایسے مواقع ہیں۔ اور خاص کر وہ جو موت سے پہلے ہوتے ہیں۔ جب کہ ایسی کتاب بالکل بے محل معلوم ہوتی ہے۔ اور فی الحقیقت اور کوئی کتاب اُس وقت سے ایسی مناسبت نہیں رکھتی۔ جیسی کہ وہ جس میں ابدی زندگی کی باتیں درج ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہ کلمات جنہوں نے اُس کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں اُسے سہارا دیا عہدِ عتیق کے کون سے حصّہ میں سے لئے گئے تھے۔ یہ عبارت اکتیسویں زبور میں ہے۔ دوسرا بڑا کلمہ بھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ زبور کی کتاب میں سے یعنی بائیسویں زبور میں سے لیا گیا تھا۔ بلاشبہ عہدِ عتیق کے تمام صحیفوں میں سے یہ صحیفہ نہایت ہی قیمتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کتاب مصنف کے خون سے لکھی گئی ہے۔ اس میں انسان کے گہرے سے گہرے رنج و غم اور اعلیٰ سے اعلیٰ اُمنگوں اور ولولوں کا حال ہے۔ اس میں روحانی تجربات کو نہایت صفائی اور پختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ سب اولیاء اللہ کا ہمیشہ سے دستور العمل اور ورد رہی ہے۔ اور اس کو پڑھنا اور اُس سے اُلفت رکھنا رُوحانی زندگی کی سب سے عمدہ علامات میں سے ہے۔

یسوع خوب جانتا تھا۔ کہ اُس کی زندگی کی مختلف ضروریات کے لئے کتاب مقدس کا کون سا حصّہ مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ عمر بھر بڑے شوق و محنت سے کتابِ مقدس کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ اُس کے کان بچپن سے اُس سے برابر مانوس تھے۔ عبادت خانہ میں وہ اُسے سنتا رہا تھا۔ غالباً وہ عبادت خانہ کے طومار لے کر علیحدگی میں بھی اُس کا مطالعہ کیا کرتا ہوگا۔ اس لئے جب اُس نے وعظ و نصیحت شروع کی۔ تو اُس کی زبان میں اُسی کا چسکا پایا جاتا تھا۔ اور بحث مباحثہ کے وقت بھی وہ ایسی آیت موقعہ پر نقل کر دیا کرتا تھا۔ کہ اُس کے مخالفوں کا جنہیں اپنی علمیت پر بہت گھمنڈ تھا۔ منہ بند ہو جاتا تھا۔ مگر وہ اپنے ذاتی کاموں میں بھی ہر ضرورت کے وقت اُس کا استعمال کرتا تھا۔ جب وہ بیابان میں تھا۔ تو اسی کے ذریعہ اُس نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ اور اُس پر فتح حاصل کی۔ اور اب دمِ مرگ بھی اُس نے اُس کا اچھا ساتھ دیا۔ اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کلام الٰہی کو اپنے دلوں میں چھپا رکھا ہے۔ اُن کی ہر ضرورت کے وقت وہ اُن کا مددگار ہوتا ہے۔ اگر ہم بھی چاہتے ہیں۔ کہ وہ مرتے وقت ہمارا سہارا ہو۔ تو ہمیں چاہیے کہ ہم زندگی بھر اُسے اپنا مشیر و صلاح کار بنائے رکھیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے۔ کہ یسوع نے زبور میں سے یہ آیت کس طرح نقل کی۔ اُس نے کچھ اس کے شروع میں زیادہ کیا۔ اور آخر سے کچھ گھٹا دیا۔ شروع میں اُس نے لفظ ''باپ'' بڑھا دیا۔ یہ لفظ اس زبور میں نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ عہدِ عتیق میں افراد انسانی نے ابھی تک خُدا کو اپنا باپ کہنا نہیں سیکھا تھا۔ اگرچہ خُدا کو چند مقامات میں ساری قوم کا مجموعی طور پر باپ لکھا گیا ہے۔ خُدا کے ساتھ نیا تعلق جو اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ مسیح ہی کی ایجاد ہے۔ اور اس آیت میں ایزاد (اضافہ) کرنے سے اُس نے اُس پر کچھ اور ہی رنگ چڑھا دیا۔ پر ہم بھی عہدِ عتیق کے ساتھ ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ ہم بھی عہد جدید کے معانی و مطالب کو اُس میں داخل کر سکتے ہیں۔ فی الحقیقت اسی آیت کے متعلق ہمیں اسی قسم کے سلوک کا ایک اور بڑا ثبوت ملتا ہے۔ ستفنس جو مسیحی دین کا پہلا شہید گزرا ہے۔ بہت سی باتوں میں اپنے اُستاد کی مانند تھا۔ اور اُس نے اپنی شہادت میں بھی اُسی کی نقل کی۔ چنانچہ موت کے میدان میں

اُس نے بھی اپنے دشمنوں کے لئے دُعا کی۔ اے خُداوند یہ گناہ ان کے حساب میں نہ لکھنا۔ اسی طرح اُس نے مرتے وقت یہی الفاظ نقل کئے۔ مگر ایک دوسری صورت میں ''اے خُداوند یسوع۔ میری روح کو قبول کر''۔ یعنی اُس نے آخری دُعا مسیح سے کی۔ جیسے کہ خود مسیح نے باپ سے کی تھی[1]۔

دوسری تبدیلی جو یسوع نے اس آیت میں کی۔ وہ آخری الفاظ کا اُڑ دینا تھا۔ جو یہ تھے۔ کہ کیونکہ تو نے مجھے خلاصی بخشی۔ اُس کے لئے ان الفاظ کا استعمال کرنا مناسب نہ تھا۔ مگر ہمیں ان الفاظ کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اور اگر ستفنس کی مانند ہم بھی یہ دُعا مسیح سے کریں۔ تو ہمارے لئے یہ الفاظ کیسے بیش قیمت اور رقت انگیز (رُلانے والے) ہوں گے۔ اُس شخص سے بھی بڑھ کر جس نے پہلے پہل اُنہیں قلمبند کیا تھا۔

۳۔

مرتے ہوئے نجات دہندہ نے یہ دُعا اپنی روح کی بابت کی تھی۔

اکثر اشخاص مرتے اپنے جسم کے لئے بہت فکر مند ہوا کرتے ہیں۔ یہ شاید اُن کے جسمانی دُکھ اور تکلیف کی وجہ سے ہو۔ اور ڈاکٹر کی دوائیں بھی شاید اُن کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتی ہیں۔ بعض لوگ اپنے جسم کے لئے اس قسم کی فکر بھی ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ کہ مرنے کے بعد اُس سے کیا کیا جائے۔ اور اس امر کے لے اپنی تکفین وتدفین کے لئے مفصل ہدایات کرنے لگتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ مرنے والے کا دل دمِ مرگ تک دُنیاوی کاروبار میں اُلجھا رہتا ہے۔ وہ اپنی جائیداد کے بندوبست کے متعلق ہدایات کرتے ہیں۔ اور اپنے خاندان کے لوگوں کی فکر انہیں لگی رہتی ہے۔ یسوع کے نمونہ سے ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کے معاملات کی طرف بسترِ مرگ پر توجہ کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کا پانچواں کلمہ کہ ''میں پیاسا ہوں''۔ اُس کی جسمانی ضروریات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور نیز جب وہ صلیب پر لٹک رہا تھا۔ تو اُس نے اپنی ماں کے آئندہ آرام وآسائش کا بندوبست کیا۔ مگر سب سے بڑی فکر اُسے اپنی روح کے متعلق تھی۔ اور اُس نے اپنی آخری دُعا میں اُسی کی فکر کی۔

رُوح کیا چیز ہے؟ وہ ہماری ہستی کا سب سے لطیف اور اعلیٰ اور پاک حصّہ ہے۔ عموماً روزمرّہ کی زبان میں تو ہم جان کے لفظ سے اُسے یاد کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ انسان کا ذکر کرتے ہوئے ہم کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ وہ جسم وجان سے مرکب ہے۔ مگر پاک نوشتوں کی زبان میں رُوح کو جان سے بھی تمیز کرکے اُسے باطنی انسان کا سب سے اعلیٰ اور لطیف حصّہ ظاہر کیا ہے۔ اُس کو ہماری فطرت کے باقی حصّوں سے وہی نسبت ہے۔ جو پھول کو پیڑ سے یا موتی کو سیپی سے ہے۔ وہ ہمارے باطن کی اُس چیز کا نام ہے۔ جو خصوصیت کے ساتھ خُدا اور ابدیت سے متحد اور ملی ہوئی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ یہی چیز ہے۔ جسے گناہ بگاڑنا چاہتا ہے۔ اور جسے ہمارے رُوحانی دشمن برباد کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا تعجب ہے کہ وہ آخری گھڑی میں اور بھی زیادہ کوشش دکھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کا آخری موقع ہوتا ہے۔ اور وہ بہت چاہتے ہیں۔ کہ روح کو جسم سے نکلتے ہی گرفتار کرلیں۔ اور اُسے اس کے اصلی رُتبہ سے نیچے گرا کر ذلت کی طرف لے جائیں۔ یسوع جانتا تھا کہ اب وہ ابدیت میں داخل ہونے کو ہے۔ اور اپنی رُوح کو ان دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین کر جو اس پر قابو حاصل کرنے کو آمادہ (تیار) کھڑے تھے۔ اُس نے اُسے خُدا کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ او وہاں وہ بالکل سلامت تھا۔ کیونکہ اس ابدی وازلی ذات کے ہاتھ مضبوط اور محافظ ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ ملائم اور پُر محبت بھی ہیں۔ کیسی محبت واُلفت کے ساتھ ان ہاتھوں نے یسوع کی روح کو قبول کیا ہوگا۔ خُدا ایک قدیمی نبوت

---

[1] ۔کلام اللہ کے مفسر کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دریافت کرے کہ ہر ایک آیت اور لفظ کے اس وقت جب کہ وہ لکھا گیا اصل میں کیا معنی ومراد۔۔۔ اور اس اصلی استعمال کے دریافت کرنے میں بہت فائدہ ہوگا۔ لیکن اگرچہ شارح کا کام یہاں شروع ہوتا ہے۔ مگر یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بائبل ایک ایسی کتاب ہے جو ہر زمانہ اور قوم کے واسطے ہے اور اُس پیغام کو دریافت کرنا جو وہ زمانہ حال کے لئے رکھتی ہے۔ یہ بھی شارح کا ایک ضروری فرض ہے۔ ایسے شارح بھی آج کل پائے جاتے ہیں۔ جو اپنے قاعدے کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔ اور جس کے رو سے پاک نوشتوں کا باغ محض سوکھی ہوئی نباتات کے نمونوں کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ پاک نوشتوں سے ایسا سلوک کرنا چاہیے۔ جیسے کہ ایک زمانہ کلام سے کیا جاتا ہے۔

کے صحیفہ میں پنے ایک خادم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ ''میں نے تجھے اپنے ہاتھوں کے سایہ میں ڈھانپ لیا ہے''۔اور اب یسوع اپنے سارے مرئی اور غیر مرئی (دیکھے وان دیکھے) دشمنوں سے رہائی پا کر جو اُسے گھیرے ہوئے تھے۔اس نبوت کی تکمیل اپنے حق میں ڈھونڈتا ہے۔

یہ موت کا فن ہے۔ مگر کیا یہی زندگی کا فن بھی نہیں؟ ہر ایک ابنِ آدم کی رُوح مرتے وقت طرح طرح کے خطرات سے گھری ہوتی ہے۔ مگر زندگی بھر بھی یہی خطرات اُسے گھیرے رہتے ہیں۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے کہ یہ رُوح ہمارا پھول اور ہمارا موتی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ موت کے وقت سے بہت پہلے یہ پھول کچلا جائے۔اور یہ موتی کھو بیٹھیں۔ ''جسم رُوح کے خلاف خواہش کرتا ہے''۔اور ایسے ہی دُنیا کی آزمائشیں اُس پر حملہ کرتی ہیں۔گناہ اُس ناپاک کرتا ہے۔اس لئے زندہ آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی عمدہ دُعا نہیں کہ وہ ہر صبح اُٹھ کر اپنے منجی کی یہ دُعا مانگا کرے۔وہ آدمی بڑا ہی خوش قسمت ہے جو اپنی روح کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ ''میں اُسے جانتا ہوں جس پر ایمان لایا ہوں۔اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری امانت کی اُس دن تک حفاظت کر سکتا ہے''۔

۴۔

ہمارے نجات دہندہ کے آخری کلمہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ موت کی نسبت کیا خیال رکھتا تھا۔

وہ لفظ جو یسوع نے اپنی رُوح باپ کو سونپنے میں استعمال کیا اُس سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ اپنی روح اُسے اس اُمید سے دے رہا تھا کہ وہ پھر اُسے واپس مل جائے گی۔ وہ گویا ایک محفوظ جگہ میں اپنا خزانہ جمع کر رہا تھا۔ جہاں وہ موت کے بعد جا کر اُسے پھر حاصل کرلے گا۔اس یونانی لفظ کا یہ مطلب ہے۔ جیسا کہ مقدس پولوس کے مذکورہ بالا قول سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خُدا اس امانت کو جو وہ اُس کے سپرد کرتا ہے۔ (یہاں وہ وہی یونانی لفظ استعمال کس دن تک؟ ظاہر ہے کہ وہ کوئی وقت زمانہ مستقبل میں ہے۔جب کہ وہ جا کہ خُدا سے اُس چیز کا جو اُس نے اُس کے سپرد کی ہے۔دعویدار ہو گا۔اُس وقت مسیح کی نظر میں بھی کوئی ایسی ہی گھڑی تھی۔ جب اُس نے فرمایا کہ ''اے باپ میں اپنی رُوح تیرے سپرد کرتا ہوں''۔ موت سے وہ تمام اجزاء جن سے فطرت انسانی مرکب ہے۔جُدا جُدا ہو جاتے ہیں۔ایک جز یعنی رُوح خُدا کے پاس جارہی تھی۔دوسری جز آدمیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو اُس پر اپنی ساری شرارت کا زور خرچ کر رہے تھے۔اور وہ اُس گھر کو جہاں سب نے ایک نہ ایک دن جانا ہے جار رہی تھی۔ مگر یسوع ان متفرق اجزا کے دوبارہ اکھٹے آنے کا اُمیدوار تھا۔جب کہ وہ ایک دوسرے کو پھر پائیں گے۔اور اُس کی شخصیت کا اتحاد پھر بحال ہو جائے گا۔

سب سے اہم سوال جو ایک قریبِ المرگ آدمی کو پوچھنا چاہیے اور جو ایک زندہ آدمی موت پر نظر کر کے پوچھ سکتا ہے۔یہ ہے کہ ''اگر آدمی مر جائے تو کیا وہ پھر زندہ ہو گا؟ کیا وہ سب کا سب مر جاتا ہے؟ اور کیا وہ ہمیشہ کے لئے مر جاتا ہے؟ آدمی کے دل میں اس قسم کا سخت خوف واندیشہ تو ہے کہ شاید ایسا ہی ہے۔اور ایسے معلم بھی ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔جو اس شبہ کو ہمیشہ ایک مسلمہ اور ثابت شدہ مسئلہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔وہ یہ تعلیم دیتے ہیں ۔کہ نفسِ ناطقہ فقط مادہ ایک طاقت کا نام ہے۔اور اس لئے جب جسم کے اجزا پراگندہ ہو جاتے ہیں۔تو آدمی تحلیل ہو کر مادی دُنیا میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔اور لوگ ہیں۔جو اگرچہ مادہ اور نفس ناطقہ (انسانی رُوح) کے درمیان امتیاز (فرق) کرتے ہیں۔تو بھی یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔تو نفس ناطقہ بھی بحرِ ہستی میں جا ملتا ہے۔جہاں اُس کی شخصیت زائل ہو جاتی ہے۔اور ایسا ہو جاتا ہے۔جیسا ایک قطرہ سمندر میں جا پڑتا ہے۔اور پھر ان دونوں میں کوئی ملاپ ممکن نہیں ہے۔مگر ہمارے باطن میں ایک اعلیٰ اور پاک چیز ہے۔جو اس قسم کے مسائل کو قبول کرنا گوارا نہیں کرتی۔اور بنی انسان کے بہترین معلم ہمیشہ ہمیں حوصلہ دلاتے رہے ہیں۔کہ ہم اس سے بہت کسی چیز کی اُمید کر سکتے ہیں۔ مگر جو یقین وہ ہمیں دلاتے ہیں۔اُس کی بنا کسی پختہ بات

پر نہیں رکھتے۔ اور اس لئے وہ بھی اس میں کچھ ہچکچاتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کا اپنا یقین بھی کچھ دھندلا سا ہے۔ مگر اس امر کے لئے ہم مسیح کے پاس جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ کی زندگی کی باتین اُسی کے پاس ہیں۔ وہ اس مضمون پر بغیر کسی پس وپیش کے بڑی صفائی کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ اور اُس کے آخری کلمات ثابت کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ وہ اوروں کو تعلیم دیتا تھا۔ آپ بھی اُس پر کامل یقین رکھتا تھا۔ مگر اُس نے اپنی تعلیم سے فقط حیات اور ابدیت کو ہی آشکارا (ظاہر) نہیں کیا۔ بلکہ وہ خود اپنی ذات میں اس مسئلہ کی صداقت کا ثبوت ودلیل ہے۔ کیونکہ وہ خود ہماری غیر فانی زندگی ہے۔ چونکہ ہم اُس کے ساتھ متحد ہیں۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہم ہر گز ہلاک وفنا نہ ہوں گے۔ کوئی چیز بلکہ موت بھی ہمیں اُس کی محبت سے جُدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اُس نے فرمایا ہے۔ کہ "چونکہ میں جیتا ہوں۔ تم بھی جیو گے"۔

مگر ہو سکتا ہے۔ کہ اس کلمہ کے مطالعہ کرنے میں ہم نے لفظی طور پر مرنے کے فن کو سیکھ لیا ہے۔ کاش کہ ہمارے آخری الفاظ بھی یہی ہوں۔ بہت سے لوگوں کے یہی آخری الفاظ تھے۔ جب جان ہس کو قتل گاہ کی طرف لے جارہے تھے۔ تو اُس کے سر پر ایک کاغذ لگا تھا۔ جس پر شیطانوں کی تصادیر کھینچی ہوئی تھیں۔ گویا کہ اُس کے دشمنوں نے اپنے زعم (خیال) میں اُس کی رُوح کو انہیں کے سپرد کیا تھا۔ مگر وہ بار بار چلاتا تھا "اے باپ میں تیرے ہاتھوں میں اپنی رُوح کو سونپتا ہوں"۔ پو لیکارپ اور جیروم۔ لوتھر اور میلانکتھن اور اور بہت سے اصحاب کے آخری الفاظ یہ تھے۔ اپنی رُوح کے لئے خُدا کے حضور جانے کو اس سے بہتر سواری کون ڈھونڈ سکتا ہے؟ لیکن خواہ ہم موت کے وقت اس دُعا کا استعمال کر سکیں یا نہیں۔ مگر ہمیں چاہیے کہ بڑی کوشش کے ساتھ زندگی بھر اُس کا استعمال کرنے سے باز نہ رہیں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی اس کتاب کو بند کرنے سے پہلے یہی دُعا کریں گے۔ کہ اے باپ میں اپنی رُوح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں"۔

یہ پردہ پانچ ہاتھ لمبا اور سولہ ہاتھ چوڑا تھا۔ اور بابل کی ساخت تھا۔ اس میں نیلگوں سفید۔ سُرخ اور ارغوانی رنگ عجیب طور سے آمیز (ملانا) کئے گئے تھے۔ جو عالم کے چار عنصروں کا نشان تھے۔ یعنی سرخ رنگ آگ کا۔ نیلگوں رنگ ہوا کا۔ سفید کتان زمین کا۔ اس لئے وہ کہ وہ زمین کی پیداوار ہے۔ اور ارغوان سمندر کا۔ اس لئے کہ وہ سمندر کی ایک قسم کی مچھلی سے نکلتا ہے۔

یہ بات کہ یہ پردہ اوپر سے نیچے تک پھاڑا گیا ہے۔ ظاہر کرتی ہے۔ کہ یہ خُدا کی اُنگلی سے پھاڑا گیا۔ لیکن یہ بات کہ آیا اُس میں کسی ظاہری وسیلہ کو بھی دخل تھا یا نہیں۔ ہم اس کی نسبت کچھ نہیں کر سکتے۔ بعض کا خیال ہے کہ بھونچال جو اُس وقت واقع ہوا۔ وہ اس کا وسیلہ تھا۔ اس طور سے کہ اُس سے اُوپر کا شہتیر ہل گیا۔ یا اور کوئی اسی قسم کی بات واقع ہوئی۔ جس سے پردہ پھٹ گیا۔

تاریخ میں ایسے عظیم واقعات کے موقعوں پر جب کہ لوگوں کے دلوں میں عجیب قسم کا اضطراب وتشویش (بے چینی اور فکر مندی) پیدا ہو رہی ہوتی ہے۔ ذرا ذرا اسی باتیں بھی پُر معنی سمجھی جانی لگتی ہیں۔ ایسے حادثات افرادِ انسانی کی زندگیوں کے عجیب وغریب انقلابات کے موقعوں پر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کا مدار اور اثر زیادہ تر اُن جذبات پر موقوف ہوتا ہے۔ جو اُس وقت دیکھنے والے کے دل پر مسلط ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بعض لوگوں کو تو یہ پردے کا پھٹ جانا ایک معمولی سی بات معلوم ہوئی ہوگی۔ مگر دوسروں کے دلوں میں اس سے سینکڑوں طرح کے خیالات پیدا ہوگئے۔ مگر ہمارے نزدیک بلاشبہ یہ واقعہ ایک اعلیٰ رُتبہ رکھتا ہے۔ اور الٰہی ہاتھوں کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ بادل اور آگ کے ستون کی طرف جو بیابان میں بنی اسرائیل کے ہمراہ رہتا تھا۔ اس کے بھی دو پہلو تھے۔ ایک عدالت کا۔ دوسرا رحمت کا۔ یہ اس امر کا نشان تھا۔ کہ یہ ہیکل ناپاک ہوگئی۔ اور الٰہی حضوری اُس میں سے نکل گئی ہے۔ اور اُس کا محل (موقع) اور فائدہ اب بالکل جاتا رہا۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ اُس وقت نہ صرف عیسائیوں ہی کے دل اس قسم کے خیالات سے بھرے ہوئے تھے۔ بلکہ یہودیوں کے بھی۔ یوسیفس یہودیوں کی ایک روایت بیان کرتا ہے۔ جس کی طرف رُومی مورخ ٹاکیٹس بھی

اشارہ کرتا ہے۔ کہ اس واقعہ سے چند سال بعد عیدِ فسح کے موقع پر ہیکل کے اندرونی صحن کا مشرقی دروازہ جو ایسا بھاری تھا کہ اُس کے کھولنے کے لئے بیس آدمی درکار ہوتے تھے۔ اور علاوہ بریں اُس وقت مقفل (تالا لگا ہوا) ہو رہا تھا۔ دفعتاً (اچانک) آدھی رات کے وقت کھل گیا۔ اور اُس کے بعد کی عید پنتیکوست کے موقع پر کاہن نے جس کا کام رات کے وقت صحن کی خبرداری کرنا تھا۔ پہلے تو ایک شور سُنا۔ جیسے کہ پاؤں کی آہٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر ایک بلند آواز سنائی دی۔ گویا کہ بہت سی آوازیں کہہ رہی ہیں۔ کہ آؤ۔ یہاں سے چل دیں"۔ لیکن فقط فلسطین ہی میں یہ خیال جاگزین نہ تھا۔ کہ تاریخ میں ایک انقلاب واقع ہونے والا ہے۔ اور قدیم دُنیا کا خاتمہ ہو چلا ہے۔ بلکہ پلوطارک بھی ایک روایت بیان کرتا ہے۔ جو اُس نے ایک شخص سے سُنی تھی۔ کہ دفعہ ایک شخص کسی جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ جو ہوا تھم جانے کے سبب ایک ٹاپو کے پاس ٹھہر گیا۔ جب وہ وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ تو اچانک ساحل پر سے ایک بلند اور صاف آواز سنائی دی۔ جو جہاز کے ناخُدا (ملاح) کا نام لے کر پکار رہی تھی۔ دوبارہ تو وہ خاموش رہا۔ مگر جب تیسری دفعہ وہی آواز آئی۔ تو اس نے جواب دیا۔ اس پر وہ اور بھی بلند آواز کہنے لگی۔ کہ جب تم گھر کو جاؤ تو کہہ دو کہ پان (PAN) مر گئی۔ پان قدیم علم الاصنام میں نیچر یعنی فطرت کے دیوتا کا نام تھا۔ اس لئے جس کسی نے یہ آواز سُنی۔ نہایت خوف زدہ ہو گیا۔ اور انہوں نے آپس میں مشورہ کرنا شروع کیا کہ آیا اس حکم کی اطاعت کی جائے یا نہیں۔ آخر کار یہ قرار پایا کہ اگر واپسی کے وقت طوفانی ہوا چلتی ہو۔ تو اس حکم کی اطاعت نہ کی جائے۔ اور اگر ہوا تھمی ہوئی ہو۔ تو کی جائے ایسا اتفاق ہوا کہ جب وہ وہاں پہنچے تو ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ اور اس لئے ناخُدا نے جہاز کے پتوار پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے وہی الفاظ کہے۔ جس پر نہ صرف اُس کی آواز کی گونج اُٹھی۔ بلکہ ہوا بہت سے لوگوں کی چیخوں اور رونے چلانے سے بھر گئی۔ یہ ناخُدا قیصر طبریاس کے حضور میں طلب کیا گیا تھا۔ جس نے بڑی احتیاط سے اس واقعہ کی صحت (درستی) کی تحقیقات کی۔

اس واقعہ کے تاریک پہلو سے تو اس پردہ کے پھٹنے سے یہ مطلب تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ دیوتاؤں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یروشلیم اب آئندہ کو بیت القدس نہیں رہا۔ جہاں لوگ عبادت کو جایا کریں۔ مگر ساتھ ہی اس کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ اور اسی پہلو کی وجہ سے یسوع کے رفیقوں (ساتھیوں) نے اس واقعہ کو اپنے دلوں میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا۔ جیسا کہ مقدس پولوس لکھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تھا۔ کہ وہ دیوار جو یہودیوں اور غیر قوموں کے درمیان حائل تھی۔ اب شکستہ ہو گئی۔ اور جیسا کہ عبرانیوں کے نام کے خط میں مفصل طور پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ مراد تھی۔ کہ اب رسم و دستور اور درمیانیوں کا سلسلہ جس کے مطابق عہدِ عتیق کے رُو سے خُدا پرست خُدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر پھر بھی اُس سے فاصلہ پر رہتے تھے۔ بیچ میں سے اُٹھا دیا گیا۔ خُدا کا دل اب سب پر آشکارا (ظاہر) ہو گیا۔ اور یہ دل محبت سے معمور ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسان کا دل مسیح کی قربانی کے وسیلہ گناہ آلود ضمیر سے رہائی پا کر جو وہ بیلوں اور بکروں کی قربانی سے کبھی حاصل نہ کر سکتا اب خوش و خرم خُدا کے حضور میں حاضر ہو سکتا اور ایک فرزند کی آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ وہاں آ جا سکتا ہے "پس اے بھائیو! چونکہ ہمیں یسوع کے خون کے سبب اُس نئی اور زندہ راہ سے پاک مکان میں داخل ہونے کی دلیری ہے۔ جو اُس نے پردے یعنی اپنے جسم کو پھاڑ کر ہمارے واسطے مخصوص کی ہے۔ اور چونکہ ہمارا ایسا بڑا کاہن ہے۔ جو خُدا کے گھر کا مختار ہے۔ تو آؤ۔ ہم سچے دل اور پورے ایمان کے ساتھ۔۔۔ خُدا کے پاس چلیں"۔ عبرانیوں ۱۰: ۱۹، ۲۲)۔

۲۔

دوسری علامت بعض مردوں کی قیامت تھی۔ ''اور قبریں کھل گیں۔اور بہت سے جسم اُن مقدسوں کے جو سوگے تھے۔جی اُٹھے اور اُس کے جی اُٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر مقدس شہر میں گئے اور بہتوں کو دکھائی دیئے''۔

خواہ ہیکل کے پردہ کا پھٹنا بھونچال کے باعث ہو یا نہ ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ دوسرا نشان ضرور اُس سے تعلق رکھتا تھا۔ فلسطین میں قبریں پہاڑوں کی غاروں میں ہوتی تھیں۔ جن کے منہ پر بڑے بڑے پتھر اپنی جگہ سے ہل گئے ہوں گے۔ اور اجسام جو یا تو تختوں پر دھرے تھے۔ یا طاقوں یا محرابوں میں کھڑے کئے ہوئے تھے۔اس سبب سے ہل جُل گئے ہوں گے۔ مگر بعض میں اور بھی ہل جُل واقع ہوئی۔یعنی علاوہ بیرونی جنبش کے اُن کے اندر بھی خُدا کے زندگی بخش دم نے حرکت پیدا کردی ہوگی۔

بہت سے دیندار علماء کے دل میں مختلف وجوہات سے اس معجزہ نے طرح طرح کے شکوک پیدا کردیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پاک نوشتوں کے دوسرے بیانات کے خلاف ہے۔ جن کے مطابق مسیح اُن کا جو سوتے ہیں۔ پہلا پھل تھا۔اگر یہ مردہ اجسام اس بھونچال کے موقع پر پھر زندہ ہوگئے۔ تو وہ نہیں۔ بلکہ یہ پہلے پھل ٹھہرے۔اس کا یہ جواب ہے کہ مقدس متی نے اس بارہ میں احتیاط کی ہے۔ کیونکہ وہ لکھتا ہے۔ کہ وہ اپنی اپنی قبروں میں سے ''اُس کے جی اُٹھنے کے بعد'' نکلے۔

اس لئے مقدس متی اس امر میں بھی مقدس پولوس کے ساتھ متفق ہے۔اور مسیح ہی کو سب سے پہلے جی اُٹھنے والا ٹھہراتا ہے۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ زندگی حاصل کرنے اور جی اُٹھنے کے درمیانی عرصہ میں اُن کی کیا حالت تھی؟ انجیل نویس کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بھونچال کے وقت زندہ ہوگئے۔ مگر اس کے بعد تیسرے دن تک قبر سے نہ نکلے۔ جب تک کہ مسیح نہ جی اُٹھا کیا یہ بات قابل یقین ہے؟ یا کیا یہ بھی کوئی ایسی ہی روایت ہے۔ جیسی غیر مستند اناجیل میں پائی جاتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طرح انجیل متی میں گُھس آئی ہے؟ دوسرے انجیل نویس جب کہ مقدس متی کے ساتھ پردہ کے پھٹنے کے معاملہ میں اتفاق کرتے ہیں۔اس امر کا کچھ بھی ذکر نہیں کرتے۔اور پھر اُن کی رائے میں اس سارے بیان میں اُس احتیاط اور متانت (سنجیدگی) کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ جو مسلمہ اناجیل کے تصدیق شدہ معجزات میں پائی جاتی ہیں۔اور نیز وہ زمانہ بعد کے کلیسیاء کے مشہور معجزوں سے مشابہ ہے۔ جو اکثر محض بچوں کا کھیل معلوم دیا کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم سے قدیم نسخے جو مقدس متی کی انجیل کے پائے جاتے ہیں۔اُن میں سے کسی سے بھی یہ نہیں پایا جاتا کہ یہ فقرات بعد میں کسی شخص نے ایزاد (اضافہ) کردیئے ہیں۔اور بہت سے باریک بین اُن کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ فقرات درحقیقت اس کتاب ہی کا جزاور اپنی جگہ میں بالکل برمحل (مناسب) معلوم ہوتے ہیں۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ شخص جس نے اُس وقت صلیب پر جان دی۔ فی الحقیقت وہی تھا۔ جو وہ اپنی نسبت دعویٰ کرتا تھا۔اور ہم یقین کرتے ہیں کہ وہ وہی تھا۔ تو ضرور ہے کہ اُس کی موت سے مردوں کی سرزمین میں بھی بہت کچھ تحریک اور ہل چل پیدا ہو۔ دُنیا کے زندہ مرد وعورت اُس واقعہ کی حقیقت سے جو اُن کی آنکھوں کے سامنے واقع ہورہا تھا۔ محض بے خبر معلوم ہوتے تھے۔ مگر غیر مرئی دُنیا میں اس سے اس قدر تہلکہ مچ گیا کہ نہ ایسا پہلے کبھی ہوا ہوگا۔ نہ پھر کبھی ہوگا۔ یہ کوئی غیر طبعی بات نہ تھی۔ بلکہ عین طبعی امر معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض مردگان اس جوش اور شوق کی حالت میں اُس عالم کی حدود کو توڑ کر اس دُنیا میں آجائیں۔ تاکہ وہ بھی وہیں رہیں جہاں مسیح تھا۔اور یہ سوال کہ زندہ ہونے۔اور باہر نکل آنے کے درمیانی عرصہ میں وہ کیا کرتے رہے۔ ایک ایسی ہلکی سی بات ہے کہ بہت غور وفکر کے لائق نہیں

ہے۔ بہر صورت وہ اپنے خُداوند کے بعد جی اُٹھے۔ اور کیا یہ ایک مناسب امر نہ تھا۔ کہ چالیس دن کے بعد جب وہ فرشتوں اور مقرب فرشتوں کے نعرہ ہائے خوشی کے درمیان آسمان پر چڑھ گیا۔ تو نہ صرف وہ خود ہی جسم میں ظاہر ہو۔ بلکہ اُس کے ساتھ ایسے نمونہ بھی پائے جائیں۔ جو اس امر کا ثبوت ہوں۔ کہ اُس کی قیامت کا نتیجہ آخر کار اُس کے مومنین کے حق میں کیا کچھ ہو گا۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ مبارک مقدسین کون تھے۔ جن کو یہ فوقیت اور امتیاز بخشا گیا۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے۔ کہ ہمیں معلوم نہیں۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن لوگوں کی خاک جنہیں خُداوند اس قسم کی عزت بخشنے خوش ہوتا۔ وہاں سے بہت دُور نہ تھی۔ مثلاً بزرگان مثل ابراہیم کے۔ شاہان (بادشاہ) مانند داؤد کے۔ انبیاء مثل یسعیاہ کے۔

مگر اس نشان کی حقیقی مراد اس قسم کے خیالات پر منحصر نہیں ہے۔ اگر کبھی یہ دریافت بھی ہو جائے کہ یہ فقرات مقدس متی کی انجیل میں بعد ازآں بڑھائے گئے ہیں۔ اور ہم کو یہ ماننا پڑ کہ یہ ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں کی قوت واہمہ (سوچنے کی قوت) ہے۔ تو بھی ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہو گا۔ کہ ان لوگوں نے ایک ایسی بات کیوں ایجاد کی۔ اور اس کا جواب صرف یہی ہو گا۔ کہ اس کا باعث وہ مضبوط یقین تھا۔ جو اُن کے دل میں شعلہ زن تھا کہ مسیح کی موت اور قیامت نے موت کے دروازے تمام مقدسین کے لئے کھول دیئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ اور جلالی ایمان تھا جو اُن ناقابل فراموش دنوں کے تجربوں نے ایمانداروں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔ خواہ اس ایمان کے پیدا کرنے میں ان جی اُٹھے مقدسوں کے نظارہ نے حصّہ لیا ہو یا نہ لیا ہو۔ اور یہی اس وقت بھی کلیسیاء اور تمام ایمانداروں کا ایمان ہے۔

اگر اس واقعہ کو بھی ایک دوسرے پردے کا پھٹنا کہیں تو بالکل بجا ہو گا۔ دُنیا میں خُدا کے چہرہ پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ تو ویسے ہی ابدیت کا چہرہ بھی ایک پردہ سے ڈھنپ رہا تھا۔ اُن کے خیالات وعقائد اس کی نسبت بالکل دھندلے سے تھے۔ وہ بالکل اس امر کا یقین نہیں کر سکتے تھے کہ ہم محض مٹی کے ہیں۔ مگر مسیح سے الگ ہو کر سب سے بڑے داناؤں کے خیالات بھی دوسرے جہان کے متعلق کسی طرح سے صحیح یا یقینی کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔ اور نہ اُن کو اس سے بڑھ کر کچھ حیثیت حاصل ہے۔ جیسے دو بچے اپنی ماں کے پیٹ میں اس دُنیا کے حالات کے متعلق بحث کریں۔ بر خلاف اس کے مسیح اس غیر مرئی (ان دیکھی) دُنیا کا ذکر ہمیشہ ایسی آزادی اور یقین کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ کہ گویا وہ وہاں کا رہنے والا ہے۔ اور اُس کے ذرہ ذرہ سے واقف ہے۔ اور اُس کی قیامت اور آسمان پر چلا جانا اُس عالم غیر فانی کا نہایت صحیح اور یقینی نظارہ ہے۔ جو مشکل سے کبھی اس دُنیا کو حاصل ہوا ہو گا۔

البتہ اس نشان میں اُس کی صحت (درستی) کا تعلق اُس کی موت کے ساتھ ہے۔ نہ اُس کی قیامت کے ساتھ۔ مگر مسیح کی قیامت اُس کی موت کے ساتھ نہایت ہی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ عام طور پر گویا اُس کی راستبازی کا اعلان تھا۔ اس لئے چونکہ وہ فقط اپنے ہی لئے نہیں مرا بلکہ ایک پبلک یعنی عہدہ دار آدمی کی حیثیت سے۔ اُس کا سارا جسم (یعنی کلیسیاء) قیامت کا ویسا ہی حق دار ہے۔ اور وقت مقررہ پر یہ ظاہر ہو جائے گا۔ کہ چونکہ اُس نے اُن کی جانب سے ہر ایک دعویٰ پورا کر دیا ہے اس لئے موت کو اُن کے روک رکھنے پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

۳۔

پہلا نشان اس مادی یا طبعی دُنیا میں واقع ہوا۔ دوسرا مردوں کے پاتال میں۔ مگر تیسرا نشان عام انسانی دُنیا میں واقع ہوا۔ اور یہ اُس صوبہ دار کے منہ سے جو اُس کے صلیب دینے پر مامور تھا۔ مسیح کا اقرار تھا۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس نشان کا تعلق بھی کسی قدر بھونچال سے تھا یا نہیں۔ غالباً یہ بھی بھونچال کے سبب سے ہوا۔ بھونچال سے جو حالت پیدا ہوتی ہے۔ غالباً دُنیا کی کسی اور چیز سے نہ ہوتی ہو گی۔ اور ایک معمولی سیدھے سادے آدمی پر جو اثر اُس کا پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ یہ

سمجھنے لگتا ہے کہ خُدا قریب ہے۔اس لئے ظن غالب (یقینی) ہے کہ صوبہ دار نے اس بھونچال کو گویا اپنے خیالات کے لئے جو اُس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ایک قسم کی تائید ایزدی (خُدا کی حمایت) سمجھا۔اور اُس نے فی الفور سب کے سامنے اُس کا اقرار بھی کر دیا۔

تاہم اس کا یہ اقرار اُن باتوں کا نتیجہ تھا۔جو وہ مسیح کے چال چلن میں عدالت میں پیش ہونے کے وقت سے لے کر آخری دم تک دیکھتا رہا تھا۔ اور اس سے ہمارے خُداوند کے بے چال چلن کی خوبصورتی پر ایک نہایت عمدہ شہادت ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مسیح کی گرفتاری سے لے کر آخری دم تک اُس کے ساتھ رہا ہو۔ان لاثانی گھڑیوں میں اُس نے اُس کے دشمنوں کے غضب اور بے انصافی کو ملاحظہ کیا ہو گا۔اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اُن کے مقابلہ میں وہ کیسا صابر۔ بُردبار۔ حلیم۔اور عالی حوصلہ تھا۔اُس نے اُسے اپنے صلیب دینے والوں کے حق میں دُعا کرتے۔چور کو تسلی دیتے۔اپنی ماں کے گزارہ کا بندوبست کرتے۔اور خُدا کی طرف لو لگاتے سُنا ہو گا۔اس سے اُس کے دل میں اُس کی طرف زیادہ زیادہ کشش پیدا ہوتی گئی ہو گی۔اور اُس کا دل اُس پر فریفتہ (عاشق) ہوتا گیا ہو گا۔یہاں تک کہ وہ صلیب کے رُوبرُو کھڑے ہو کر بڑے غور سے اُس کی تمام باتوں کو سنتا اور حرکات کو نگاہ رکھتا ہو گا۔اور جب اُس کی آخری دُعا اُس کے منہ سے نکلی بھونچال نے گویا اُس کا جواب دیا۔تو اُس کا یقین پھوٹ نکلا۔اور وہ اپنی شہادت کو ہر گز روک نہ سکا۔

مقدس لوقا اُس کی زبانی صرف یہ الفاظ لکھتا ہے کہ "یہ ایک راستباز آدمی تھا"۔ مگر دوسرے انجیل نویس لکھتے ہیں کہ "یہ خُدا کا بیٹا تھا"۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔کہ مقدس لوقا کے بیان میں دوسروں کا بیان بھی شامل ہے کیونکہ اگر صوبہ دار کے قول کا یہ مطلب تھا کہ یسوع کا دعویٰ حق تھا۔تو بتایئے اُس کے دعویٰ کیا تھے؟ پیلاطس کی عدالت کے سامنے اُس نے یہ بیان سُنا تھا کہ یسوع ابن اللہ ہونے کا دعویدار تھا۔اور شاید اُس نے پیلاطس کے سامنے اُس کے سوال کے جواب میں خود مسیح کو بھی اس امر کا دعویٰ کرتے ہوئے سنا ہو۔اور وہ برابر سنتا رہا تھا۔کہ جو لوگ صلیب کے پاس کھڑے تھے۔وہ برابر یہ نام اور نام لے لے کر اُسے بُرا بھلا کہتے تھے۔

لیکن جب اُس نے اس قسم کا اقرار کیا۔تو اُس کا مطلب اس اقرار سے کیا تھا؟ یہ خیال کیا جاتا ہے۔ہے کہ جو کچھ اُس کی مراد ان الفاظ سے بحیثیت ایک بُت پرست ہونے کے ہو سکتی ہے۔سو یہ ہو گی۔کہ یسوع بھی کسی خُدا یا دیوتا کا بیٹا ہے۔انہیں معنوں میں جن میں رومی اور یونانی مرگ ہرکولیز۔ کاسٹر اور اور ایسے ایسے بہادروں کو دیوتاؤں کے بیٹے سمجھا کرتے تھے۔یہ بات قرین عقل (وہ بات جسے عقل قبول کرے) معلوم ہوتی ہے۔مگر اُس کی رُوح میں تحریک پیدا ہو گئی تھی۔ اور اُس کا ذہن کُھل گیا تھا۔ اور جب کہ ایک دفعہ اُس کا دل اس راستہ پر چل نکلا۔ تو اُس کا بعد ازاں مسیح کی معرفت (پہچان) میں ترقی کرنا آسان تھا۔ایک روایت کے روسے اُس کا نام لونگینئیس بیان کیا جاتا ہے۔اور کہ وہ بعد ازاں کپدوقیہ کا بشپ ہو گیا۔اور مسیح کے نام پر شہید ہوا۔

کیا یہاں ہم تیسرے پردہ کا پھٹنا نہیں دیکھتے؟ خُدا کے چہرہ پر ایک پردہ پڑا ہے۔جو دُور کیا جانا چاہیے۔ابدیت کے چہرہ پر پڑا ہے جو دُور کیا جانا چاہیے۔ مگر سب سے زیادہ مہلک اور خوفناک وہ پردہ ہے جو آدمی کے دل پر پڑا ہے۔اور جو اُسے مسیح کا جلال دیکھنے سے روکتا ہے۔یہ پردہ اُس دن قریباً اُس ساری گروہ کے دلوں پر تھا۔جو صلیب کے گرد جمع تھی۔یہ اُن بے چارے سپاہیوں کے چہروں پر تھا۔جو مرنے والے نجات دہندہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ان کا پردہ بے پروائی کا پردہ تھا۔اُن مذہبی لوگوں اور عوام الناس پر بھی پردہ پڑا تھا۔ مگر یہ تعصب کا پردہ تھا۔اور ایک عظیم الشان نظارہ جس سے بڑھ کر دُنیا کو کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔مگر اُن کی آنکھیں بالکل اندھی تھیں۔

اب انسان کی زندگی بھر اُس کے گہوارے (پنگوڑے) سے لے کر قبر تک جو سب سے بڑا نظارہ اُس کو نصیب ہو سکتا ہے۔سو مسیح کے جلال کا نظارہ ہے اور یہ اب بھی ہم سے ایسا ہی قریب ہے۔جیسا کلوری کے مجمع کے قریب تھا۔بعض اُسے دیکھتے ہیں۔کیونکہ اُن کے چہرہ پر سے پردہ پھٹ گیا ہے۔

اور وہ اس نظارہ کے سبب محو حیرت ہو کر کچھ اور کے اور ہی بن گئے ہیں۔ مگر اور ہیں جو اس سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ایک آدمی یسوع سے بالکل قریب ہو۔ اُس کے معاملہ میں شریک ہو۔ اُس کی زندگی اور تعلیم سے بھی خوب واقف ہو۔ مگر تو بھی اُس کے جاہ جلال کو جو اس کو منجی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔ ذاتی طور پر دیکھنا نصیب نہ ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی قدرت کے ایک نہایت ہی عالی شان اور خوب صورت منظر میں اپنی زندگی بسر کر دے۔ مگر اُس کے حُسن وخوبی کی اُسے خبر تک بھی نہ ہو۔ مگر وہاں ایک شاعر یا مصور کہیں سے آنکلتا ہے۔ اور وہ اس حسن کی شراب کے جام پر جام لنڈھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس سے سر مست ہو کر اُس کی ایسی عمدہ تصویر کھینچتا ہے۔ جو ایک گیت کی طرح ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں کو لُبھاتی رہتی ہے۔ اسی طرح سے ہم میں سے بعض کو ایسا وقت یاد ہو گا۔ جب کہ ایک معنی میں تو وہ یسوع سے خوب واقف تھے۔ مگر اس سے بڑھکر وہ اُن کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن ایک موقع پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ایک پردہ پھٹ گیا ہے۔ اور ایک عجیب تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اور اُس وقت سے وہ جدھر دیکھتے ہیں۔ اُدھر ہی انہیں نظر آتا ہے۔ وہ ستاروں اور پھولوں پر بھی اُسی کا نام لکھا پاتے ہیں۔ جب صبح کو اُٹھتے ہیں تو اُسی کے خیال میں اُٹھتے ہیں۔ اور جب سوتے ہیں۔ تو اُسی کے خیال میں سوتے ہیں۔ گھر میں بھی وہی ہے۔ اور باہر بھی وہی۔ اور وہی اُن کا سب میں سب کچھ ہے۔

اس پردہ کا پھٹنا سب سے بڑا اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ جب یہ واقعہ ہوتا ہے۔ تو دوسری بات باتیں خود بخود اس کے پیچھے پیچھے آجاتی ہیں۔ جب مسیح کے جلال پر نظر کرنے کے لئے ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تو ہم بہت جلد باپ کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اور ابدیت کے چہرہ پر سے تاریکی اُٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ ابدیت ہمارے لئے ہمیشہ خُداوند کے ساتھ رہنے کا نام ہے۔

بائیسواں باب

مُردہ مسیح

عموماً موت کے بعد لاشیں فی الفور صلیب پر سے اُتاری نہیں جاتی تھیں۔ وہ وہیں صلیب پر لٹکتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ سڑ گل کر اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جاتی تھیں۔ یا پرندے اور جنگلی جانور انہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ اور آخر کار شاید صلیب کے نیچے لکڑیاں رکھ کر آگ لگا دی جاتی تھی۔ جس سے سب کچھ جل کر خاک ہو جاتا تھا۔ یہ تو رومیوں کا دستور تھا۔ مگر یہودی اس امر میں بہت محتاط تھے۔ اُن کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ " اگر کسی نے کچھ ایسا گناہ کیا ہو۔ جس سے اُس کا قتل واجب ہو۔ اور وہ مارا جائے۔ اور تو اُسے درخت میں لٹکاوے تو اُس کی لاش رات بھر درخت پر لٹکی نہ رہے۔ بلکہ تو اُسی دن اُسے گاڑ دے۔ (کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خُدا کا ملعون ہے)۔ اس لئے چاہیے کہ تیری زمین جس کا وراث خُداوند تیرا خُدا تجھ کو کرتا ہے۔ ناپاک نہ کی جائے۔ (استثنا ۲۱: ۲۲، ۲۳) ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہودی ہمیشہ جب کبھی اُن کے رومی حاکم اس قسم کی سزا دیتے تھے۔ تو وہ شریعت کے اس حکم کی تعمیل کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر یہ طبعی بات تھی۔ کہ وہ ایسی صورتوں میں جب کہ قتل مقدس شہر کے قریب واقع ہو۔ یا عیدِ فسح کے موقع پر ہو تو وہ اس کی تعمیل کرانے کی کوشش کریں۔ موجودہ صورت میں ایک اور وجہ بھی تھی۔ کیونکہ دُوسرا دن ایک ایک بڑا سبت تھا۔ یعنی عید فسح کا سبت تھا۔ جسے ایک طرح سے دوہرا سبت کہنا چاہیے۔ جس کی اس قسم کی ناپاک چیزوں سے۔ مثلاً لاش بے کفن ودفن پڑے رہنے سے ناپاکی اور بے حرمتی ہوتی۔ یہودی ان باتوں کے لئے بڑے غیرت مند تھے۔ اگر وہ کبھی کسی میت کو چھو بیٹھتے۔ تو اپنے کو ناپاک سمجھتے تھے۔ اور اس کے لئے انہیں

بہت کچھ لمبی چوڑی طہارت (پاکیزگی) کرنی پڑتی تھی۔تب کہیں جا کر وہ اس ناپاکی سے پاک ہوتے تھے۔لیکن ایک فسح کے سبت کے موقع پر اگر کوئی مردہ چیز اُن کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔یا اُن کے شہر کی زمین پر کھلی پڑی رہتی۔تو وہ اسے اور بھی زیادہ سخت ناپاکی سمجھتے تھے۔اس لئے اُن کے پیشواؤں نے رومی حاکم کے پاس جا کر یہ التجا کی کہ تینوں مصلوبوں کو لاٹھیوں سے ہلاک کر دیا جائے اور سبت کے شروع ہونے سے پہلے اُن کی لاشیں گاڑ دی جائیں۔

بعض کا خیال ہے۔کہ اس ظاہری پاکیزگی کے خیال کے پس پشت اُن کی اصلی خواہش یہ تھی۔کہ اس طور سے یسوع کو اور بھی دُکھ دیں اور اُس کی بے حرمتی کرائیں۔جسم کی ہڈیوں کا توڑنا اور انہیں لاٹھیوں سے چکنا چُور کر دینا ایک نہایت خوفناک قسم کی سزا تھی اور رومی بعض اوقات اُسے عمل میں لایا کرتے تھے۔وہ قریباً ایسے ہی بے رحمانہ اور بے حرمت کرنے والی بھی سمجھی جاتی تھی۔جیسے صلیب۔مگر یہ بجائے خود ایک علیحدہ قسم کی سزا تھی۔جو صلیب کے ساتھ شامل نہیں کی جاتی تھی۔لیکن یہودیوں نے اس صورت میں دونوں سزاؤں کو یکجا کرنے کی کوشش کی تاکہ یسوع علاوہ صلیب دیئے جانے کے گویا اس طور سے بھی ایک دوسری موت مرے۔تاہم انجیل نویس کہیں اُن کی اس قسم کی منشاء کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔بلکہ صاف یہی لکھتا ہے۔کہ اُن کے غرض اس سے سبت کو بے حرمتی سے بچانا تھی۔اور اگرچہ اُن کی عداوت سے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ انہوں نے محض کینہ کی رو سے اُس کو جلد مار ڈالنے کے لئے ہڈی توڑنے کی صلاح دی ہو۔تو بھی اس امر سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس بارہ میں اُن کا مذہبی پاکیزگی کا خیال محض بناوٹی نہ تھا یہ ایک بڑی عجیب مثال اس امر کی ہے کہ کس طرح آدمی کا ضمیر اُسے دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ان لوگوں کو دیکھو جو ابھی ایک نہایت خوفناک جرم کے مرتکب ہو چکے تھے۔اور اُن کے ہاتھ ابھی ایک بے گناہ کے خون سے تر ہو رہے تھے۔اور اُن کے ضمیر پر اس کا تو کچھ اثر نہ ہوا۔مگر وہ اس امر کے لئے اس قدر فکر مند ہیں۔کہ وہ سبت کو لائق طور پر منا سکیں۔اور اُن کی زمین رسمی ناپاکی سے محفوظ رہے۔یہ ایک بہت بڑی مثال اس امر کی ہے کہ انسان دین کی ظاہری باتوں کے لئے تو ایسا غیرت مند ہو۔مگر دین کی رُوح و حقیقت کی اُس میں بو بھی پائی نہ جائے۔

اس سے ہمیں ایک عبرت حاصل کرنی چاہیے۔اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جب ہم مذہب کے متعلق کسی بیرونی رسم و دستور کو ادا کر رہے ہوں۔تو اُس کے ساتھ ہی ہمارا دل بھی خُدا کی طرف لگا ہو۔اور نیز یہ سبق بھی حاصل کریں کہ اگر ہم اپنے بھائی کو جسے ہم نے دیکھا ہے۔محبت نہیں کرتے۔تو خُدا سے بھی جسے ہم نے نہیں دیکھا۔محبت نہیں کر سکیں گے۔

پیلاطس نے یہودیوں کی درخواست منظور کر لی۔اور اسی کے مطابق سپاہیوں کو حکم دیا گیا۔اب یہ خوفناک کام شروع ہوا۔انہوں نے پہلے اُس آدمی کی جو مسیح کی ایک جانب تھا۔دونوں ٹانگیں توڑیں۔اور پھر دوسرے کی۔تائب چور بھی اس سزا سے نہ بچا۔مگر اُس کی توبہ نے اُس کے حق میں کس قدر فرق پیدا کر دیا۔اُس کے ہمراہی کے لئے یہ امر فقط اُس کی سزا اور بے حرمتی میں ایک اور ایزاد (اضافہ) تھی۔مگر اس چور کے لئے ان ٹانگوں کا توڑا جانا ایسا تھا جیسے گویا اُس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔اور اُس کی روح کو آزادی مل گئی کہ وہ پرواز کر کے بہشت کو جائے۔جہاں مسیح اُس کے ملنے کے لئے کھڑا تھا۔

اب یسوع کی باری آئی۔لیکن جب سپاہیوں نے اُس کی طرف نظر کی تو معلوم کر لیا کہ اُس کا کام تمام ہو چکا ہے۔موت اُن سے پہلے ہی اُس کی ملاقات کر چکی تھی۔اور اُس کے جھکے ہوئے سر اور مرجھائے جسم سے ظاہر تھا کہ وہ مر چکا ہے مگر اس بات کو اور بھی یقینی طور پر معلوم کرنے کے لئے اُن میں سے ایک نے اپنی برچھی اُس کے جسم میں گھسیڑ دی۔اور ایسا بڑا زخم لگا یا کہ جب مسیح جی اُٹھا تو وہ شک کرنے والے توما رسول سے کہہ سکتا تھا۔کہ وہ اپنا ہاتھ اُن میں ڈال دے۔اور جب یہ ہتھیار باہر نکالا گیا۔تو لہو اور پانی اُس میں سے بہ نکلا۔

مقدس یوحنا جو وہاں موجود تھا اور جس نے یہ سب کچھ واقع ہوتا دیکھا۔ اُس نے اس واقعہ کو غیر معمولی عظمت کی نظر سے دیکھا کیونکہ وہ اپنے بیان کے ساتھ ہی ان الفاظ میں اُس کی تصدیق کرتا ہے۔ گویا کہ وہ ایک سرکاری کاغذ پر اپنی مہرِ ثبت کر رہا ہے کہ "جس نے یہ دیکھا ہے۔ اُسی نے گواہی دی ہے۔ اور اُس کی گواہی سچی ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ سچ کہتا ہوں تاکہ تم بھی ایمان لاؤ۔ بھلا کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی کہانی کا سلسلہ توڑ کر جملہ معترضہ (قابلِ اعتراض) کے طور پر اس امر کا یقین دلانے کو ٹھہر جاتا ہے۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ اُس نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ ایک بدعت کی تردید کرنا چاہتا تھا۔ جو قدیم کلیسیاء میں رواج پا گئی تھی۔ کہ مسیح فی الواقع انسان نہ تھا۔ اور وہ یہ کہتے تھے۔ کہ اُس کی موت ظاہر ہی میں ایسی معلوم ہوتی تھی۔ اس خیال کی تردید میں یوحنا رسول ان تفصیلی باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ جن سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ حقیقی انسان تھا۔ اور کہ اُس کی موت واقعی موت تھی۔ البتہ یہ قدیم بدعت عرصہ ہوا کہ مر چکی ہے۔ اور اس وقت مشکل سے کوئی ایسا ہو گا۔ جو یسوع کی حقیقی انسانیت سے منکر (انکار کرنے والا) ہو۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ اس میلانِ طبع (فطرت کا رجحان) کا کہ اُس کی زندگی کے واقعات کو کسی نہ کسی طرح سے اُڑا دیا جائے۔ اس کا ظہور ہمیشہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ زمانہ حال میں مقتدر (طاقتور) مسیحی معلم یورپ میں ایسے موجود ہیں۔ جو مسیح کی قیامت کے ساتھ اُسی قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ جو یہ لوگ اُس کی موت کے واقعہ سے کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض استعارہ کے طور پر ہے۔ اور اسے لفظی طور پر صحیح نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان کے مقابلہ میں کلیسیاء اُس کی قیامت کے واقعات کو پیش کرتی ہے۔ جیسے کہ مقُدس یوحنا نے ہمارے نجات دہندہ کی موت کے واقعات کو پیش کیا تھا۔ ہمارے زمانہ میں ہر قسم کے معلم پائے جاتے ہیں۔ جو اپنی تعلیم میں مسیح سے سند (ثبوت۔ اختیار) لیتے ہیں۔ اور اُسی کو علمِ الٰہی کا مرکز ٹھہراتے ہیں۔ مگر ہم اُن سے سوال کرتے ہیں۔ کہ یہ کونسا مسیح ہے؟ کیا یہ وہ مسیح ہے ۔ جس کا ذکر پاک نوشتوں میں ہے۔ وہ مسیح جو ابتدا میں خُدا کے ساتھ تھا۔ جو مجسم ہوا۔ جو جہان کے گناہوں کے لئے مر گیا۔ مرُدوں میں سے جی اُٹھا۔ اور ہمیشہ کے لئے سلطنت کرتا ہے؟ ہمیں محض لفظوں سے اپنے کو دھوکا نہیں دینا چاہیے فقط وہی مسیح جس کا ذکر پاک نوشتوں میں ہے۔ ہمیں وہ نجات جو پاک نوشتوں میں لکھی ہے۔ عطا کر سکتا ہے۔

بعض یہ خیال ہے کہ اس واقعہ سے جو تعجب و حیرت مقدس یوحنا کے دل میں پیدا ہوئی۔ اُس کا باعث عہدِ عتیق کی دو آئتوں کا پورا ہونا تھا۔ جنہیں وہ نقل کرتا ہے۔ ظاہراً یہ محض ایک اتفاقی بات معلوم ہوتی تھی۔ کہ سپاہی یہودیوں کی منشاء کے خلاف یسوع کی ہڈیاں توڑنے سے باز رہے۔ مگر پاک کلام میں جس کی انہیں کچھ بھی خبر نہیں تھی۔ اس سے سینکڑوں سال پہلے لکھا جا چکا تھا کہ اُس کی ہڈی توڑی نہ جائے گی۔ یہ بھی ایک اتفاقی امر معلوم ہوتا تھا کہ ایک سپاہی نے یسوع کے پہلو میں برچھی گھبودی۔ مگر ایک قدیمی پیشن گوئی جس سے وہ محض نابلد (ناواقف) تھا کہہ چکی تھی کہ وہ اُس پر جسے انہوں نے چھیدا نظر کریں گے۔ اس طرح سے خدا کے مقررہ ارادے کے مطابق یہ سپاہی اپنی وحشیانہ حرکات سے بھی پاک نوشتوں کے بیانات کو پورا کر رہے تھے۔ اور جنہوں نے اس امر کو دیکھا اور نیز پاک نوشتوں سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے جان لیا کہ الٰہی اُنگلی یسوع کو صاف صاف خُدا کا بھیجا ہوا بتا رہی ہے۔

پہلی آیت کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خروج کی کتاب میں سے لی گئی ہے۔ جہاں فسح کی رسم کا حال درج ہے۔ اور دراصل وفسح کے برّہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس کی بابت یہ حکم تھا کہ وہ ثابت کھایا جائے اور اُس کی ہڈی نہ توڑی جائے۔ مقدس یوحنا کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ کہ یسوع عہدِ جدید کا برّہ ہے۔ اور اس لئے انتظامِ الٰہی یہ تھا۔ کہ اُس کی کوئی ہڈی نہ توڑی جائے تاکہ اصل نمونہ کے ساتھ مشابہت میں فرق نہ آئے۔ اور ہڈی توڑنے کی صورت میں یہ مشابہت قائم نہ رہتی یہودی تاریخ کے تمام زمانوں میں عیدِ فسح ایک عظیم الشان عید سمجھی جاتی تھی۔ اس سے غرض یہ تھی۔ کہ اُسی کی یاد

آوری سے لوگ اُس عجیب وغریب زمانہ کو یاد رکھیں۔ جب خُدا نے اپنے فضل وقدرت سے اُن کو ایک مستقل قوم بنادیا۔اور اپنے دستِ قدرت (زور آور ہاتھ) سے مصریوں کی غلامی سے رہا کرکے مصر سے باہر نکال لایا۔اور اس عید کی خاص رسم فسح کے بّرہ کا ذبح کرنا اور کھانا تھا۔اس سے وہ یاد کرتے تھے۔ کہ کس طرح مصر میں اس بّرہ کے خون کے سبب جو اُن کے گھروں کے دروازوں پر چھڑکا گیا تھا۔وہ فنا کرنے والے فرشتے کے ہاتھ سے جو ملک میں سے گزر رہا تھا محفوظ رہے۔اور کس طرح اس بّرہ کا گوشت ایسی حالت میں جب اُن کی کمریں کسی ہوئی تھیں۔اور لاٹھیاں اُن کے ہاتھ میں تھیں۔ کھایا گیا تھا۔ اوراس کے گوشت سے انہیں اس خوفناک سفر کے لئے قوت حاصل ہوئی۔اس طرح تمام زمانوں میں اس رسم سے دو باتیں اُن کے ذہن نشین کی جاتی تھیں۔اوّل یہ کہ گذشتہ گناہوں کی معافی ملنی چاہیے۔اور دوسری کہ آئندہ سال کے لئے جو اس نئی فسح کے بعد شروع ہوتا تھا۔انہیں عالم بالا سے زور و قوت عطا ہونی چاہیے۔اسی طرح عہدِ جدید میں ہمارے دل ہمیشہ خُدا کے فضل اور قدرت کے اُس عجیب وغریب مکاشفہ کی طرف لگائے جاتے ہیں۔ جس سے مسیحی دین پیدا ہوا۔ اور یہاں بھی عین وسطی (درمیانی) جگہ اُس ذبح شدہ بّرے کو حاصل ہے جو ہمارے گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہے۔اور جس سے آئندہ جدوجہد اور سفرِ دُنیا کے لئے ضروری طاقت عطا ہوتی ہے۔ اگر ہم نور میں چلیں۔ جس طرح کہ وہ نور میں ہے۔ تو ہماری آپس میں شراکت ہے۔اور اُس کے بیٹے یسوع کا خون ہمیں تمام گناہ سے پاک کرتا ہے۔

دوسری پیشن گوئی جو مقدس یوحنا کے نزدیک اس واقعہ سے پوری ہوئی یہ تھی۔ کہ وہ اُس پر جسے انہوں نے چھیدا نظر کریں گے۔ یہ آیت ذکریاہ نبی کے صحیفہ میں درج ہے۔اور جو ایسی عجیب وغریب ہے کہ اُسے تمام وکمال یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔اور میں داؤد کے گھرانے پر اور یروشلیم کے باشندوں پر فضل اور مناجات کی روح برساؤں گا۔اور وہ مجھ سے جسے انہوں نے چھیدا ہے۔ نظر کریں گے اور وہ اُس کے لئے ماتم کریں گے۔ جیسا کوئی اپنے اکلوتے کے لئے ماتم کرتا ہے۔اور وہ اُس کے لئے تلخ کام ہوں گے۔ جس طرح سے کوئی اپنے پہلوٹھے کے لئے تلخ کامی میں پڑتا ہے۔

یہوواہ اُس مخالفت کو جو اُس کے اور اُس کے خادموں کے درمیان واقع ہوئی۔استعارہ کے طور پر اپنے چھیدنے اور دُکھ دینے سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم بھی جب کوئی ہماری بے عزتی کرے۔ کہا کرتے ہیں کہ اُس نے میرا دل چھید دیا۔ مگر مسیح کی موت میں یہ استعارہ ایک حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ابن اللہ کے جسم پاک پر برچھی کا وار کیا گیا اور اُسے چھیدا گیا۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقدس یوحنا اُسے رومی سپاہیوں کی طرف نہیں۔ بلکہ یہودی قوم کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مگر نبوت میں نہ صرف لوگوں کے خُدا کو چھیدنے کا۔ بلکہ اپنے اس کام پر شرمساری اور اشکباری کے ساتھ نظر کرنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ بات عید پنتیکوست پر پوری ہونی شروع ہوئی۔ اور اُس وقت سے لے کر ہر زمانے میں یہودی قوم میں ایسے آدمی پائے گئے ہیں۔جو اس کارروائی کے متعلق اپنے جرم کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ لیکن پورا اقرار ابھی تک معرض التواء (رُکا ہوا) میں ہے۔ مگر خُدا کی یہ قدیم اُمت جب کبھی رجوع لائے گی۔ تو اُس کا آغاز اسی گریہ وفریاد سے ہونا چاہیے۔ درحقیقت ہر ایک انسان جب اُس کو اپنے حقیقی رشتہ کی جو وہ مسیح سے رکھتا ہے۔ خبر ہوتی ہے۔ تو وہ بھی یہی اقرار کرتا ہے۔ یہ فقط چند رومی سپاہی یا ایک خاص قوم کے سربراہ (بزرگ) وہ لوگ ہی نہیں تھے۔ جنہوں نے مسیح کی طرف سے اپنے دل کو سخت کر لیا تھا۔ جس نے اُسے صلیب پر چڑھایا۔اور اُس کا خون بہایا۔اس لئے ہر ایک گنہگار کو یہ محسوس کرنا چاہیے۔ کہ وہ بھی اس میں شریک تھا۔اور صرف اُسی وقت جب ہم اپنے گناہ کی نسبت یہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کہ وہ گویا خُدا کے بیٹے کی ذات میں خود ذاتِ الٰہی پر حملہ کرتا ہے۔ تو ہم اُس کی حقیقت اور بڑائی کو سمجھ سکیں گے۔ بہت سے اور لوگ ہیں۔ جو یوحنا کی حیرت وتعجب کا باعث اس امر کو سمجھتے ہیں۔ کہ اُس نے مسیح کے پہلو سے خون اور پانی بہتا دیکھا۔

ایک لاش کو اگر چھیدا جائے۔ کم سے کم اگر اُسے مرے کچھ وقت ہو گیا ہو۔ تو عموماً اُس میں سے کچھ نہیں بہا کرتا۔ جس بات نے اُسے فریفتہ (عاشق) کر لیا۔ وہ یہ تھی کہ نجات دہندہ کا جسم گویا چھیدنے سے ایک چشمہ بن گیا۔ جس میں سے یہ دو قسم کی رطوبت خارج ہوئی جب بیابان میں موسیٰ نے اپنا عصا چٹان پر مارا۔ تو اُس میں سے پانی بہ نکلا۔ جس سے ہلاک ہوتی ہوئی جماعت کو زندگی مل گئی۔ مگر یہ دو چیزیں جو یسوع کے پہلو سے بہ نکلیں۔ وہ یوحنا کی نظر میں گویا اس سے بھی کہیں بہتر تھیں۔ کیونکہ اُس کے نزدیک خون گویا صلح و کفارہ کی علامت تھا۔ اور پانی مسیح کی روح کی۔ اور ان دونوں باتوں پر ساری نجات کا مدار ہے۔ اسی کے مطابق ہم اپنے ایک مشہور گیت میں گایا کرتے ہیں۔

آب و خوں جو بہے تے تیرے چھدے پہلو سے

وہ گناہ کی دوا ہو دوزخ سے بچانے کو

اگرچہ مقدس یوحنا نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ مسیح کے زخمی پہلو سے ان دو چیزوں کے یہ نکلنے کی کیا وجہ تھی۔ مگر اور لوگوں نے اس امر کی طرف توجہ کی ہے۔

بعض نے تو اس بات کو ایک بالکل غیر طبعی واقع سمجھا ہے۔ اور انہوں نے اس کو اس امر پر محمول کیا ہے کہ ہمارا خُداوند کی انسانیت ایک خاص تقسیم کی تھی۔ اگرچہ وہ مر گیا۔ مگر اور انسانوں کی طرح اُس کا جسم سڑا نہیں۔ اُس کا جسم سڑا نہیں۔ اُس کا جسم چند ہی گھنٹہ بعد مبدل اور جلالی ہو کر موت کے پنجے سے نکل گیا۔ یہ تبدیلی کا سلسلہ جو آخر کار اُس کی قیامت پر ختم ہوا۔ اُس کی موت ہی کے وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ اور اس برچھی کے زخم نے جو گویا اس تبدیلی کے اثناء میں لگایا گیا جسم کی بالکل غیر معمولی بناوٹ کو ظاہر کر دیا۔

دوسروں نے مسلمہ واقعہ ہی پر لحاظ کر کے اس امر کے لئے اس سے بالکل مختلف مگر نہایت ہی دلچسپ وجہ ٹھہراتی ہے۔ انہوں نے مسیح کی موت کے دفعتاً واقع ہونے پر خاص طور پر توجہ کی ہے۔ جو لوگ صلیب دیئے جاتے تھے۔ وہ عموماً کئی دن تک اُس پر جیتے لٹکے رہتے تھے۔ مگر وہ چھ گھنٹہ سے بھی زیادہ نہ جیا۔ مگر موت کے عین پیشتر وہ بار بار بلند آواز سے چلاتا رہا۔ گویا کہ اُس کی جسمانی قوت ہر گز زائل نہیں ہو گئی تھی۔ لیکن دفعتاً ایک بلند چیخ کے ساتھ ہی اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کا کیا باعث ہو سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ بعض اوقات جسمانی اور ذہنی دباؤ کی سختی کی وجہ سے دل پھٹ جایا کرتا ہے۔ اور مریض چلاتا ہے۔ اور موت ناگہاں واقع ہو جاتی ہے۔ ہم عموماً کہا کرتے ہیں۔ کہ فلاں آدمی تو دل کے ٹوٹنے سے مر گیا۔ لیکن یہ بات محض استعارہ کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات یہ امر لفظی طور پر بھی صحیح ہوتا ہے۔ دل سچ مچ غم کے مارے شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ جب موت اس طور سے واقع ہوتی ہے۔ تو خون جو دل میں بھرا ہوتا ہے۔ ایک اور تھیلی میں جو دل کو گھیرے رہتی ہے۔ بہ جاتا ہے۔ اور یہاں وہ دو اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایک تو پھٹکی دار چیز جو خون کے رنگ کی ہوتی ہے۔ اور دوسری شفاف بیرنگ چیز جو پانی کی مانند ہوتی ہے۔ اور اس حالت میں اگر اُس تھیلی کو برچھی یا کسی اور چیز سے چھیدا جائے تو ان دونوں اشیاء کی ایک بڑی مقدار بہ نکلے گی جسے ایک معمولی دیکھنے والا جو علمی اصطلاح سے واقف نہیں۔ خون اور پانی سمجھے گا۔

یہ مسئلہ پچاس سال ہوئے ایک انگریز ڈاکٹر سٹرؤ صاحب نے ثابت کیا تھا۔ اور اُس وقت کے بعد بہت سے دوسروں ڈاکٹروں نے بھی جو علم و حکمت میں اُس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اُس کے ساتھ اتفاق رائے ظاہر کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر بیگھی مرحوم اور سر جیمس سمپسن صاحبان۔ موخر الذکر ڈاکٹر صاحب اپنی ایک کتاب میں نجات دہندہ کی موت کا سال نہایت دردناک اور موثر الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ کم سے کم مجھے بحیثیت ڈاکٹر ہونے کے

ہمیشہ یہ خیال گذرتا ہے۔ کہ وہ طریق جس سے مسیح کی جسمانی موت وقوع میں آئی۔ ہمارے خیالات اور تصورات کو اس بارے میں بہت ہی گہرا کردیتا ہے کہ وہ کتنی بڑی قربانی ہوگی۔ جو اُس نے صلیب پر ہمارے گنہگار ابنائے جنس کے لئے گذرانی۔ اس سے بڑھ کر اور عجیب وغریب کیا بات ہوگی۔ کہ کس طرح ہماری خاطر ایک نہایت بے چارگی کے عالم میں خُدا نے انسان بن کر اپنے انسانی جسم کو صلیب کے دُکھوں اور عذابوں کے حوالہ کردیا۔ لیکن اس قربانی کی عظمت کی نسبت ہمارا تعجب اور بھی ترقی کرجاتا ہے۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں۔ کہ جب وہ اس طرح ہمارے گناہوں کے لئے نہایت سخت بے رحمانہ تکلیف وہ جسمانی کا متحمل ہورہا تھا۔ تو وہ آخر کار اپنی جسمانی تکالیف کی سختی کے سبب سے نہیں ہلاک ہوا۔ بلکہ اپنے دل کے دُکھ کے سبب جو اس سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ اس کے دل کی گوشتین دیواریں جو اُس کی جسمانی ہیکل کے پردہ کی طور پر تھیں۔ پھٹ گئیں جب کہ اُس نے ہمارے لئے اپنی جان کو موت میں لنڈھادیا۔ اور اس طور سے اُس کی جان کا دُکھ اس گھڑی میں ایک ناقابل بیان تلخی سے معمور اور اُس کے جسم کے دُکھوں سے کہیں زیادہ دردناک تھا۔[1]

ہم اس باب میں زیادہ تر خیالات اور مفروضات کے عالم میں پھرتے رہے ہیں۔ اور ہم مستقل طور پر یہ تحقیق نہیں کرسکے کہ کونسی بات قابل تسلیم ہے۔ اور کونسی نہیں۔ یہ ایک پُر اسرار موقع ہے۔ اور جس طرف ہم منہ کرتے ہیں۔ دُھندے مگر دلکش معانی پردہ کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اس نظارہ کا نام مردہ مسیح رکھا ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ مردہ مسیح ایسا عجیب اور دلچسپ اسی وجہ سے ہے۔ کہ وہ زندہ مسیح بھی ہے؟ وہ زندہ ہے۔ وہ یہاں موجود ہے۔ وہ اس وقت ہمارے پاس ہے۔ مگر اس کا برعکس بھی صحیح ہے۔ زندہ مسیح ہمارے لئے ایسا عجیب اور قابل پرستش معلوم ہوتا ہے۔ اس وجہ س کہ وہ مردہ مسیح بھی ہے۔ یہ بات کہ وہ زندہ ہے ہم میں اُمید اور قوت پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ اُس کی موت کی یادگار ہے۔ جس کے لحاظ سے وہ ہمارے بوجھ سے لدے ہوئے ضمیر اور ہمارے دردمند دلوں کی محبت کا سہارا ہے۔

تیئواں باب

تدفین

صرف سخت دل اور تنگ خیال لوگ ہی موت کے بعد جسم انسانی کو بے پروائی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور تکفین وتدفین کے متعلق ہر قسم کی رسوم ودستورات کو حقیر اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر بنی آدم کی فطرتی خواہش ان لوگوں کی نسبت زیادہ دانا ہے۔ قدیم زمانہ میں مناسب طور سے دفن نہ کیا جانا نہایت بدقسمتی کی بات سمجھا جاتا تھا۔ اور اگرچہ اس خیال کے ساتھ بہت س باطل توہمات بھی ملے ہوئے تھے۔ مگر تو بھی اُس کی تہ میں ایک صحیح انسانی جذبہ تھا۔ جسم کو بھی رُوح کی طرح ایک قسم کا رتبہ وعزت حاصل ہے۔ خاص کر جب کہ اُسے روح القدس کی ہیکل مانا جائے۔ اور موت میں بھی ایک عظمت کا خیال ہے۔ جس کی طرف سے بے پروائی کرنے میں زندوں کا سخت نقصان متصور ہے[2]۔ اور جب ہم کسی جنازہ کی بابت دیکھتے ہیں کہ اُس کی تیاری میں جلدی اور بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ تو ہمیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خیال گزرتا ہے کہ گویا فطرت انسانی کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ برخلاف اس کے ہمیں ایک طرح کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم کسی جنازہ کو بڑی سنجیدگی اور تجمل کے ساتھ لے جاتے دیکھتے ہیں۔ اور جب کوئی ایسا

---

[1] ۔ یہ عبارت حنا صاحب کی کتاب موسومہ "خُداوند کے دُکھوں کا آخری دن" سے نقل کی گئی ہے۔

[2] ۔ مختصر سوال وجواب کی کتاب میں اس خیال کو نہایت خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے۔ "اور اُن کے اجسام جواب بھی مسیح سے متحد ہیں۔ قیامت کے دن تک قبروں میں آرام کرتے ہیں"۔

شخص گزر جاتاہے۔ جس کی زندگی کارہائے نمایاں اور فیاضی ،وعالی حوصلگی سے بھری تھی۔اور جس نے اپنی قوم کی بہبودی اور بنی انسان کے فائدے کے لئے عمدہ عمدہ کام سرانجام دیئے تھے۔ توجب اُس کی لاش ایک عالم کے نوحہ اور ماتم کے درمیان دفن کی طرف لے جاتے ہیں۔اور گھنٹے بجتے ہیں۔اور تو میں داغی جاتی ہیں۔اور گلیوں میں دوُرویہ لوگوں کا ہجوم نظر آتاہے۔اور علماء وشرفااُس کی قبر کے گردا گرد کھڑے ہوتے ہیں۔ توجس شخص کے دل پر اس دلکش نظارہ کا کچھ بھی اثرنہ ہو۔ ہم کہیں گے ۔ کہ اُس کادل کسی مرض میں گرفتارہے۔ یاوہ ابھی تک بالکل کندہ ناتراشیدہ ہے۔

عظیم اور دانااور نیکوکار لوگوں کی تدفین اسی طورسے ہونی چاہیے۔ توآؤ۔ ہم دیکھیں کہ وہ جس کے سبب سے زیادہ عظیم اور دانااور نیکوکار ہونے کاسب کوئی قائل ہ۔ کس طورسے دفن کیاگیا۔

ا۔

شام کے قریب تینوں لاشیں صلیب پر سے اُتارلی گئیں۔ پیشتراس کے کہ یہودیوں کا سبت۔ جو غروب آفتاب کے وقت سے شروع ہوتا تھا۔ آوئے۔ غالباًدونوں چوراُسی مقام پر معہ صلیب لکڑی اور دوسری چیزوں کے دفن کردیئے گئے ہوں گے۔ یااُن کی لاشیں اُٹھاکر کسی گمنام گوشہ یاخندق میں جہاں مجرموں کی لاشوں کو زمین میں گڑھے کھود کرڈال دیا کرتے تھے۔ لے گئے ہوں گے۔

یسوع کی لاش کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا۔ اگرایک شخص جس کے آنے کی ہرگز کسی کو پہلے توقع نہ تھی۔آکر مداخلت نہ کرتا۔ رومیوں کے درمیان یہ ایک اچھی رسم تھی کہ مجرموں کی لاشیں اُن کے دوستوں کو اگروہ درخواست کیں تودے دی جایا کرتی تھیں۔ اوراس وقت یسوع کی لاش کے لئے بھی ایک شخص دعویدار ہوا۔ جسے پیلاطس نے بلاتامل لاش حوالہ کردی۔

یہ پہلا موقع ہے کہ ہم انجیل کی تاریخ میں یوسف ارمتیا کانام پڑھتے ہیں۔اوراُس کے ماقبل کی زندگی کا ہمیں کچھ حال معلوم نہیں ہے۔ بلکہ وہ شہر جس کے نام سے وہ کہلاتاہے۔اُس کا بھی صحیح طورپر ابھی پتہ نہیں چلا۔ اس بات سے کہ یروشلیم کے نواحی میں ایک باغ اور مکان اُس کی ملکیت تھا۔ یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ وہ وہیں کا باشندہ تھا۔ کیونکہ ہر ایک دیندار یہودی کے دل میں بڑی خواہش تھی۔ کہ بیت المقدس کے گردونواح میں مدفون ہوں۔اوراب بھی اگردیکھاجائے۔ توشہر کا گردنواح قبروں اور مقبروں سے بھرا پڑاہے۔

یوسف ایک دولت مند آدمی تھااوراس سے پیلاطس کے نزدیک اُس کی درخواست کے مقبول ہونے میں بھی مدد ملی ہوگی۔ جن لوگوں کے پاس مال دولت یامرتبہ یالیاقت ہے۔وہ کئی طرح سے مسیح کی خدمت بجالا سکتے ہیں۔ جو غریب اور نادار لوگوں کی بساط سے باہر ہوتی ہے۔ مگر پیشتراس کے کہ یہ خدمات مسیح کے نزدیک مقبول ہوں۔ یہ ضرورہے کہ وہ لوگ جنہیں یہ قابلیتیں حاصل ہیں۔اُس کی خاطر سے انہیں نقصان اور کوڑا سمجھیں۔

یوسف ایک مشیر تھا۔ بعض کاخیال ہے کہ وہ ارمتیا کی کونسل کا مشیر تھا۔ مگراس بیان میں کہ "اُس نے اُن کی صلاح اور کام کو منظور نہ کیاتھا"۔ ظاہراًصدر مجلس کی طرف اشارہ پایاجاتاہے۔ معلوم ہوتاہے۔ کہ وہ غالباًاسی مجلس کا مشیر تھا۔ بلاشبہ وہ جان بوجھ کراُس اجلاس سے جس میں یسوع پر فتویٰ لگایاگیا۔ غیر حاضر رہاہوگا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔ کہ یہ ساری کارروائی دردناک اور نفرت انگیز ہوگی۔ کیونکہ "وہ ایک نیک اور راستباز آدمی تھا"۔

لیکن اُس کی نسبت ہمیں اس سے بھی زیادہ کچھ بتایا گیاہے کہ "وہ خُداکی بادشاہت کا منتظر تھا"۔ یہی فقرہ ایک اور موقع پر عہدِ جدید میں اُس کے فلسطین کے دیندار لوگوں کے حق میں بھی استعمال کیاگیاہے۔اوراس سے ایک عجیب طورپر اُن کی دیندار کی خصوصیت بھی آشکارا ہوتی ہے۔ وہ زمانہ

روحانی طور پر مردہ تھا۔ مذہبی جماعت میں یا تو فریسیوں کی طرح احکام شرع کی ظاہری پابندی نظر آتی تھی یا صدوقیوں کی طرح وہ بالکل بے اعتقاد تھے۔ عبادت خانوں میں لوگ روٹی کے اُمیدوار ہو کر جاتے تھے۔ مگر وہاں انہیں پتھر ملتے تھے۔ فقیہ لوگ بجائے اس کے کہ بائبل کی سچائیوں کے خالص اور شفاف دریا کو ملک میں بہنے دیں۔ اُسے اپنی بے جان تفسیروں اور شرحوں کی ریت سے اٹ رہے تھے۔ مگر بُرے سے بُرے زمانوں میں بھی نیک لوگ پائے جاتے ہیں۔ اور اس وقت فلسطین میں بھی سچے دیندار کہیں کہیں موجود تھے۔ وہ اُن روشنیوں کی مانند تھے۔ جو تاریکی میں کہیں کہیں ٹمٹماتی نظر کرتی ہیں۔ یہ لوگ ضرور اپنے دل میں محسوس کرتے ہوں گے۔ کہ وہ اپنے ملک اور اپنے زمانہ میں محض اجنبی اور مسافر کے طور پر ہیں۔ اور وہ گویا زمانہ ماضی اور مستقبل میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انبیاء جن کا کلام اُن کی رُوحوں کی خوراک تھا ایک ایسے اچھے آنے والے زمانہ کی پیشین گوئی کرتے تھے۔ جب کہ اُن لوگوں پر جو تاریکی میں بیٹھے ہیں۔ بڑا نور چمکے گا۔ اور وہ اسی بہتر زمانہ کی انتظار میں تھے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے۔ کہ نبوت کی آواز کو پھر ایک بار ملک میں گونجتا ہوا سنیں۔ جو لوگوں کو اُن کی رُوحانی نیند سے جگائے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک مسیح کے منتظر تھے۔ اور اس بات کے اُمیدوار تھے کہ کاش وہ ہمارے ہی زمانہ میں جلوہ گر ہو۔

ایسے ہی لوگ تھے۔ جن کے درمیان یوحنا اور یسوع دونوں کو اپنے شاگرد ملے۔ ایسے لوگوں نے بپتسمہ دینے والے اور اُس کے جانشین کو بڑی خوشی سے قبول کیا ہو گا۔ کم سے کم انہیں اُن نبیوں میں سے سمجھا ہو گا۔ جو اُن کے زمانے کی بُرائیوں کے دفعیہ (دفع کرنا) کے لئے مبعوث (نبی برپا ہونا) ہوئے ہوں۔ لیکن اس بارے میں کہ آیا یسوع ہی وہ ہے۔ جو آنے والا تھا۔ یا انہیں اور کی راہ تکنی چاہیے۔ وہ بھی شبہ میں تھے۔ یوسف بھی شاید ان لوگوں میں سے ہو گا۔ اُس کی بابت یہ لکھا ہے۔ کہ وہ یسوع کے شاگردوں میں سے تھا۔ مگر یہودیوں کے خوف سے اس بات کو پوشیدہ رکھتا تھا۔ اُس کے پاس ایمان تو تھا۔ مگر یہ ایمان ایسا کافی نہیں تھا۔ کہ وہ یسوع کا عام طور پر اقرار کر سکے۔ اور اُس سے جو کچھ مصیبت اُس پر پڑے۔ اُس کے اُٹھانے کو آمادہ (راضی) ہو۔ یسوع کی تحقیقات کے وقت بھی اُس نے اپنی ضمیر کی تلافی کے لئے یہی کافی سمجھا ہو گا۔ کہ صدرِ مجلس سے غیر حاضر رہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی جگہ پر حاضر ہو اور علانیہ اپنے یقین وعقیدہ کا اظہار کرے۔

اُس وقت تو وہ جیسی حالت میں رہا۔ لیکن اب باوجود خوف خطرے کے اُس نے اپنے کو یسوع کے پیرؤں میں سے ظاہر کر دیا۔ اس امر پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ کہ وہ کیا بات تھی۔ جس نے اُسے اس بات پر آمادہ کیا ہو گا۔ کہ اب زیادہ تامل (دیر) کرنا مناسب نہیں بعض اوقات مذہبی اُمور میں کامل طور پر فیصلہ کرنے کے لئے اسی قسم کے واقعات مد (مددگار) ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص جو دورائیوں کے درمیان میں ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ یا اُسے اپنے یقین کا عام طور پر اقرار کرنے کی کبھی جرات نہیں ہوتی۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے ہم مشرب (مذہب) لوگوں میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ تو مذہبی اُمور پر بات چیت چھڑ جاتی ہے۔ اور بعض لوگ اُس کی مسخری اُڑاتے اور مسیح کے بندوں پر ہنسنے لگتے ہیں۔ اُس کی تعلیم ومسائل پر ٹھٹھا کرتے اور اُس کے نام پر کفر بکتے ہیں۔ لیکن آخر کار وہ اس امر میں حد سے بڑھنے لگتے ہیں۔ تب یہ خاموش اور نیم اعتقاد شاگرد اپنے کو ضبط نہیں کر سکتا۔ وہ غضب ناک ہو کر بول اُٹھتا ہے۔ اور اس طرح سے اُس کا مسیحی ہونا طشت از بام (مشہور ہونا) ہو جاتا ہے۔ یوسف کے دل میں کسی ایسے ہی طور سے یہ تبدیلی پیدا ہوئی ہو گی۔ اُسے سارے صدرِ مجلس کی مخالفت کرنی پڑی۔ اور خود اُس کی جان بھی معرض خطر میں تھی۔ مگر اب وہ باز نہ رہ سکا۔ اور سب خوف کو پس پُشت ڈال کر وہ بذات خود پیلاطس کے پاس گیا۔ اور یسوع کی لاش مانگی۔

۲۔

مسیح کا دلیری سے علانیہ اقرار کرنے سے دو نتیجے پیدا ہوا کرتے ہیں۔

ایک طرف تو اس سے مخالف دب جاتے ہیں۔ یہ نہیں لکھا کہ اس موقع پر ایسا کرنے سے یوسف کو کچھ نقصان پہنچا۔ یا یہ کہ صدرِ مجلس والوں نے فی الفور اُس کے ستانے اور ایذا دینے پر کمر باندھی وہ در حقیقت بڑے جوش وغضب سے بھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کے مقابلہ میں ستر اور ایک کی نسبت رکھتے تھے۔ مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک اکیلا دلیر آدمی اس سے بھی زیادہ مضبوط مخالفت کو نیچا دکھا دیتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے۔ کہ اُن میں سے بہتوں کے ضمیر انہیں اس کام کے لئے نفرین (ملامت) کر رہے تھے۔ اور وہ اس امر کے لئے تیار نہ تھے۔ کہ ایسے مستقل مزاج اور معقول آدمی سے جس کے مزاج سے وہ خوب واقف تھے۔ خواہ مخواہ اس مقدمہ میں بحث مباحثہ کرنے پر آمادہ ہوں۔ جو لوگ مسیح کے اقرار پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ انہیں ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہے۔ کہ اُن کے مخالفوں کا ضمیر بھی ایک طرح سے انہیں کا طرفدار ہوتا ہے۔

مسیح کا دلیری سے اقرار کرنے کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اور لوگ بھی جن کے سینے میں اتنی گرمی وحرارت نہیں ہوتی کہ وہ خود بخود ایسا کرنے کی جرات کریں۔ اُس کی مثال ونمونہ کو دیکھ کر اس امر کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صورت میں بھی یوسف کے نمونہ سے نیکدیمس کو بھی اپنی وفاداری دکھلانے کی جرات ہوئی۔

نیکدیمس بھی وہی عہدہ رکھتا تھا۔ جو یوسف کا تھا۔ کیونکہ وہ بھی صدرِ مجلس کا ممبر تھا۔ اور وہ بھی خفیہ طور پر مسیح کا شاگرد تھا۔ وہ انجیلی تاریخ کے صفحہ پر اس وقت پہلی دفعہ ہی ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم پڑھتے ہیں کہ وہ یسوع کے آغازِ رسالت ہی میں اُس کی طرف کھنچا گیا تھا۔ یہاں تک کہ خفیہ طور پر اُس سے ملاقات بھی کر آیا تھا۔ جس کا تذکرہ انجیلِ یوحنا کا ایک قیمتی جزو ہے۔ اور جس کو پڑھ کر نہ معلوم کس قدر ہزارہا ہزار آدمی یسوع پر ایمان لائے ہوں گے۔ بلکہ اُس کے گواہ بھی بن گئے ہوں گے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کلام سے اُس شخص کو جس سے مخاطب ہو کر دراصل مسیح نے وہ کلام کیا تھا ۔اس قدر فائدہ حاصل نہ ہوا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ نیکدیمس کو مسیح کے سب سے پہلے شاگردوں کے زمرہ میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کے مرتبہ اور مقام سے رسولوں کی جماعت کو بہت ہی تقویت پہنچتی۔ مگر وہ شش وپنج میں تھا۔ اور اس لئے خفیہ طور پر شاگرد بنا رہا۔ ایک موقع پر وہ ضرور بول اُٹھا۔ یعنی اُس وقت جب کہ ایک نہایت ناواجب بات صدرِ مجلس کے سامنے مسیح کے حق میں کہی گئی تھی۔ تو لکھا ہے کہ اُس نے یہ سوال کیا کہ "کیا ہماری شریعت کسی شخص کو مجرم ٹھہراتی ہے۔ جب تک پہلے اُس کی سُن کر جان نہ لے کہ وہ کیا کرتا ہے"؟ لیکن جب انہوں نے غصّہ سے یہ جواب دیا کہ "کیا تو بھی گلیلی ہے"؟ تو وہ دب گیا اور بالکل خاموش ہو رہا۔ بلاشبہ یوسف کی طرح وہ بھی اُس جلسہ سے جس میں یسوع پر فتویٰ لگایا گیا غیر حاضر رہا ہو گا۔ مگر صدرِ مجلس کی بے انصافی ایسی سخت درجہ کی تھی۔ کہ وہ عام طور پر اُس کے خلاف کہنے کو آمادہ تھا۔ لیکن شاید وہ اپنے یقین کے مطابق کبھی عمل نہ کرتا۔ اگر یوسف اُس کی اس طرف رہنمائی نہ کرتا۔

مگر نیکدیمس میں یہ امر قابل تعریف ہے کہ وہ ایک ترقی کرنے والا آدمی تھا۔ اگرچہ وہ کچھ عرصہ کے لئے رُکا رہا۔ لیکن آخر کار وہ نکل ہی آیا۔ اور دیر سے آنا نہ آنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جب وہ یوسف سے ملاقی (ملاقات ہونا) ہوا۔ تو اس کے لئے یہ بڑی خوش قسمتی کی گھڑی سمجھنی چاہیے۔ بہت سے دوستوں کے مجمع ایسے ہیں جن میں سب کے سب تہ دل سے سچائی پر یقین رکھتے اور اُسی کی طرف مائل ہیں۔ اور اگر اُن میں سے ایک بھی دلیری کر

کے نکل آتا ہے۔ تو باقی بڑی خوشی سے اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ یوسف اور نیکدیمس کے ہاتھ منجی کی لاش پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ جب انہوں نے مل کر اُسے اُٹھایا۔ اور کوئی ایسی محبت یا دوستی مضبوط یا گہری نہیں ہوگی۔ جیسی کہ وہ جس کا مدار مسیح کے رشتہ اور تعلق پر ہو۔

۳۔

مُصوروں نے خُداوند کی تدفین کا نقشہ بڑی تفصیل کے ساتھ کھینچا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر قوت واہمہ (سوچنے کی قوت) پر مبنی ہے۔ انہوں نے اسے مختلف سینوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلے صلیب پر سے اُتارا جانا ہے۔ جس میں علاوہ یوسف اور نیکدیمس کے کم سے کم مقدس یوحنا اور بعض اوقات اور لوگ بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جو میخیں نکالتے اور لاش کو نیچے اُتارتے ہیں۔ اور صلیب کے نیچے مقدس عورتیں۔ جن میں مقدس کنواری مریم اور مریم مگدلینی خاص طور پر دکھائی جاتی ہیں۔ جو نیچے سے اس قیمتی بوجھ کو پکڑتی ہیں۔

ایک اور تصویر میں عورتوں کے لاش پر ماتم کرنے کا نظارہ دکھایا جاتا ہے۔ اس میں مقدس ماں عموماً اپنے بیٹے کا سر گود میں لئے ہوتی ہے۔ اور دوسری عورتیں ہاتھوں کو پکڑے ہوتی ہیں۔ پھر سب مل کر اُسے قبر کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور آخرکار اُسے دفن کرتے ہیں۔ جس کی تصویر مختلف طور پر کھینچی جاتی ہے۔

ان نظاروں کے کھینچنے پر مشہور و معروف مصوروں نے اپنی ساری حکمت اور صنعت خرچ کی ہے۔ مگر اناجیل کا بیان بالکل مختصر اور سادہ ہے۔ اُس میں مقدس کنواری کا نام بھی نہیں لیا۔ اور اگرچہ دوسری مقدس عورتوں کا وہاں موجود ہونا لکھا ہے۔ مگر اس کا کہیں اشارہ بھی نہیں کیا کہ انہوں نے اُس کی تدفین میں کسی قسم کی امداد کی۔ بلکہ صرف یہ کہ وہ لاش کے پیچھے گئیں۔ اور جہاں وہ دفن ہوا تھا۔ اُس مقام کو دیکھا۔ فقط یوسف اور نیکدیمس کا خاص طور پر ذکر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ فرض کرلینا بھی قرین قیاس (وہ بات جسے عقل قبول کرے) ہے۔ کہ اُن کے نوکروں نے اس کام میں اُن کی مدد کی ہوگی۔ اور سپاہیوں نے لاش کے اُتارنے میں ہاتھ بٹایا ہوگا۔

خُداوند کی لاش ایک نئی قبر میں جو ایک چٹان میں سے تراشی گئی تھی۔ اور یوسف نے بعد مرِدن اپنے دفن کئے جانے کے لئے تیار کروائی تھی۔ رکھی گئی۔ وہاں پہلے کبھی کوئی لاش نہیں رکھی گئی تھی۔ ایک خارج شدہ اور مصلوب آدمی کے لئے یہ ایک بڑا احسان سمجھنا چاہیے۔ اور یہ بہت مناسب تحفہ بھی تھا۔ کیونکہ یہ واجب تھا کہ پاک اور بے گناہ آدمی کی لاش جو سب چیزوں کو نئے سر سے بنانے آیا تھا۔ اور اگرچہ مردہ تھی۔ مگر سڑنے والی نہیں تھی۔ ایک ایسی ہی پاک قبر میں رکھی جائے۔ ایسے ہی نیا کتانی کپڑا بھی جو یوسف اُس کی لاش کو لپیٹنے کے لئے لایا تھا۔ بالکل برمحل اور مناسب موقع تھا۔ مگر نیکدیمس بھی اظہار محبت وعقیدت میں پیچھے نہ رہا۔ وہ مر اور لوبان کا مرکب لایا۔ جس کا وزن قریباً پچاس سیر تھا"۔ یہ مقدار بہت ہی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس زمانہ میں مصالحوں کی ایسی ہی بڑی بڑی مقداریں استعمال کرنے کا رواج تھا۔ مثلاً لکھا ہے کہ ہیرودیس کے جنازہ پر جو مصالح استعمال کئے گئے۔ وہ پانچ سو آدمی اُٹھا کر لائے تھے۔

یہ قبر ایک باغ میں تھی۔ اور اس سے بھی ایک مناسبت اور خوب صورتی ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ صلیب کے مقام سے بہت دُور نہ تھی۔ لیکن اس امر پر شبہ ہوسکتا ہے۔ کہ وہ اس قدر قریب تھی۔ جیسی کہ وہ جگہ ہے۔ جو روایت کے مطابق ٹھہرائی گئی ہے۔ مرقد مقدس کا گرجا جو اس وقت یروشلیم میں موجود ہے اس کے احاطہ میں نہ صرف قبر کی جگہ بلکہ وہ سوراخ بھی جس میں صلیب کی لکڑی گڑی تھی۔ پایا جاتا ہے۔ اور دونوں

ایک دوسرے سے فقط تیس گز کے فاصلہ پر ہیں۔ مگراس امر میں شبہ ہے کہ آیاان دونوں مقاموں کا صحیح طورپر دریافت ہونا ممکن ہے۔تاہم زمین کا یہ ٹکڑادُنیا بھر نہایت ہی مشہور مقام ہے۔ مسیحی دُنیانے اس راویت کو جو شہنشاہ قسطنطین کے زمانہ سے چلی آتی ہے۔ صحیح مان لیاہے۔اوراُس وقت سے لے کر حاجی لوگ برابراُس مقام کی زیارت کو جاتے رہے ہیں۔اسی مقام پر قبضہ کرنے کی غرض سے مشہور ومعروف صلیبی جنگ واقع ہوئے تھے۔اورآج کے دن بھی مسیحیوں کی مختلف کلیسیائیں وہاں فٹ فٹ بھر جگہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔

اگرچہ ہمیں ان حاجیوں اور جنگوں کے ساتھ کچھ بھی ہمدردی نہ ہو۔اوران پاک مقاموں کے اصلی موقع کو دریافت کرنے میں کچھ بھی دلچسپی نہ ہو۔ مگر مرقد اقدس کی طرف خواہ مخواہ ایماندار کادل کھینچا جاتاہے۔گذشتہ زمانوں میں دیندار لوگ قبرستان میں جاکر غوروفکر کیاکرتے تھے۔ مگر زمانہ حال کے دیندار زیادہ خوشنما مقامات کواس غرض کے لئے انتخاب کرناپسند کرتے ہیں۔اور ہم اُمید کرتے ہیں۔کہ وہ اس طور سے بھی روحانی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔لیکن ہرایک آدمی جس کے دل میں طبعی محبت جاگزین ہے۔وہ ضروراپنے محبوب اوررشتہ دار کی قبر کے پاس ٹھہرنادوست رکھتاہے۔اورہر ایک سنجیدہ مزاج آدمی کو کبھی کبھی اپنی قبر کاضرور خیال آتاہوگا۔اورایسے موقعوں پراس سے بڑھ کراور کون سی چیز سے مدد مل سکتی ہے۔کہ ہم عالم خیال میں اُس شخص کی قبر کاحج کیاکریں۔جس نے یہ فرمایاتھاکہ ''قیامت اور زندگی میں ہی ہوں''۔

دُنیاکے بڑے بڑے آدمیوں کے مقابلہ میں یسوع کاجنازہ ایک معمولی غریب آدمی کاجنازہ تھا۔لیکن اُن لوگوں کی حیثیت کے لحاظ سے جن کو اُس کے آخری کفن ودفن کی عزت ملی۔کوئی اس سے بڑھ کرنہ کر سکتا۔اور جو کچھ انہوں نے کیادلی محبت واُلفت سے کیا۔گوظاہر اًدھوم دھام کاوہاں کچھ نام ونشان نہ تھا۔اس طور سے آخر کار وہ اُس نئی قبر میں۔جس میں پہلے کوئی نہیں رکھا گیا تھا۔خوشبودار مصالحوں کے انبار میں۔اور مہکے ہوئے پھولوں کے باغ کے درمیان رکھا گیا۔اُس کا جسم سفید کتان میں لپٹا ہوا تھا۔اوراُس کے سرپر رومال بندھا تھا۔جواُس کے سر کے کانٹوں کے زخموں کو چھپائے ہوئے تھا۔اور قبر کے دروازے پرایک بڑاپتھر رکھا تھا۔اور یہ اُس کی آرام گاہ تھی۔شام کاوقت تھا۔اور سبت شروع ہو چکا تھا۔اُس کا کام تمام ہوچکا تھاایذااور دُشمنی اب اُس کا پیچھا نہیں کر سکتی تھی۔وہ اُس جگہ پہنچ گیا تھا۔جہاں شریر دُکھ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔اور تھکے ماندے آرام کرتے ہیں۔